حیاتِ طیّبہ

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

تالیف:۔

مرزا حیرت دہلوی

حیاتِ طیّبہ

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

تالیف:-
مرزا حیرت دہلوی

115/

مولوی منظور احمد نعمانی الفرقان کے شہید نمبر میں لکھتے ہیں۔

"دوسری کتاب مرزا حیرت مرحوم کی حیات طیبہ ہے جو شاہ اسماعیل کی نہایت مبسوط سوانح عمری ہے"

(الفرقان شہید نمبر ۱۳۵۵ھ صفحہ ۵۱ بحوالہ [illegible] صفحہ ۲۱۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ طیبہ

سوانح عمری

شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ
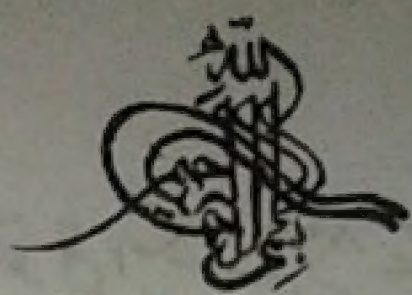
تالیف

مرزا حیرت دہلوی

ناشر

اسلامی اکادمی ناشران کتب اردو بازار، لاہور

تاریخ اشاعت ــــــ مئی ۱۹۸۴ء
تعداد ــــــ پانچ سو
مطبع ــــــ زاہد بشیر پرنٹرز
کتابت ــــــ ابواحسان حسین احمد کیلانی
قیمت ــــــ روپے

فہرستِ مضامین

حیاتِ طیبہ سوانح عمری شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اسلامی دنیا کے مذہبی اور ملکی عظیم الشان تغیر کی بھری ہوئی عبرت ناک دلچسپ تاریخ اپنے ساتھ ندرت مآب واقعات کا ایک لاثانی انبار رکھتی ہے۔ جس نے مسلمانوں کی اعجاز نما ترقی کا رنگ ملاحظہ کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ دنیا میں یہی ایک ایسی قوم ہوئی ہے کہ جس نے اپنے سچے ہادی کے طفیل سے آناً فاناً میں ہزاروں برس کی پرشوکت سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اپنے عجیب وغریب فتوحات کی لین ڈوری جزیرہ نمائے عرب سے نکال کر یورپ کے جگر میں اپنے رعب کا بھالہ گاڑ دیا، دریائے فرات سے بلیک سی تک اسلامی پھریرا فراٹے بھر رہا تھا، اور دریائے ٹگرس سے جمنا تک اسلامی ہلال کا جھمکیلا پرتو چشم زدن میں پڑتا ہوا معلوم ہونے لگا تھا۔

وہ سول جنگیں جو خلیفہ دوم کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں بدقسمتی سے مسلمان خلفا میں بھڑک اٹھی تھیں اور جن کا دہشت ناک رنگ آئندہ خونی نتائج کا (اسلام کے لئے) پیشین گوئی کرتا تھا مگر الحمد للہ کہ بہت جلد یہ فانی اور اسلامیوں کو تباہ وبرباد کرنے والا نقشہ خوش آئندہ نو لو سے بدل گیا اور پھر مسلمان اپنی غلطی سے آگاہ ہو کے دینی اور دنیاوی ترقی کے ذہن میں کہاں کے کہاں پہنچ گئے اور انہوں نے وہ وہ علوم اپنی سلطنت کے ساتھ ایجاد کیے جن کی یادگار ہنوز ناظرین کو رولا دینے کے لئے اپنے میں کافی مادہ رکھتی ہے۔

بارہ لاکھ مسلمان ملکہ انابلہ کے ناقابل برداشت مظالم اور بے رحم سنگین دل درشت اور خونخوار جبر سے جلاوطن کئے گئے اور کئی لاکھ مسلمان جبراً عیسائی بنائے گئے، اور تین لاکھ مسلمان بغاوت کے جرم میں بکروں کی طرح حلال کر دیئے گئے، اُن کا خونبہا افسوس ہے کسی اسلامی سلطنت نے نہ لیا نہ کوئی اُن کی حمایت کے لئے کھڑا ہوا یا وہ دن تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرمایا کرتے تھے "مسلمان کے خون کی ایک بوند میں کسریٰ اور قیصر کی سلطنت سے قیمتی سمجھتا ہوں" ایرانی سرحدوں میں ایک مسلمان ایلچی کا مارا جانا کل مسلمانوں کے بھڑکانے کے لئے کافی تھا یا یہ زمانہ آگیا کہ لاکھوں مسلمانوں کی بے گناہ گردن پر سخت بے رحمی سے ملکہ انابلہ نے چھری پھروادی اور کوئی ان کی حمایت کے لئے کھڑا نہ ہوا۔

یہ تو سب کچھ ہوا اور تمام آفتیں جو انسان پر نازل ہوسکتی ہیں مسلمانوں پر نازل ہوگئیں، بایں ہمہ پھر بھی مسلمانوں میں جان باقی تھی اور اچھی بڑی بڑی سلطنتیں ایشیا اور یورپ میں ان کی موجود تھیں مگر جب زمانہ نے ان کی بربادی پر کمر باندھی تھی اس کو بچانے والا کون تھا یہ تو ضرور اُن کے اعمال کی وجہ سے ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ بغداد اس سے زیادہ بے رحمی سے ہلاکو خان بت پرست کے ہاتھ سے محض شیعہ سنیوں کے جھگڑے میں تباہ کر دیا گیا، اور خاندان عباسیہ پر وہ آفت برپا ہوئی کہ جو دیدنی تھی نہ شنیدنی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان بربادیوں اور خرابیوں کا باعث کیا تھا؟ اور کس نے مسلمانوں کو یوں تباہ و برباد کر دیا؟ اس سوال کے جواب دینے میں مسلمانوں نے بہت بہت کچھ موشگافیاں کی ہیں اور اس بے نظیر بربادی کے اسباب کا حتے الوسع خوب خوب پتہ لگایا ہے اور تحقیق و تفتیش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے آخر بڑی تلاش اور جستجو کے بعد اس قدر معلوم ہوا جیساکہ تاریخ الدول میں علامہ امام فخرالدین رازی نے لکھا ہے "علماء کے خلفشار اور باہمی جھگڑوں اور بدعتوں کے ایجاد نے اسلامی سلطنتوں میں وہ کام دیا کہ جیسے گھن لکڑی میں کام کرتا ہے۔ اگر ان ایسے علماء کے ہاتھوں سے جو بدعتوں کے بانی ہیں موجودہ سلطنتیں بچائی گئیں تو کہیں ڈھونڈھے سے بھی نام و نشان کسی اسلامی سلطنت کا نہ ملے گا۔"

فاضل امام کی یہ رائے ازحد قابل وقعت اور لائق تحسین ہے، اس میں شک نہیں جس

نے خدا ورسول کے خلاف رستہ اختیار کیا وہ کبھی منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گا۔

یہ تغیر وتبدّل اور ترقی وتنزل ابھی ہندوستانی حدود کے باہر مسلمانوں میں ہو رہا تھا
ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زیادہ ترقی پر تھی لیکن افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ اُن کی
ملکی ترقی کے آگے مذہبی بہبودی برابر کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ اور اُس کی وجہِ خاص وہ عظیم الشان
اتحاد تھا جو ہندو مسلمانوں میں قائم ہوتا جاتا تھا جب سے مسلمان ہندوستان میں آئے تھے
آخر دم تک ان کے ہوس ناک طبائع فتوحات کی طرف مائل رہے۔ اس لئے نہ کوئی اسلامی کالج
کی بنیاد پڑی اور نہ بغداد کی طرح دار العلوم بنائے گئے۔

پہلے ہی صورت خاندان عباسیہ کی بغداد میں تھی کہ ملکی فتوحات اور سول جنگوں کے
آگے انہیں علمی ترقی کی مطلق خبر نہ رہی تھی مگر وہ اپنی غلطی پر بہت جلد آگاہ ہوگئے تھے، اور
انہوں نے علمی دنیا میں وہ نمایاں ترقی کی تھی جو اب تک یورپ میں وقعت کی نظر سے دیکھی
جاتی ہے افسوس ہے ہندوستان کی تعیش خیز آب وہوا نے مسلمانوں کی اس حالت کو بدل دیا
در وہ ایسے عظیم الشان سلطنت کے یکایک ہاتھ لگ جانے سے کچھ ایسے سرخوش اور بے خود
ہوئے کہ اپنی آئندہ نسل کی بہبودی کا خیال ان کے دلوں سے بالکل نسیاً منسیا ہوگیا۔

ہندوستان میں اکبر کی سلطنت ایک پُرامن اور پُرشوکت سلطنت کہلائی جاسکتی ہے مگر
افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ بنی فاطمہ اور بنی امیہ اور خاندان عباسیہ کے علوم کی لین ڈوری ہمالیہ
پہاڑوں کو پھلانگ کے نہ آسکی، اور ہمیشہ مسلمانوں نے تلوار ہی پر اپنی قسمت کا فیصلہ دیکھا۔
بظاہر ہندوستان میں دنیاوی جاہ وجلال اور سلطانی جبروت کو شوکت ہوتی جاتی تھی، لیکن اسلامی
علوم مٹتے جاتے تھے، اور اُن کی طرف توجہ کم ہوتی جاتی تھی۔ اکبر کے بعد اس کے بیٹے جہانگیر
کی گورنمنٹ گو پُرامن گورنمنٹ تھی مگر نور جہاں کے ہاتھوں میں پڑ کر اس کی بنیادیں متزلزل ہوتی
چلی تھیں، وہی شیعہ سُنی کا پُرانا مہیب جھگڑا پھر تازہ ہو چلا تھا لیکن جہانگیر کی قبل از وقت وفات
نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد شاہ جہان کی گورنمنٹ نے گو وہی اکبری رنگ کو قائم رکھا
پھر بھی ہندوستان کی نئی صورت بدل دی۔ اور فن عمارت کی ایک شان معلوم ہونے لگی، اس کی
یادگار تاج بی بی کا مقبرہ اور جامع مسجد وغیرہ اب تک قائم ہے، ساتھ ہی اس کے یہ حسرت د

افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ مذہبی علوم کی اتنی ترقی نہ ہوئی، یہ سلاطین برائے نام حنفی المذہب تھے، لیکن حضرت ابو حنیفہ رح کے فقہی اصول جن کا تعلق ملکی معاملات سے تھا، بہت کم فوجداری اور دیوانی معاملات میں دخیل تھے۔ یہ بادشاہ اپنی ملکی شوکت تلوار کے زور سے قائم رکھنا چاہتے تھے، انہیں کبھی یہ خیال نہ گزرا کہ علوم جدیدہ سے جو اندلس اور بغداد میں مسلمانوں نے ایجاد کئے تھے اپنی شوکت بڑھاتے۔ پھر عالمگیری دور دورہ آیا یہ اور بھی زیادہ آئندہ نسلوں کے لئے خوفناک ثابت ہُوا، گو عالمگیر کی ملکی پالیسی بڑی زبردست اور پر رعب تھی مگر اس کی یہ خواہش کہ ہندی گورنمنٹ کو مذہبی گورنمنٹ بنادوں بر نہ آئی۔ گویا اس نے سنگلاخ چٹانوں پر بغیر ہل چلائے بیج ڈالا اور اس کے بار آور ہونے کی امید کی، چونکہ اس کا یہ کام خلافِ قانونِ قدرت تھا، اس لئے وہ کامیاب نہ ہوا، اور اس کا زہریلا نتیجہ سلطنت مغلیہ کو ہڑپ کر گیا۔

عالمگیر بے شک علم دوست تھا، اس کا مذہب حنفی تھا اور جس سلطنت کی اس نے بنیاد ڈالی تھی اس کے قائم رکھنے کے لئے عالمگیر سے بھی زیادہ پر رعب، سنجیدہ، اولوالعزم، عاقل، مدبر سلطان کی ضرورت تھی مگر بدقسمتی سے اُس کے بیٹے بہادر شاہ میں عالمگیر کی عقل ورائے اور زبردست طبیعت کا ایک سواں حصہ بھی نہ تھا، بھلا وہ کیونکر اپنے باپ کی نئی سلطنت کو سنبھالتا دوسرا بڑا غضب یہ تھا کہ وہ شیعہ المذہب تھا، اور اس نے اپنی قلیل مُدت حکومت میں شیعہ گروہ کو سُنیوں پر سبقت دی، اس تدبیر نے اور بھی ایک تہلکہ عظیم اسلامی ہندی سلطنت میں برپا کر دیا، بنی بنائی عمارت کی بنیادیں چرچرا گئیں، اور عالمگیر کی اکیاون برس کی محنت اس کے بیٹے بہادر شاہ نے ملیامیٹ کر دی۔

حنفی مذہب جو فاتحان ہند اپنے ساتھ ہندوستان میں لائے تھے، بجائے اس کے کہ وہ فتوحات ملکی کے ساتھ ہندوستان میں ترقی کرتا الٹا کچھ ایسا بُت پرستی اور ہندوانی رسوم کے ساتھ خلط ملط ہوگیا کہ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کا علیحدہ کرنا مشکل ہوگیا۔

سلطانی حرم سرا میں جہاں بہت کچھ اسلامی رسومات کی اشاعت کی اُمید کی جاتی تھی۔ زیب النساء کی جدت پسند طبیعت نے ہندوانی رسومات کے جگر سے نئی نئی باتیں تراش کے خواتین اسلام میں ان کو رواج دیا، کناگت جو ہندوؤں کے ہاں مردوں کی فاتحہ کے لئے سالانہ

حلوہ پوری پکائی جاتی ہے، شب برات کے حلوہ پوری سے اس کا تبادلہ کر دیا۔ اسی طرح سے اور بیہودہ رسمیں شادی بیاہ کی جو ہندوؤں کے ہاں خاص تھیں وہ دوسرے ناموں سے مسلمانوں کے ہاں داخل ہوگئیں، ان کی اشاعت کی وجہ صرف خدا اور رسول کے احکام سے ناواقفیت تھی جو ہندو مسلمان ہوتے تھے ان کو تلقینِ دینی کرنے کے لئے نہ کوئی اسلامی کالج تھا نہ دارالعلوم تھا وہ بیچارے مسلمان ہوتے ہی جو اپنے بھائی مسلمانوں کو دیکھتے تھے کرنے لگتے تھے اور شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ ہندوانی رسمیں اسلامی رسومات کہلانے لگیں اور بغیر کئے کسی مسلمان کو چارہ نہ تھا۔

شخصی تقلید کے دوسرے معنے لے کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا یہ عمل بھی ایک برائے نام عمل تھا کاش حضرت ابو حنیفہ کے ہی اقوال پر عمل ہوتا تو اتنے مسلمان نہ بگڑتے۔

عالمگیر تک تو حنفی المذہب میں کچھ جان باقی تھی اور عالمگیر کو بھی اس طرف خیال تھا کہ کُل دربار کا مذہب حنفی ہو جائے، لیکن اس کے جانشینوں کی تعیش خیز حالت نے اس خواہش کو بھی مسلمانوں کے دل سے نکال دیا اور اسلام ہندوانی مذہب کے ساتھ مل کر کچھ ایسا گھی کھچڑی ہو گیا کہ ذرا بھی شناخت قائم نہ رہی، کلام مجید کی آیتیں جو خاص ہدایت کے لئے ہمارے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے نازل ہوتی تھیں، جھاڑا پھونکی میں ان کا استعمال ہونے لگا اور جیسا برہمن گیتا کے درس پڑھ پڑھ کے کسی بیمار پر پھونکتے تھے، اسی طرح مسلمان بھی قرآن شریف کی آیتیں بڑبڑا کے بیماروں اور مستانوں پر پھونکنے لگے۔ بدعت کی صدہا شاخیں پھوٹ آئیں، اور ہر شخص طرح طرح کی بدعتوں کا موجد بن گیا۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی ارکان کو اول دن سے ضعف تھا، اور بے چارہ حنفی مذہب کبھی کا یہاں سے رفو چکر ہوگیا تھا۔ اس کا ثبوت ڈاکٹر برنیز کا سفرنامہ دے رہا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"میں نے عالمگیری دربار کو جیسا پرشوکت پایا اسی قدر اس کے امراء کو مذہب اسلام کی طرف سے ضعیف دیکھا کوئی امیر ایسا نہیں ہے جس کے ہاں دس دس بارہ نجومی ملازم نہ ہوں جو کام وہ کرتا ہے جب تک نجومی نہیں بتا دیتا اسے اس کام کو

کرنے کی مہارت نہیں ہوتی، میرے آقا کے ہاں جس کے ہاں میں ملازم ہوں ایک درجن جوتشی اور نجومی ملازم ہیں، بھلا جب عالمگیر جیسے پابند شرع کی سلطنت میں یہ بدعت پھیلی ہوئی تھی تو اس کے کمزور جانشینوں کے زمانہ کا کیا کہنا۔"

علماء کا گروہ سخت حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا، اور علوم دین کی انتہا شرح ملا پر رکھی گئی تھی۔ ساتھ ہی اس مذہبی تنزل کی بیہودہ تصانیف کا زور ہوا، اور وہی کتابیں درس میں داخل ہو گئیں، بڑے بڑے شرفاء اور عمائد جو بڑے ڈینگ کی لیتے تھے، اور کوئی اپنے کو نجدی کوئی بغدادی، کوئی مکی، کوئی مدنی بخاری بتاتا تھا، ان کی خواتین سیتلا ماتا کی پرستش کرتی تھیں۔ دسہرہ ان کے ہاں پوجا جاتا تھا، بت پرستی خوب طمطراق سے ہوتی تھی، عیدین میں بھی ہنود کی رسمیں ایسی ملا دی تھیں کہ عید عید نہ رہی تھی۔ مسجدوں کا ادب مطلق نہ رہا تھا، اور وہ شہنشاہ جو اپنے کو ظل اللہ اور نائب رسول اللہ کہنا بڑا فخر جانتے تھے، سالانہ نوروزی جشن میں ہاتھوں میں کنگن بندھوانا اپنی شوکت کی بانگی جانتے تھے۔

کلام مجید کی وہ گت بنی تھی کہ العظمۃ للہ۔ اس کی روشن آیتیں بیہودہ اور خرافات مشاعروں میں شاعر بطور مضحکہ استعمال کرتے تھے، اور کوئی روکنے والا نہ تھا۔

اب ہم محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں آتے ہیں جو انتہا درجہ کا ملکی اور مذہبی پہلو سے تاریک تر اور ناپاک تھا، شریعت محمدی پر مضحکہ خیز نکتہ چینیاں عین دربار میں ہوتی تھیں، اور مے نوشی کی لذتوں اور سرخوشانہ اور بیخودانہ حالتوں کے آگے احادیث نبوی پر قہقہے اڑائے جاتے تھے، چند بیچارے عامل حدیث اپنی جانیں چھپائے ہوئے کہیں کسی گوشہ میں پڑے ہوئے اور اپنی جانوں کے خوف سے ذرا بھی اُکس نہ سکے تھے۔ وہ ڈوم درباری جو محمد شاہ کے ارکان دولت تھے، روز مذہبی نقلیں کرتے تھے، اور ان نقلوں میں خدا اور اس کے پاک نبی کی توہین کی جاتی تھی۔ جھوٹے جھوٹے فتوے لکھے جاتے تھے اور انہیں قلعہ کی چاردیواری میں مشتہر کیا جاتا تھا، گویا یہ سلسلہ تھا خدا اور نبی پر جھوٹے طوفان اٹھانے کا۔ شریعت غرا میں جن امور کو سختی سے منع کیا ہے وہ بہت شوق اور دھوم دھام سے کئے جاتے تھے، اور ان کا کوئی روکنے والا نہ تھا، درباریوں کی ہمہ دانی کی ایک یہی مثال کافی ہے کہ جب نادرشاہ کا ایلچی آیا اور اس نے نادر کا رقعہ دیا تو تین برس تک اس میں

جھگڑا ہوتا رہا کہ نادر کو القاب کیا لکھا جائے۔ ایسے ایسے ہمہ دان لوگ دربار کے زیور بنے ہوئے
تھے۔ یہ اسلامی سلطنت تھی اور یہ اُس کا مذہب تھا۔

ڈوموں کے عروج نے تصوف کو رونق دی، اور صوفیوں نے وہ ہاتھ پیر پھیلائے کہ رہا سہا
اسلام کا نام اور بھی مٹ گیا، مذہب تصوف گو مسیحی فرقہ ردبن کیتھلک سے نکلا ہے، پھر بھی یہ مذہب
ہر طرح سے قابل وقعت ہے، اس کا پہلا اصول انکساری ہے جو اسلام میں بڑا رکن مانی گئی ہے،
گو شریعت محمدی کی پوری تقلید کرنے میں مذہب تصوف ہمیشہ قاصر رہا، پھر بھی اس مذہب نے جو
پہلو اسلام کا اختیار کیا ہے، اس سے کوئی دھبہ اسلام کے دامن پر نہیں لگتا۔ مگر یہ ان جلیل القدر
صوفیوں کا ذکر ہے۔ جن کے پاک نفوس سے اسلامیوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچا، اور انہوں نے اپنی
وہ اعلےٰ اعلیٰ تصانیف چھوڑی ہیں جو اب تک موجودہ نسلوں کو فائدہ پہنچا رہی ہیں، مگر ہندوستان
میں محمد شاہ کے وقت میں جس تصوف نے رنگ جمایا تھا وہ اسلامی توہین کا اپنے میں بہت بڑا
مادہ رکھتا تھا۔ امرد پرستی اور ناپاک عشق کا صوفیوں کی مجلسوں میں عروج ہُوا، اور اس قبیح
زبوں تر رسم امرد پرستی نے یہاں تک زور کیا کہ علمار کو لغات کی کتاب میں لفظ علّت شائع
بڑھانا پڑا۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک نہایت شرم اور ذلت کی بات ہے کہ ان کے لغات کی
کتابوں میں ایسا لفظ جس کا مفہوم یہ ناپاک اور غلیظ ہو کر جس کو زبان پر لاتے ہوتے سخت شرم
آتی ہے، اور بے غیرت سے بے غیرت آدمی عرق عرق ہو جاتا ہے، موجود ہو۔ محمد شاہ کے زمانہ
میں اس جھوٹے تصوف اور قابل تنفر صوفیوں کو جس قدر عروج ہوا وہ تاریخ میں ایک نامور
زمانہ ہوا ہے۔ اکثر عظیم الشان جلسوں میں اللہ ہو کی صدائیں اور جھوٹے صوفیوں کے چٹخاروں
کی آوازیں بلند ہوتی ہوئی سنائی دیتی تھیں اور ان میں وہ وہ خرافات باتیں ہوتی تھیں کہ جو قابل
بیان نہیں نہ قانون انگلشیہ اجازت دیتا ہے کہ ان کی پوست کندہ حالت لکھی جائے نہ ہماری محمدی
تہذیب حکم دیتی ہے کہ ہم ان غلیظ حالات کا ایک فقرہ بھی معرض تحریر میں لاسکیں۔

ان مکتبوں میں جو برائے نام شاہجہان آباد (دہلی) میں قائم تھے، سوائے کائیتوں کی
بے معنے تصانیف کے اور کچھ نہ پڑھایا جاتا تھا نہ علم حدیث تھا نہ تفسیر نہ فقہ کچھ بھی نہیں۔
دیوان حافظ کی تلاوت (سطالعہ) قرآن مجید کی طرح صوفیوں کی مجلسوں میں کی جاتی تھی۔ اور اسے

اس ادب سے پڑھا جاتا تھا گویا یہی الہامی کتاب ہے، وہ تہذیب اور شائستگی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھائی تھی، اس پر قہقہہ اڑایا جاتا تھا، نیچی ڈاڑھی محمد شاہی دربار میں بازی گاہ طفلاں بن رہی تھی۔ نہ حیا تھی نہ شرم۔ اگر تھی تو میخواری اور عیاشی، کوئی امیر ایسا نہ تھا کہ جس کے گھر میں شراب کی کشید نہ ہوتی ہو، اور صوفیوں کی کوئی مجلس ایسی نہ تھی کہ جہاں خم کے خم شراب کے نہ لنڈھتے ہوں۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑ گئی تھی، اور زناکاری گویا ان کا روزمرہ ہو گیا تھا۔

عرب کی وہ کیفیت جو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ طفلی میں تھی، اس عہد محمد شاہی سے بہت مشابہ تھی، بڑے بڑے شریف زادے اور مغل بچے اپنا نشیمن تکیوں میں رکھتے تھے، اور رات دن بھنگ اور چرس اور گانجہ میں مبتلا رہنا یہ ان کی قیمتی زندگی کا جزو اعظم تھا۔

نہ کسی کو محمدی مذہب کی خبر تھی، نہ کوئی حنفی مذہب کو جانتا تھا نہ کوئی امام مالک کا سچا پیرو تھا، اور نہ امام شافعی کے اصول فقہ کا کسی کو علم تھا، اور نہ امام حنبل کی کوئی تقلید کرتا تھا ایک عجب اندھیر مچا ہوا تھا۔ بدعت اور وہ بھی زبوں تر بدعت کا گھر گھر رواج تھا، شاہ سے لے کے فقیر تک اور شریف سے لے کے رذیل تک سب ایک ہی مہلک مرض میں گرفتار تھے۔

اسلام کے چند ارکان باقی رہ گئے تھے مثلاً روزہ، نماز اور نکاح مگر ان روشن ارکان میں بھی بدعت نے ایسی رنگ آمیزی کی تھی کہ فرائض سخت بدعت کی صورت میں جلوہ دینے لگے تھے مثلاً روزہ، شراب اور بھنگ کے پیالہ سے کھولا جاتا تھا، اور نماز حالتِ مخموری میں پڑھنا بُرا کام نہ خیال کیا جاتا تھا، رہا نکاح اس کی تو سب سے بری کیفیت تھی، جتنی رسمیں کہ اہل ہنود کے ہاں جاری تھیں وہ سب نکاح میں برتی جاتی تھیں، پھیرے ہونا پنڈت کا آ کے اشلوک پڑھنا وغیرہ جن رسموں کا کچھ کچھ نشان اب مسلمانوں کی شادی بیاہوں میں پایا جاتا ہے۔ جوں جوں اسلامی ہندی سلطنت کو ضعف ہوتا گیا، بدعتوں کا جاہ و جلال بڑھتا گیا، اور وہ وہ ناقابل بیان عادتیں مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں کہ جن کی پہلے کبھی اُمید نہ کی جاتی تھی۔

مسلمانوں کی جدت پسند طبائع اُن رسومات میں جو اُنھوں نے ہندوؤں سے لی تھیں، روز مرہ نئی نئی تراش خراش پیدا کرتی تھیں، اور ان کو کفر و الحاد کی ایسی خوشنما رنگ آمیزی میں رنگتی تھیں کہ ہر برتاوِ پیران پر شیدا و دالہ دکھائی دیتا تھا۔

محمد شاہی دربار میں تین سو برہنہ کسبیاں ہر وقت ناچا کرتی تھیں، اور جب وہ تھک جاتی تھیں تو اور تین سو ان کی جگہ لے لیتی تھیں۔ شراب کا دور ہر وقت جاری رہتا تھا۔ اور قلعہ میں بیگموں کے چال چلن کی جو کچھ کیفیت تھی، وہ پیرس کے تماشہ گاہ سے بہت کچھ مناسبت رکھتی ہے۔ بیگمیں کون تھیں؟ اکثر ڈومنیاں، بازاری کسبیاں، راجپوتنیاں، میواتنیاں تھیں، جن پر کسی زمانہ میں محمد شاہ نے فریفتگی ظاہر کی تھی، اور وہ بیگم بن کے قلعہ کی چار دیواری میں مقید ہو گئیں تھیں، قلعہ میں عموماً نصف برہنہ عورتوں کا پہرہ رہا کرتا تھا، یعنے ناف سے اوپر تک تو وہ زرق برق پوشاک میں آراستہ ہوتی تھیں، پانچوں ہتھیار زیب تن رہتے، اور ناف سے نیچے تک کا جسم بالکل برہنہ ہوتا تھا۔ گو یہ بات بظاہر سخت تعجب اور حیرت کی معلوم ہوگی، لیکن وہاں یہ ارذل حالت انسانی ایک معمولی حالت تھی اور کوئی عیب بھی نہ سمجھتا تھا۔

شرع محمدی میں تو شاید (جیسا کہ مشہور ہے) چار نکاحوں کا حکم ہے لیکن وہاں کوئی امیر ایسا نہ تھا کہ جس کا گھر سو سو پچاس پچاس بیویوں سے نہ بھرا ہوا ہو۔ ان پر وہ شدید شدید مظالم توڑے جاتے تھے کہ جن کے سننے سے کلیجہ شق ہوتا ہے۔ ایک بے گناہ خاتون کے لئے اپنے خاوند کی ذراسی خفگی سبب موت ہو جاتی تھی، برائے نام فوجداری اور دیوانی عدالتیں نام تھیں اور یہ بھی مشہور تھا کہ امام ابو حنیفہؒ کی فقہ پر عمل ہوتا ہے مگر یہ سارا دھوکا ہی دھوکا تھا، عالمگیر کے زمانہ میں تو ایک آدھ جگہ فقہ حنفی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، لیکن اب تو حنفی مذہب کا نام عنقا صفت ہو گیا تھا۔ یہ دستور تھا کہ جب تک برہمن حکم نہ کرے قاضی کسی مقدمہ کے فیصلہ کرنے کی مبادرت نہ کرتا تھا، آخر اُن بیہودہ اعمال کی سزا اہل دہلی اور محمد شاہی دربار کو خدا کی طرف سے دی گئی کہ نادر شاہ آدھمکے اور عین بقر عید کے دن وہ سخت قتلِ عام ہوا جس کے حالات کے خونی حروف اب تک زمانہ کی پیشانی پر لکھے ہوئے ہیں۔

خدا کی طرف سے گویا مسلمانوں کو یہ ایک تازیانہ تھا کہ اب بھی وہ اپنی حالت کو سنبھالیں

لیکن یہ قوم کچھ ایسی اپنی بدنصیبی کے نشہ میں مخمور تھی کہ ایسے سخت تازیانہ سے بھی نہ چونکی پر نہ چونکی۔

اب ہم دو تین محمد شاہ کے جانشینوں کا حال قلم بند کرتے ہیں، اور دہلی کی تازہ نئی تباہی کا بیان کرکے اپنے ناظرین کا وقت نہ لیں گے، صرف اس زمانہ کا حال بیان کرتے ہیں کہ جب بادشاہ دہلی سرکار انگلشیہ کے پنشن خوار بن کے قلعہ میں رہتے تھے ... جلیل القدر علماء کا ایک خاندان اپنی تابانی دکھا رہا تھا۔

یہ زمانہ اکبر شاہ کا ہے، جب ہمارے شہیدِ دینِ محمدی کا ظہور ہوا تھا۔ اس زمانہ کی کیفیت بھی قابلِ بیان ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ایسے وقت میں شیرِ اسلام (شاہ اسمٰعیل صاحب) کا ہونا کس قدر ضروری اور لابدّی تھا۔ اکبر شاہ گو پنشن خوار سرکار انگریزی کے تھے، لیکن ان سے برتاؤ بہت اچھا ہوتا تھا اور ان کی درباری عزت وہی قائم تھی کہ جیسے کسی خود مختار رئیس کی قائم ہوتی ہے، مرہٹوں نے بے چارے شاہ عالم سے جو کچھ ذلیل برتاؤ کیا تھا اس کو انگریز سخت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور بادشاہ کی عزت قائم رکھنی اپنا اصولِ سلطنت جانتے تھے، اس زمانہ میں مسلمان گویا بالکل تباہ و برباد ہو چکے تھے، اور اب ان کی سلطنت بھی باقی نہ رہی تھی بجائے اس کے کہ وہ اپنی زبوں حالت سے کچھ عبرت پکڑتے، اُلٹا وہ اور بھی بدتر حالت میں اپنی زندگی گزارنے لگے اور جو کیفیت کہ مسلمانوں کی محمد شاہ کے وقت میں تھی اس سے زبوں تر اب ہوگئی۔

علماء کا خاندان گو بہت کچھ اصلاح کر سکتا تھا، لیکن وہ کچھ ایسا دبا ہوا تھا کہ سوائے معمولی فتویٰ دینے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا شاہزادوں کی عجیب و غریب کیفیت تھی، انہوں نے جامع مسجد کو جو ایک پاک اور برتر مقام مسلمانوں کا گنا جاتا ہے، اپنا دیوان خانہ اور عیش و عشرت کی جگہ بنا رکھا تھا۔ ہر سال نوروز میں رنگ برنگ کے انڈے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لڑائے جاتے تھے اور اُن پر جُوا کھیلا جاتا تھا۔ جامع مسجد کے اندر حوض کے گرداگرد خوانچہ والوں کی کثرت اور خریداروں کی جماعت عجیب کیفیت پیدا کرتی تھی۔ شہزادے، امیرزادے عوام الناس ڈنے لے لے کے اُڑاتے تھے، اور پھر دنے وہیں پھینک دیا کرتے تھے، صبح کو روزمرّہ دونوں کا ایک

ڈھیر ملتا تھا۔ کوئی عالم یا فاضل یا قاضی یا مفتی یہ کہنے والا نہ تھا کہ جامع مسجد کی کیسی توہین کی جاتی ہے، اور خدا کے گھر کی کیسی بے ادبی ہے کہ یہاں سودے والے سودے بیچتے ہیں اور کوئی منع نہیں کرتا۔

قلعہ میں قرآن مجید کی آیتوں کے نئے نئے حقارت انگیز نام رکھ لئے تھے، اور ان ہی ناموں سے وہ آیتیں پکاری جاتی تھیں، مثلاً سورہ یٰسین کا نام نساوٹی سورۃ[1] رکھا تھا، اسی طرح ہر سورۃ کا نام یوں ہی قرار دے لیا گیا تھا، قرآن شریف کی تلاوت یا نماز پڑھنا قلعہ میں توخصوصاً عیب ہی گنا جاتا تھا، ہر شہزادے کے ہاں دو دو تین تین ڈوم سارنگی اور ستار یا طبلہ بجانے کی تعلیم کے لئے ملازم تھے، اور وہ اُستاد اُستاد کے نام سے ہر انجمن میں پکارے جاتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جس میں حرام و حلال کی ذرا بھی شناخت نہ رہی تھی، اور ہر فرد بشر خواہ کسی درجہ اور طبقہ کا ہو رنڈی اپنا مذہب جانتا تھا۔

غرض کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں اسلام کی ذرا بھی بو آتی ہو، ہاں عیدین کو شاہی سواری کی دھوم دھام کسی قدر اسلامی گزشتہ شوکت کو یاد دلاتی تھی۔ ملانوں نے جہلاء پر غضب کی ہاتھا چھانٹی کر رکھی تھی نئی نئی قسم کی بدعتوں میں انہیں پھنسا کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے تھے، شب برات کے حلوے، عید کی سوّیاں تو ایک معمولی بات تھی، لیکن بیوی کی صحنک، شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کا گائے، بڑے پیر کی گیارھویں، مردوں کی ناواجب فاتحہ، پھول، دسواں، چہلم وغیرہ وغیرہ وہ قابل تنفر رسمیں تھیں جنھوں نے ملانوں کے صدقہ میں ان پڑھ مسلمانوں میں گھر کر رکھا تھا۔ ہر مہینہ بڑے پیر کی گیارھویں بڑے شد و مد سے کی جاتی تھی، اور اسے دین اسلام کا ایک رکن عظیم جان کے انجام دیا جاتا تھا یہ مجلسیں جو مذہبی مجلسیں کہلاتی تھیں، ان میں غربا کا کوئی استحقاق نہ تھا، اُن کو دھکے دیے جاتے تھے، اور وہاں ان کا قدم تک آنا سخت

---

[1] نساوٹی عورتوں کی بولی میں میتہ کو کہتے ہیں چونکہ یہ ایک رسم پڑ گئی ہے کہ ایسے شخص کے سرہانے بیٹھ کے جو جان کندنی کی حالت میں ہو اور اس کا دم نہ نکلتا ہو سورۃ یٰسین پڑھا کرتے ہیں اور یہ مشہور ہے کہ یٰسین کی سورۃ ختم ہوتے ہی مریض مر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے قلعہ میں سورہ یٰسین میتہ کی سورۃ مشہور تھی، اس کا نام لینا سخت زبون منحوس اور بدشگون سمجھا جاتا تھا، بھلا جہاں الہامی سورتوں کی یوں توہین کی جائے وہ جگہ کیوں نہ غارت ہوگی ۱۲

منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ جاہل امرا گیارہویں کرتے تھے، اور اس پہلو میں اپنے عیاش دوستوں کی دعوت کرنا مقصود ہوتا تھا۔ گیارہویں بظاہر ایک بزرگ اسلام کی یادگار کا ایک جلسہ ہے اگر اسے مذہب اسلام کا جامہ نہ پہنایا جاتا اور دنیاوی صورت میں بطور ایک یادگار کے سالانہ جلسہ کیا جاتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن کٹ ملاؤں نے غضب یہ کیا کہ بڑے پیر کی گیارہویں کو فرمودۂ خدا و رسول ٹھہرا دیا، اور جاہلوں کو اس طرح ورغلایا کہ وہ گیارہویں کو عین اسلام سمجھنے لگے تھے۔

قرآن عموماً رمضان میں یا یوں ہی معمولی طور پر مسلمان پڑھتے تھے، لیکن بیچارے معنے نہ جاننے کی وجہ سے خدا کے احکام سے محض نابلد تھے، کٹ ملاؤں نے یہ سمجھا دیا تھا کہ قرآن شریف کے معنے پڑھنے گناہ مول لینا ہے، چنانچہ اس کی شہادت وہ بُرا برتاؤ دیتا ہے۔ جو شاہ ولی اللہ صاحب کے ساتھ فتحپوری میں ملاؤں نے کیا تھا۔ جب شاہ ولی اللہ صاحب نے فارسی میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی اشاعت ہوئی تو ایک تہلکہ عظیم کٹ ملاؤں کے گروہ میں برپا ہوگیا وہ یہ سمجھ گئے کہ ہماری روزی کی عمارت ڈھا دی گئی، اب جہلا کبھی قبضہ میں نہ آئیں گے اور وُہ ہر بات پر بحث کرنے کو تیار ہو جائیں گے، اس خیال نے اُن کے دل میں ایک آگ بھڑکا دی اور وہ علاوہ کفر کے فتوے دینے کے شاہ ولی اللہ صاحب کے جانی دشمن ہوگئے، اور اب ان میں مشورے ہونے لگے کہ شاہ صاحب کو کیونکر قتل کیا جائے۔ ان کٹ ملاؤں نے جن کا بہت کچھ اثر شہر کے بد وضع لوگوں، اکھاڑوں، پٹے بازوں پر پھیلا ہوا تھا، چند بد معاش جمع کئے، اور اب وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تاک میں رہنے لگے۔ ہمارا فاضل ان کے اس غیر خوش آئندہ مشورہ سے بالکل ناواقف تھا، اس محبِ رسولؐ کا خیال مسلمانوں کی اصلاح کی طرف مائل تھا اس لئے اسے چنداں ملاؤں کی سازش کی نہ پرواہ تھی نہ یہ خیال تھا کہ یہ کسی نہ کسی وقت باعث مضرت ہوں گے، چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ عصر کی نماز فتحپوری میں پڑھ رہے تھے، اور آپ گویا محمدیوں کی جماعت کے امام تھے، ابھی آپ نے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازوں پر غل و شور کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور لوگ کچھ غیر معمولی طور پر غپڑ شپڑ کرتے ہوئے معلوم ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب کو کھٹکا ضرور تھا کہ شہر کے کٹ ملانے کبھی نہ کبھی کچھ آفت برپا کرینگے۔ اور اب آپ نے اس کا ظہور ہوتا ہوا دیکھا، آناً فاناً میں یہ خبر ان کے ساتھیوں کو جو آپ کے

پاس بیٹھے تھے پہنچ گئی، اور اب وہ بٹ پٹائے، کیونکہ ان کی تعداد بہ نسبت مفسدوں کے بہت کم تھی
وہ پانچ چھ سے زیادہ نہ تھے اور مفسدوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ یہ مفسد گو پورے
عزم سے آئے تھے لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مسجد میں گھس کے شاہ صاحب کو شہید کر سکتے۔ جب
شاہ صاحب کو بہ تحقیق معلوم ہو گیا کہ یہ میرے قتل کے لئے نرغہ کر آئے ہیں، انہوں نے اپنے دوستوں
سے کہا کہ تم جان بچا کے چلے جاؤ اور مجھے ان منافقوں کے ہاتھوں شہید ہونے دو، لیکن ان کی حمیت
اسلامی نے یہ گوارا نہ کیا اور وہ تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگے کہ جب تک جان میں جان باقی
ہے آپ پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب جن کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی سی لکڑی
تھی اللہ اکبر کہہ کے اٹھے اور کھاری باولی والے دروازہ کی طرف چلے۔ دونوں دروازوں سے سمٹ کے
منافقوں نے اس دروازہ پر روک لیا اور باآواز بلند کہا دیکھو ولی اللہ نکل نہ جائے۔ شاہ صاحب نے
یہ آواز سن کے نہایت دلیری اور متانت سے یہ سوال کیا کہ میں نے تمہارا کیا گناہ کیا ہے جس سے تم
میری جان کے دشمن ہوئے ہو اور میرے قتل پر آمادہ معلوم ہوتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ تو
نے قرآن کا ترجمہ کر کے بالکل عوام الناس کی نگاہوں میں ہماری وقعت کو کھو دیا۔ دن بدن ہماری
روزی میں خلل پڑتا جاتا ہے اور ہمارے معتقد کم ہوئے جاتے ہیں، یہ بہت بڑا صدمہ تو نے
نہ صرف ہمیں پہنچایا بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کو پہنچایا ہماری اولاد کی آئندہ زمانہ میں اتنی بھی وقعت نہ
رہے گی جتنی اب ہماری ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے یہ جواب دیا کہ خدا کی نعمت تم خاص کرنا
چاہتے تھے میں نے عام کر دی، کچھ دیر تک یہ رد و بدل ہوتی رہی، آخر شاہ صاحب نے ہمراہیوں
کے جو آپ کو حلقہ کئے ہوئے تھے دروازہ کی طرف قدم بڑھایا، کٹ ملاتے سینہ تان تان کے آگے
اکڑے ہوئے کہ ہم نہ جانے دیں گے، اس پر شاہ صاحب کے ایک ساتھی نے تلوار کا وار کرنا چاہا!
بدمعاش جو سب ہتھیاروں سے آراستہ تھے محمدیوں کو آمادہ دیکھ کے جھجکے، اور اب ان کے ہوش
پران ہوئے وہ بدمعاش اکھاڑے کے پہلوان خانہ جنگیوں میں زیادہ غلو رکھتے تھے، بھلا وہ ایسی
قلیل جماعت کی برہنہ تلواروں کے آگے کیوں کر قائم رہ سکتے تھے جو سچے دل سے اسلام پر
جان دینے کو تیار تھے۔ اس وقت شاہ صاحب کو بھی جلال آگیا تھا، اور ابراہیمی مصفا خون آپ
کی رگوں میں زور زور سے حرکت کرنے لگا تھا، آپ نے اپنے غیر معمولی جوش کی حالت میں اللہ اکبر

کا ایک نعرہ مارا، اور اس جماعت کو چیرتے پھاڑتے نکلے چلے گئے، کل بدمعاش اور منافق کٹ ملاّ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ کوئی حملہ شاہ صاحب پر کرتا، حقیقت میں بہت صحیح ہے ؂ دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است ؛ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ سُنا تو انہیں بہت رنج ہوا۔ رنج کے سوا بیچارے کر ہی کیا سکتے تھے، قلعہ میں ان کی اتنی وقعت نہ تھی جتنی کہ ان کے علم وفضل کی ہونی چاہیئے جو اثر شاہ ولی اللہ صاحب کا مدینہ مکہ اور نجد پر تھا افسوس ہے کہ وہ دہلی میں نہ تھا، ہاں کسی ڈوم اور کسبی کی سفارش بہت جلد چل جاتی تھی، اور بے چارے شاہ صاحب کی کوئی نہ سُنتا تھا۔

اُسی شب تمام کنبہ کے ممبر جمع ہوئے، اور انہوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے، یہ صاف معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کٹ ملاّ نے جانی دشمن ہو گئے ہیں اور انہیں شیعہ سرداروں نے بھی اُکسایا ہے کہ وہ شاہ صاحب کو یا تو شہید کر ڈالیں یا شہر دہلی سے نکال دیں، قصہ مختصر یہ کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے سفر عرب اختیار کیا اور منافقان اسلام کو دانت پیستا ہُوا اور ہاتھ سے ہاتھ ملتے ہوئے چھوڑا، جب شیر اسلام (شاہ اسمٰعیل) کا ظہور ہوا ہے، دربار دہلی اور اہل دہلی کی یہ کیفیت تھی، ارکان اسلام بدعتیوں کے پیروں کے نیچے پامال کئے جا رہے تھے اور نئی نئی بدعتیں روز روز ایجاد ہوتی تھیں، لیکن کوئی منع کرنے والا نہ تھا۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے علوم کا مہر جہاں تاب اپنی خوب تابانی دکھا رہا تھا، لیکن اس کی تابانی نہ اہل قلعہ پر پڑتی تھی اور نہ عمائد شہر پر۔ اکثر پردیسی اور چند غریب شہری آپ کے معتقدین میں سے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے علم و فضل کا سکہ گو دہلی کے ہر فرد بشر پر بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس کا یہ اثر نہ تھا کہ جو بدعتیں ملاّؤں کے کہنے سے عوام الناس اور عمائدین شہر کرتے تھے، ان میں کچھ کمی آتی۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے والد بزرگوار کی مخالفت کا خوفناک نظارہ ملاحظہ کر لیا تھا، اس لئے آپ احتیاطاً وہی باتیں اپنے وعظ اور تلقین میں بیان فرمایا کرتے تھے، جن پر اکثر الناس کا اتفاق ہو، اور کوئی اُس سے کسی حالت میں مخالفت نہ کر سکے۔

ایسے بدعت خیز و شرک انگیز زمانہ میں ضرور ایک ایسے نفس کی ضرورت تھی جو سچے اسلام کا نور چمکائے، اور ارکانِ اسلام کی خوب دھوم دھام سے اشاعت ہو وہ باتیں جن سے سراسر اسلام اور

بادشاہِ اسلام کی توہین ہوتی ہے مٹا دی جائیں، بدعت اور سنت کو علیحدہ کر لیا جائے، اور اس بُت پرستی کی بیخ و بنیاد اکھیڑ کر پھینک دی جائے، جس میں دہلی کا خصوصاً اور ہندوستان کا عموماً بچہ بچہ بتلا تھا۔ ناقابلِ برداشت بدعتوں اور شرمناک شرکوں کی حد ہو چکی تھی، اور کہیں برائے نام دیکھنے سے بھی اسلام کا پتہ نہ رہا تھا، اکبر شاہ گور پرست اور پیر پرست تھا، اور وہ ایسے لوگوں کو پیر بناتا تھا اور انہیں ولی اللہ جانتا تھا کہ جن کے ہاتھوں مہندی لگی ہوئی ہو، جن کی زلفیں لمبی لمبی اور عطر میں ڈُبی ہوئی ہوں جو پور پور چھلّے پہنتے ہوں جن کے کپڑے نفیس گیروا رنگے ہوئے ہوں، اور جو طبلہ کی چوٹ اور قوال کی ہائے ہائے پر لطافت سے گتیں بھرنا جانتے ہوں، جن کے ماتھے قبروں پر ٹکتے ہوں، ایسے نفوس کی تعظیم قلعہ میں بہت دھوم دھام سے کی جاتی تھی، بادشاہ مع بیگموں کے ان کے پاس خود آیا کرتے تھے، بیگمیں ان پر اور ان کی اولاد پر حلال تھیں، اور وہ ایک نگہ کی محتاج رہا کرتی تھیں یہ زبوں حالت تھی اہل قلعہ کی، بھلا پھر جامئ دین علمائے کبار کی اُن لوگوں کے آگے کیا خاک عزت ہوگی، جب مولانا فخر الدین صاحب جن کی ہیئت بالکل وہی ہوتی تھی جو اوپر بیان ہوئی نماز پڑھنے آتے تھے تو لوگوں کا اس قدر مجمع ہوتا تھا کہ تل رکھنے کو بھی جامع مسجد میں جگہ نہ ملتی تھی، بڑے بڑے رئیس یہ آرزو کرتے تھے کہ کسی طرح مولانا صاحب کے جامہ کا دامن ہی مس کر لیں اور اُن کے مقابلہ میں جب شاہ عبدالعزیز صاحب جامع مسجد تشریف لے جاتے تھے تو سوائے چند محمدیوں کے اور کوئی اُن کے ساتھ نہ ہوتا تھا۔

اس کی بالکل وہی مثال ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے جب ہجرت کی ہے تو صرف حضرت صدیق اکبرؓ ساتھ تھے مگر اس کے مقابلہ میں ابو سفیان کا بہت بڑا گروہ تھا۔ عوام الناس ایسے مجمعوں کو خدا کی طرف کے مقبولیت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات نہیں ہے وہ نری شیطانی باتیں ہیں اور انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے اصول سے کوئی تعلق نہیں دامن چومنا یا دامن پر بوسہ دینا یہ رومن کیتھلک کے عیسائیوں کا شعار ہے جو ان کے ہاں دو ہزار برس سے اب تک جاری ہے اسلام ان باتوں سے کوسوں دور ہے نہ کبھی آنحضرتؐ نے اپنے دامن چھوائے نہ آپ کے چار خلفا نے ایسی زشتی اور زبونی میں پھر غیرتِ حق کو حرکت ہوئی، اور ایسی حالت میں کہ جب علم دین بالکل مٹ چکا تھا، اور ہندوستان میں اسلام کا خاتمہ ہو چکا تھا، شیر اسلام (شاہ اسمٰعیلؒ) کا ظہور ہوا، اور اس نے اپنے قوت بازو اور تائید ایزدی سے شرک و بدعت کی تمام ظلمت کو مٹا کے حق کا نور چمکا دیا اور بدعت سنت میں فرق کر کے دکھا دیا یہ ایک زبردست خدا کی امانت تھی کہ سوائے شیر اسلام کے اور کوئی نہ اُٹھا سکتا تھا، اسی بہادر نے اٹھائی اور اس میں کامیاب ہُوا، فقط۔

پہلا باب

نام، لقب، خطاب، ولادت، تعلیم

اسمٰعیل نام، شاہ صاحب لقب، شہید خطاب، قاطع بدعت کنیت، شاہ صاحب کی تاریخ ولادت میں کسی قدر اختلاف ہے، مختلف روایتوں کو دیکھ کر ۱۲ ماہ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ ہجری صحیح معلوم ہوتی ہے۔ فطرت کو پہلے ہی سے منظور تھا کہ آپ کی پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہو جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ہندوستان میں لاثانی ہو اور اس خاندان کا ہر ممبر آسمانِ علم کا مہر جہاں تاب ہو یہ خاندان جس کی نسبت میں چند جملے تحریر کرنا چاہتا ہوں اپنی خاص نوعیت اور ذاتی صفات اور عام نفع رسانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ مہذب ممالک میں جہاں تہذیب و شائستگی نے قول ہار دیا ہے ایسے خاندان بہت کم دکھائی دیتے ہیں کہ جس کے ہاں کئی پشت سے علم و فضل کی ایک حالت رہی ہو، اور صدی ڈیڑھ صدی تک جب تک کہ اس خاندان کا خاتمہ ہو جائے ہر ممبر اپنی لیاقت اور ضمیری جوہروں میں لاثانی اور عدیم المثال ہو۔

فطرت نے یہ عظیم الشان شرف شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کے خاندان کو دیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے دادا تھے، ایک عجیب لیاقت اور غریب قابلیت کے شخص تھے، آپ کے ضمیری اور روحانی جوہر اپنے ہیں گہری ممتازیت کی تہ رکھتے تھے، آپ جیسے علمِ تفسیر میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، اسی طرح علم حدیث اور فقہ بھی آپ کو پانی تھا۔ جس نے ہندوستان میں پہلے حدیث کی درس و تدریس کی بنیاد جمائی ہے وہ شاہ عبدالرحیم صاحبؒ تھے۔ وہ ربانی اسرار اور الہامی نکات جو قرآن و حدیث کے لفظ لفظ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں، انہیں مسلمانوں پر ظاہر کیا، اور علم رسولؐ کی طرف سب کی دعوت کی، لیکن صدیوں کی خرابی جو مسلمانوں کے دلوں

میں بیٹھی ہوئی تھی، معمولی تلقین اور وعظ سے نہیں جاتی، شاہ عبدالرحیم صاحب نے ہرچند کوشش کی لیکن آپ کی کوشش بدعت اور شرک کے دریا کی خوفناک موجوں اور وحشت انگیز لہروں سے نبرد آزما نہ ہوسکی، اور پس پا ہوکے کنارہ پر واپس چلی گئی، اس ناکامیابی پر بھی یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ایک ایسا بیج بو دیا کہ بعد ازاں آپ کی اولاد کی کوشش سے وہ پھلا پھولا اور لہلہایا اور آخر شاہ اسمٰعیل صاحب کی بیش بہا کوششوں سے اس درخت میں پھل لگا اور الحمدللہ کہ وہ اب تک پھل دے رہا ہے اور تر و تازہ ہے۔

ہندوستان کی قسمت میں اول دن سے لکھا ہوا تھا کہ یہ مسلمانوں کے دینی اور دنیادی علوم کا حصہ نہ لے اور نہ اندلسی اور بغدادی علوم کی جان بخش ہوائیں کیا تو ایک طرف سے ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے ٹکرا کے رہ جائیں یا بحر ہند کی موجوں میں دوسری طرف غرق ہوجائیں یا تیسری جانب سے ہندوکش کے خوفناک دروں سے گرگرا کے وہیں گم ہوجائیں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب جنہوں نے پہلی ضرورت ہندی مسلمانوں میں علم نبوی کی اشاعت کی دیکھی واقعی ایک برتر الہامی خیال تھا جو بجلی کی طرح آپ کے دماغ میں کوندا، شاہ عبدالرحیم صاحب نے ایک مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس میں علم حدیث کی تعلیم دینی شروع کی، اس تعلیم نے چند سال میں اپنا قیمتی اثر مسلمانوں پر ڈالا اور اب جوق در جوق آپ سے حدیث سیکھنے کے لئے آنے لگے، گویا اسی تاریخ سے مذہب بدعت اور شرک کے ساکن سمندر میں ایک تحریک سی پیدا ہونے لگی مگر یہ خفیف تحریک ایسی نہ تھی کہ ایسے بڑے عظیم الشان سمندر میں کچھ معلوم ہوتی۔ اور ایک تموج خیز طوفان اس میں پیدا ہوتا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب قوانین فطرت کی باریکیوں اور مفہوم کو خوب سمجھتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ معمولی تختہ پر جب تک کہ اُسے خراد نہ کیا جائے اور اس پر منبتی نہ پھیری جائے، کبھی صفائی اور آسانی سے لکھا نہیں جاسکتا، اس لئے اُنہوں نے اپنی کوششوں کو بظاہر ناکامی کا جامہ پہنتے ہوئے دیکھ کے کچھ ہراس نہ کیا اور ہمیشہ دل میں یہ یقین رکھا کہ یہ ناکامیاں خوش آئندہ ہیں کیونکہ یہ بدیہی امر ہے کہ ہر مرض ہر طرح برا ہوتا ہے، لیکن اس مرض کو مبارک کہنا چاہیئے، جس کا انجام صحت ہو، انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ کام تھوڑا کرنا چاہتی ہے مگر صلہ زیادہ چاہتی ہے، اس فطرت پر جب محنتوں کا صلہ بظاہر ناکامی ملے تو ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ اس

وقت طبیعت کی کیا کیفیت ہوگی اور وہ کب اولوالعزمانہ روح کے ساتھ شوق کے میدان میں قدم بڑھاتی مگر وُہ پاک نفوس جنہیں فطرت سے ممتازیت کا حصّہ ملا ہے، اور ربانی جلال پورا ان کے مجموعۂ دل میں چمک چکا ہے وہ کبھی ظاہراً ہراس سے مایوس نہیں ہوتے، اور ہمیشہ اپنی قیمتی محنتوں کا حاصل آئندہ نسلوں کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب جنہوں نے مدرسہ رحیمیہ کی بنیاد ڈالی تھی، گو گورنمنٹ مغلیہ کی طرف سے ان کی مطلق سرپرستی نہیں کی گئی، اور نہ شاہ کی طرف سے طلبہ کے کچھ وظائف مقرر ہوئے۔ پھر بھی اس مدرسہ کو خاصی رونق ہوگئی، اور اب بعضے لوگوں کی زبان پر یہ مقدس الفاظ آنے لگے کہ بخاری میں یہ حدیث آئی ہے، اور ابوداؤد یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔ یہ بات قابل ریمارک ہے۔ ایسے بہت کم علماء تھے کہ جن کے پاس بخاری ہوتی، یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کو تفسیر کبیر کے دیکھنے کی جب ضرورت ہوتی تھی تو شاہی کتب خانہ میں آپ تشریف لے جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم تفسیر اور حدیث کا کس درجہ کم رواج ہندوستان میں تھا کہ ایسے جلیل القدر علماء کے پاس تفسیر کبیر تک نہ تھی۔

شاہ عبدالرحیم صاحب اتنے بڑے فاضل تھے کہ شاہ ولی اللہ صاحب جیسا فاضل اجل شخص یہ کہا کرتا تھا کہ میں اپنے باپ کے علم کے آگے ایسا ہوں کہ جیسے بحر کے آگے قطرہ۔ یہ کچھ شاعرانہ اور جھوٹی تعریف نہیں ہے، بلکہ جس نے شاہ عبدالرحیم صاحب کی تصانیف اور حواشی کو دیکھا ہے جو آپ نے معقول اور حدیث وفقہ کی کتابوں پر چڑھائے ہیں وہ ان سے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اس قول کی صداقت پوری پوری اندازہ کرسکتا ہے۔ اس بدعت وشرک کے زمانہ میں جب لوگوں نے علم نبوی کو بالکل بھلا دیا تھا، اس خاندان کے علم وفضل کی آوازیں ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر مسلمانوں کے ممالک روم وشام میں پہنچتی تھیں اور جس مسئلہ میں مکہ مدینہ کے علماء میں جھگڑا پڑتا تھا وہ ثالث بالخیر شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز کو بناتے تھے۔ ملا رشیدی مدنی اور شاہ عبدالعزیز صاحب سے جو خط کتابت ہوئی ہے، اس سے ہم اپنے دعویٰ کی سند دے سکتے ہیں، ایک خط میں ملا رشیدی نے یہ لکھا ہے "شاہ صاحب آپ کا کچھ ایسا اثر بلاد اسلامیہ میں ہوا ہے کہ جب کوئی فتوےٰ دیا جاتا ہے اور علماء اس پر اپنی مہریں کرتے ہیں تو ہر شخص تحقیق میں آپ

کی مہر کا متلاشی رہتا ہے، اور وہ فتویٰ جب تک اس پر آپ کی مہر نہ ہو زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا۔ اگر آپ یہاں تشریف لے آویں تو ہم لوگوں کے لئے بڑے افتخار کی بات ہے، اور سلطان ٹرکی بھی آپ کی بہت بڑی عزت کریں۔"

اس خط سے اُس مقبولیت کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی بلاد اسلامیہ میں تھی اس کو ربانی مقبولیت کہتے ہیں اور یہ اصلی علم و فضل ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان کچھ حد سے زیادہ مقبول انام تھا اور اس محترم خاندان کا ہر ممبر اپنی معاشرت کچھ اس طرز کی رکھتا تھا کہ کٹ ملانوں کا دست تظلّم دراز ہونے کا موقع نہ پاتا تھا۔ آخر اسلام کا نصیبہ جاگا اور شاہ اسمٰعیل صاحب جیسا شیر اسلام پیدا ہوا۔

فطرت نے پہلے ہی سے شاہ صاحب کے لئے قاطع بدعت کی کیفیت موزوں کر رکھی تھی، ایسے جلیل القدر خاندان علماء میں یہ شرف آپ ہی کی قسمت میں لکھا تھا۔ آپ کھلم کھلا بدعتیوں اور مشرکوں سے مخالفت کریں، اور اپنی خطرناک جرأت سے صاف طور پر احادیث نبویؐ کی تلقین کریں۔

جب حد پر مسلمانان ہند کی خراب حالت پہنچ گئی تو فطرت نے شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے ہاں آپ اسماعیلؒ کو پیدا کیا، آپ کی طفلانہ نظریں جب آپ اپنے گہوارہ میں تھے، اس آئندہ اصلاح کی جو مسلمانوں میں ہونے والی تھی پیشین گوئی کرتی تھیں، گو آپ دبلے پتلے اور نحیف پیدا ہوئے تھے، لیکن آپ کی فراخ پیشانی اس بڑے نصیبہ کی شہادت دے رہی تھی جو آپ کو آئندہ حاصل ہونے والا تھا۔ شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی یہ رائے ہوئی کہ اس بچہ کو کسی شریف انّا کا دودھ پلایا جاوے لیکن آپ کی والدہ بی فاطمہ نے (باوجودیکہ وہ بہت ضعیف تھیں) یہ منظور نہ کیا۔ اور ایسے ہونہار بچہ کو خود حد شرع تک دودھ پلایا، بچپن میں آپ حد سے زیادہ غریب اور خاموش تھے، شاہ عبدالغنی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میرے ہاں جو یہ پیدا ہوا ہے وہ کچھ ایسا چپ اور غریب ہے کہ رونا مطلق نہیں جانتا۔ اس نجیب اور شریف بچہ کی بچپن میں ایسی دھیمی اور حلیم فطرت تھی، لیکن جوں جوں آپ بڑے ہوتے گئے، مزاج میں انکساری آتی گئی، جن سوانح لکھنے والوں نے آپ کو تیز مزاج لکھا ہے، ان کی غلطی اور اصلی واقعات سے کم علمی ہے۔ آپ کا خُلق جب آپ

چھ برس کے تھے ایسا تھا کہ کل بچے آپ کے ساتھ کھیلنے میں خوش رہتے تھے۔ آٹھ برس کی عمر میں
آپ نے قرآن شریف حفظ کر لیا، اور یہ حفظ طوطے کی طرح نہ تھا بلکہ آپ کو کل قرآن مجید کے معنے
پڑھائے گئے تھے، گو اس زمانہ معصومیت میں ربانی نکات اور الہامی غوامض کو سمجھنا تو بہت
مشکل تھا، پھر بھی اکثر موقعوں پر جب اپنے ہمعصروں میں کھیلتے تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید
میں یہ لکھا ہوا ہے اور تم یہ کرتے ہو۔

ظاہری کتابی تعلیم جو ہر بچہ کو دی جاتی ہے یہ ضرور نہیں ہوتا کہ ہر بچہ اس تعلیم سے مصلح قوم بن
جائے مگر جسے فطرت اپنی بانگی اور ہنر کا نمونہ بنانا چاہتی ہے، اس کے ضمیر کو پہلے ہی ربانی
قابلیتوں اور ضمیری جوہروں سے آراستہ کر دیتی ہے، ایسی حالت میں اگر اسے ظاہری تعلیم نہ بھی
دی جائے جب بھی کچھ حرج واقع نہیں ہوتا، اور اس کے ضمیری جوہر ایک نہ ایک دن اصلی تابانی
اور درخشانی دکھا کے رہتے ہیں۔

اس جلیل القدر خاندان میں جس میں شیر اسلام کا ظہور ہوا ایک عجیب بات یہ تھی کہ کوئی بچہ
کسی غیر مولوی کا شاگرد نہ تھا، شاہ ولی اللہ صاحب نے جو کچھ پڑھا، اپنے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم
سے پڑھا، اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو کچھ تعلیم پائی وہ اپنے والد شاہ ولی اللہ صاحب سے
غرض اس واجب الاعتصام خاندان کا ہر ممبر اپنے ہی باپ یا چچا کا شاگرد ہوتا تھا، اور حقیقت میں
جب یہ بات تھی کہ یہ خاندان سرچشمۂ علوم تھا، پھر یہاں کا بچہ کیوں کسی بیرونی عالم سے تعلیم پانے لگا
یہ افتخار بھی ہندوستان میں اسی خاندان کو حاصل ہے۔ ریاضی پڑھنے کے بعد جس کو ہم آئندہ
بالترتیب بیان کریں گے۔

شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نے دو تین برس میں معمولی صرف و نحو کی کتابیں اپنے والد بزرگوار سے
نکال لیں۔ اور ابھی آپ کی گیارہ بارہ ہی برس کی عمر تھی کہ آپ کو علم صرف و نحو کچھ ایسا پانی ہو گیا کہ
بڑے بڑے تجربہ کار لگانہ کھاتے تھے، اس کے بعد آپ کو معقول کی کتابیں پڑھائی گئیں بھلا جس کا
دماغ کامل عقل سے پہلے ہی فطرت نے آراستہ کیا تھا، اسے ان معمولی کتابوں کا پڑھ لینا کیا مشکل تھا
آپ کو بارھواں سال شروع تھا جب آپ صدرا پڑھتے تھے، آپ کے ساتھ اور بھی کئی بڑی عمر
کے طلبہ شریک تھے مگر قاری آپ ہی تھے، صدرا جو ملانوں میں ایک بڑی لانیحل کتاب مشہور ہے، اقلیدس

کے پانچویں مقالہ کے اس کے بہت سے مقامات محتاج ہیں، چونکہ عام علماء میں سے ریاضی کا علم بالکل اٹھ گیا اس لئے وہ ایسی ایسی کتابوں کو جن کا کچھ بھی تعلق ریاضی سے ہوتا ہے بہت مشکل سمجھتے ہیں۔

شاہ اسمٰعیل صاحبؒ آٹھ آٹھ دس دس صفحے صاف پڑھ جایا کرتے تھے، لیکن کبھی کسی مقام پر رکتے نہ تھے نہ کوئی بات دریافت کرتے تھے، نہ آپ مطالعہ کتاب کرتے تھے نہ گھر میں جا کے سبق یاد کرتے تھے تو اکثر یہ ہو جاتا تھا کہ جب آپ دوسرے دن سبق پڑھنے کے لئے کتاب کھولتے تھے تو یہ بھول جایا کرتے کہ کل سبق کہاں تک پڑھا تھا۔ ایک سن رسیدہ شخص عبد الکریم بخاری آپ کا ہم سبق تھا، وہ شاہ صاحب کے لگاتار بے پوچھے گچھے پڑھنے سے بہت جلتا تھا، اور بہت سے مقامات بغیر سمجھے رہ جاتے تھے، ایک دن شاہ صاحب ورق گردانی کرنے لگے اور انہیں اپنے کل کے سبق کا پتہ نہ لگا، اس پر وہ بخاری ہنس کے کہنے لگا میاں صاحبزادے مکھی مار کے رہ گیا کرو تاکہ کتاب کھولتے ہی تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے کل یہاں تک سبق پڑھا تھا۔ یہ سُن کر شاہ اسمٰعیل صاحب ہنسے اور کچھ جواب نہ دیا۔

جتنے طلبہ شاہ صاحب کے ساتھ پڑھتے تھے خوش ایک بھی نہ تھا وجہ یہ تھی کہ ہر طالب علم صدرا کے ہر ہر مقام پر بحث کرنا اور اسے سمجھنا چاہتا تھا، اور یہاں سوائے روان عبارت پڑھنے کے نہ کہیں رکنا تھا نہ کسی مشکل مقام کو دریافت کرنا تھا۔

جب آپ ایک روز صدرا کے مشکل مقام کو پڑھ رہے تھے تو بخاری کو یقین تھا کہ یہاں یہ لڑکا ضرور ٹھہرے گا اور اس مقام پر ضرور ردو قدح ہوگی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ صاحبزادے صاحب کی یہاں بھی وہی کیفیت ہوئی جو اور مقامات میں ہوئی تھی تو وہ جھلا گیا اور اس نے جل کے یہ سوال کیا " صاحبزادہ تم کچھ سمجھے بھی یا یونہی گھاس کاٹتے چلے جاتے ہو " شاہ صاحب نے نہایت حلیمی اور انکساری سے جواب دیا، آپ کی سمجھ میں اگر کوئی بات نہ آئی ہو تو آپ دریافت فرمالیں، اس نے فوراً یہ سوال کیا کہ اسی مقام کو سمجھا دیجئے جس کو بلا دریافت کئے آگے بڑھ گئے۔ شاہ عبد الغنی صاحب اور کل طلبہ کی نظریں آپ کی طرف گڑ رہی تھیں اور ہر متنفس یہ دیکھتا تھا کہ دیکھیں اسمٰعیل بغیر استاد کے سمجھے اس مشکل مقام کو کیونکر حل کرتا ہے، گویا یہی دن

آپ کی علمی قابلیت کے امتحان کا تھا۔ اس ہونہار بچہ نے اس عمدگی اور صفائی سے اس مقام کو چٹکیوں میں سلجھا دیا اور وہ وہ معنے بتائے کہ سب دنگ رہ گئے، پھر صدرا کے حاشیہ پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس نے جو کچھ معنے لکھے ہیں وہ غلط ہیں۔ میں یہاں اس تقریر کو نقل کر کے زیادہ وقت ناظرین کا نہ لوں گا، ہاں اس قدر لکھنا ضروری جانتا ہوں کہ یہ وہ عالم فطرت تھے کہ اگر میر باقر داماد ہوتا تو زانوے شاگردی طے کرتا۔

جب آپ اس قریب قریب لاینحل مطالب کا حل کر چکے اور اپنے ضمیری جوہروں کی سب کو بانگی دکھا دی تو شاہ عبدالغنی صاحب کی خوشی کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ طلبہ شرمندہ ہو گئے، اور بخاری صاحب تو ایسے ذلیل ہوئے کہ پھر اُنہوں نے سیدھا بخارا کا راستہ لیا۔

جب منطق کی وہ معمولی کتابیں جو اس وقت درس میں تھیں شاہ صاحب نے ختم کر لیں تو حدیث شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے آپ نے پڑھنی شروع کی، علم حدیث ایک بڑا دشوار گزار علم ہے۔ اس کی اہمیت کو وہی شخص جانتا ہے جسے حدیث کا کچھ علم ہے۔ بایں ہمہ شاہ صاحب کو یہ مشکل علم بھی پانی تھا، مولوی کرامت علی صاحبؒ حیدر آبادی فرمایا کرتے تھے۔ میں مولانا شہیدؒ کا حدیث میں ہم سبق تھا مجھے خوب معلوم ہے اُنہوں نے کبھی مطالعہ نہیں کیا، نہ پڑھے ہوئے کو کبھی پھیرا، عام طلبہ جو آپ کے ساتھی تھے مولانا شہید کو بے پروا کہتے تھے، اور اُنہیں یقین تھا کہ پڑھنے کی طرف مولانا کی توجہ نہیں ہے، شب و روز تیر اندازی، گولی چلانا اور گھوڑے پر چڑھنے کے سوا وہ کبھی کتاب کو کھول کے بھی نہیں دیکھتے۔ روزمرّہ اس قسم کی باتیں سن سن کے شاہ عبدالعزیز صاحب نے طلبہ کے مجمع میں مولانا شہید سے یہ شکایت کی کہ تم کھیل کود میں زیادہ وقت صرف کرتے ہو لیکن مطالعہ کتب نہیں کرتے، شاہ صاحب نے عرض کیا آپ مجھ سے پڑھا ہوا کچھ دریافت فرمائیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے طلبہ کے سامنے مولانا شہیدؒ سے دریافت کیا، آپ نے فرفر بتا دیا، اور اس عمدگی سے بیان کیا کہ طلبہ کا کل مجمع دنگ ہو گیا۔

ذہانت اور حافظہ یہ فطرت کی خاص بخششیں ہیں جو بعض بعض نفوس کو عطا ہوتی ہیں، مولانا شہید کا خمیر کچھ ایسا قابل بنا تھا کہ اس پر تجلیات ربانی کا پرتو بخوبی پڑ سکتا تھا اور ہمیشہ وہ قوت جو ربانی نکات کے سمجھنے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہے، وقتاً فوقتاً اس کا جوش اس روشن ضمیر

میں پیدا ہوتا رہتا تھا۔ ایسی صورت میں نہ کسی کی تعلیم کی اتنی ضرورت تھی نہ مطالعہ دیکھنے اور غور کرنے کی حاجت تھی۔ جو لوگ ضمیری جوہروں سے کسی قدر بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ میرے قول کی تصدیق خود بخود کریں گے اور جو قلب کے اُتار چڑھاؤ اور اس کی لیاقتوں صفتوں سے محض نابلد ہیں نہ اُن سے میرا کلام ہے نہ وہ اس باریکی کو سمجھ سکتے ہیں۔

اگر ہم چشمِ بصیرت کھولیں تو ہمیں معلوم ہو کہ روزمرّہ ہماری آنکھوں کے آگے ایک ہی جماعت میں ایک ہی قسم کی تعلیم ہوتی ہے، پھر کیا وجہ ہے ایک ہی قسم کی تعلیم پانے والوں میں سے کوئی تو علامۂ دہر بن جاتا ہے، اور بیسیوں قیمتی تصانیف کر ڈالتا ہے، اور اکثر طلبہ یوں ہی زیغ میں ٹپے ٹوئیاں مارتے رہ جاتے ہیں نہ انہیں کچھ حاصل ہوتا ہے نہ کسی قسم کی قابلیت آتی ہے، حتیٰ کہ بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔

یہ صحیح ہے کہ محنت عجب چیز ہے اور کیسا ہی غبی شخص ہو محنت سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے مگر پھر بھی فطرتی ضمیری جوہروں کی وہ تابانی جو لاکھوں میں کسی قلب پر چمکتی ہے، نہ محنت سے حاصل ہوتی ہے نہ عرق ریزی کچھ کام دیتی ہے، وہ تو ضمیر اور دماغ پہلے ہی سے ان جوہروں سے آراستہ ہوتا ہے جو فطرت کی عین بخشش سمجھنا چاہیئے۔

زمانہ میں ہر ملک اور ہر شہر میں بڑے بڑے مصلح ملک و قوم گزر گئے کیا انہوں نے ابجد خوانوں کی طرح اپنا سبق چپاتھا یا فعل یفعل کی گردان کی تھی نہیں کچھ بھی نہیں؛ ان کے لئے معمولی تعلیم ایسی کافی تھی جیسے کئی صدی تک کسی ذہین شخص کو تعلیم دیئے چلے جاؤ، اور بعد ازاں اس کی واقفیت کا اندازہ کرو ان کی آواز میں اثر، لوچ، درد خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی نگاہ میں وہ قدرت ہوتی ہے کہ جس کی طرف نگاہ بھر کے دیکھا اور اپنا رام بنا لیا، یہی کیفیت شاہ اسمٰعیل صاحب رح کی تھی، آپ کے ضمیری جوہر عجیب و غریب قابلیت کا جامہ رکھتے تھے، اور خدا کی طرف سے آپ کو ایک ایسی خاص بخشش عطا ہوئی تھی، جس کی ایک زمانہ تک خود مولانا شہید کو خبر نہ تھی، پھر دوسرے اس جوہر کی کیونکر شناخت کر سکتے۔

یوں تو اس واجب الاحترام جلیل القدر خاندان کا ہر ممبر یکتائے روزگار اور فرید العصر تھا لیکن مولانا شہید کی تعلیم کا ڈھنگ سب سے نرالا اور جدا تھا۔ گو ۱۶ برس کی عمر میں آپ

فارغ التحصیل ہوگئے تھے، پھر بھی یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اتنی سی عمر میں فارغ التحصیل ہونا اور پھر ہر کتاب کو ازبر یاد رکھنا اور ان سے صدہا نکات اور باریکیاں پیدا کرنا یہ خاص صفت خدا کی طرف سے مولانا شہید ہی کو عطا ہوئی تھی۔

فطرت کو چونکہ آپ سے ایک عظیم الشان کام لینا تھا، اس لئے جتنی صفتیں کہ ایسے پاک نفس کے لئے لازم ہوتی ہیں وہ سب آپ میں موجود تھیں۔

تمام دینیات کی کتابوں کو اس چھوٹی سی عمر میں پانی کرکے پی جانا گو بادی النظر میں مولانا شہید کی ذہانت اور حافظہ پر دال ہے، لیکن غمیض اور عمیق نظریں خوب سمجھ سکتی ہیں کہ ایسے ایک پاک نفس کا پیدا ہونا خداوند تعالیٰ کا بہت بڑا بھید تھا۔ جس کی کنہہ کو کسی قدر وہی پاک نفوس پہنچ سکتے ہیں، جنہیں کلام ربانی سے دلچسپی ہے، اور جنہوں نے وہبی تعلیم روحانی ذریعہ سے پائی ہے، حقیقت میں یہ بہت تیغ ہے ؎

جس نے اس کا زخم کھایا ہے اُسے معلوم ہے   تیغ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہیئے

مولانا شہید جب فارغ التحصیل ہوئے تو لوگ آپ کے پاس تعلیم پانے کے لئے آنے لگے اور اسی چھوٹی سی عمر میں سب نے آپ کو اپنا مقتدا تسلیم کرلیا۔

تقریر نہایت شائستہ اور منجھی ہوئی تھی، اور آپ ہر مطلب کو اس عمدگی سے بیان فرماتے تھے کہ لوگ ہونٹ چاٹتے ہی رہ جاتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب کی تقریر اور بیان مشہور انام تھا اور یہ بات تمام لوگوں میں مشہور تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب نے وہ طرز بیان اختیار کی ہے ان کے وعظ سے ہر مذہب اور ملت کا شخص خوش ہو کے اٹھتا ہے۔ حقیقت میں یہ پالیسی عمدہ اور لائق ہے اور ہر شخص اس امر کی تعریف کرتا ہے، لیکن مولانا شہید کی تقریر میں جو صفت تھی وہ عجیب تر اور غریب سحر سے بھری ہوئی تھی، لوگ گھروں سے ارادہ کرکے جاتے تھے کہ مولانا شہید کی مخالفت عین وعظ میں کریں گے، لیکن وہاں سوائے خاموشی کے کسی کو یارا نہ ہوتا تھا، سامعین میں سکوت سلطنت کرتا تھا کیا مقدور تھا کہ وعظ کے بیچ میں کوئی کسی کی طرف اشارہ بھی کرلے۔ مولانا شہید کے زمانہ میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ بالکل غارت ہوگیا تھا، شرفاء اپنے بچوں کو مکتبوں میں بھیجنا عیب خیال کرتے تھے اور شہزادے تو گویا دشمن تعلیم ہی مشہور تھے، اس لئے تعلیم کا کوئی اسٹینڈرڈ

نہ تھا نہ کوئی ایسی ترتیب تھی جس کے موافق بچوں کو تعلیم دی جاتی۔

مگر مولانا شہید کے خاندان میں پہلے بچہ کو ریاضی پڑھایا کرتے تھے تاکہ اس کی طبیعت میں سلامت روی آجائے، گو یہ طریقہ شہر میں اور کسی خاندان میں جاری نہ تھا، لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان میں ابھی تک اس کی مضبوطی سے پابندی کی جاتی تھی۔

اس لحاظ سے ضرور ہوا کہ پہلے مولانا شہید بھی ریاضی پڑھیں، چنانچہ انہیں اول اقلیدس کے اصول موضوعہ و علوم متعارفہ پڑھائے گئے۔ اس وقت مولانا شہید کی عمر مشکل سے چھ یا ساڑھے چھ برس کی ہوگی۔ مولانا شہید کی معصوم فطرت نے بہت جلد اقلیدس کے یہ لازمی اصول نقش دل کرلئے اور انہیں کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ کھیل کود میں بھی اصول اقلیدس کو کھپانے لگے۔ مولانا شہیدؒ کی معصوم طبیعت کا اس لاجواب دلچسپی سے پورا امتحان ہوگیا اور شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کے چچا نے یہ سمجھ لیا کہ اسمٰعیل کی طبیعت میں معتدل سلامت روی ہے، اور اس کی ذات سے یہ مستبعد نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ضرور جوانی میں ہر علم کے حاصل کرنے میں زیادہ سرگرم ہوگا، اور اس کی لیاقت وصاحبیت فخر خاندان بیاں کی جائے گی۔

بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ مولانا شہید نے ایک مہینہ کے عرصہ میں اقلیدس کے چار مقالے ازبر کرلئے، طوطے کی طرح سے نہیں، بلکہ ان سے نئی نئی شکلیں بھی حل کرنے لگے۔ ایک تو شاہ عبدالعزیزؒ جیسا اُستاد اور دوسرے مولانا شہید جیسا ذہین، طبّاع، عالی دماغ بچہ پھر بھلا وہ سحر نما ترقی کیوں نہ کرے گا، اور لاکھ دو لاکھ طلبہ میں اپنے کو افضل کر کے کیوں نہ دکھائے گا۔

پانچواں مقالہ شروع کرانے سے پہلے ضرور تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب حساب پڑھائیں تاکہ پانچواں چھٹا مقالہ جس سے اربعہ متناسبہ بنا ہے بخوبی سمجھ میں آسکے۔ حساب کے پورے قواعد مولانا شہید نے پندرہ دن میں ضبط کرلئے، لیکن عملی ضبط کے لئے ابھی دو ڈھائی مہینے کی اور ضرورت تھی جو پیارے شہید نے نہایت سرگرمی سے اپنی معمولی محنت سے حاصل کیا، اسی طرح جبر مقابلہ علم مثلث، مساحت وغیرہ وغیرہ، غرض ریاضی کی جتنی شاخیں تھیں سب واجب الاحترام شہیدؒ نے طے کرلیں اور اب ریاضی میں لاجواب ہوگیا۔

ریاضی کے بڑے بڑے مسائل واجب التعظیم شہید چٹکیوں میں سلجھا دیتا تھا، اور لاکھوں روپیہ

کی رقموں کا جوڑ صرف دو چار منٹ کے تامل سے فوراً بتا دیتا تھا۔

علاوہ اور بدعت و شرک کی آفت ناک صورت کے ایک غضب عام مسلمانوں میں اور بھی ساری ہو رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ سوائے تفسیر و حدیث و فقہ کے دوسرا علم پڑھنا حرام ہے پڑھنے والا شخص مردود ہے مثلاً تفسیر مدارک والے کا یہ قول ہے ؎

علم دین فقہ است تفسیر و حدیث　　　ہر کہ خواند بیش ازیں گردد خبیث

جہلا میں اس خیال کا بڑا اثر تھا اور انہوں نے صدہا روایتیں اس قسم کی بنائی تھیں کہ دنیاوی علوم مثلاً تواریخ و جغرافیہ، ریاضی، طبقات الارض، ہیئت، کیمیا وغیرہ وغیرہ کفر ہے۔ چنانچہ یہی خیال اب تک علماء کے گروہ کا چلا آتا ہے، کل روایتوں میں مشہور روایت حضرت شاہ نظام الدین صاحبؒ اولیاء کی بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ صدہا برس سے پہلے اسلام کا رنگ ہندوستان میں کیا تھا جو اپنا آبائی بُت پرستی کا اثر لے کے آتے تھے، اور اُنہوں نے اسلامی عقلی اور نقلی علوم میں مطلق ترقی نہ کی تھی بلکہ اپنی تیغ زنی کی دُھن میں وہ رہا سہا جو کچھ دین کے علوم اپنے ساتھ لائے تھے کھو بیٹھے۔ شاہ نظام الدین صاحب اولیاء جیسا کہ ان کے جید مقلدوں میں مشہور ہے، ایک دن اپنے ایک مرید کے مکان پر تشریف لے گئے، اس نے اپنے روحانی باپ کی اسی تعظیم اور تکریم سے خاطر کی جتنی کہ ایک حد سے زیادہ خوش اعتقاد مرشد کو سزاوار ہونی چاہیئے، کھانا کھانے کے بعد اولیاء صاحبؒ نے اپنے مرید کی تمام چیزیں دیکھنی شروع کیں، اور بھی کئی مرید آپ کے ہمراہ تھے، بڑی دیر کے بعد کتب خانہ دیکھنے کی باری آئی، کتابیں دیکھتے دیکھتے کہیں ایک کتاب جس کی سنہری جلد بندھی ہوئی تھی اولیاء صاحبؒ کے ہاتھ میں آگئی، جوں ہی اس کتاب کا نام ورق اُلٹ کے پڑھا تو آپ لال ہو گئے، طیش اور غیظ کے شعلے آنکھوں سے بھڑکنے لگے، غصہ سے ہاتھ پیروں میں رعشہ پڑگیا، اور منہ میں کف بھر آئے۔ یہ غیر معمولی حالت دیکھ کے مریدوں کے ہوش اڑ گئے، اور ہر مرید اپنے دل میں سخت شرمندہ اور مخوف ہوا کہ کہیں مجھ سے تو کوئی خطا سرزد نہیں ہوگئی جو پیر صاحب ایسے ناراض اور آزردہ خاطر ہو گئے، یہ فانی اور قاتل خوف چند سیکنڈ مریدوں میں دَورہ کرتا رہا، بعد ازاں اولیاء صاحبؒ اپنے میزبان مرید کی طرف طوفانی اور غضب خیز لہجہ میں یہ بولے، مجھے سخت رنج اور غصہ آیا کہ

تو اپنے کتب خانہ میں تفسیر کشاف[1] رکھتا ہے۔ یہ کہہ کے اولیا صاحب خاموش ہو رہے اور کہا کہ ابھی اس کتاب کو ضائع کردو حکم کی دیر تھی وہ کتاب مع اور معقولی کتابوں کے ضائع کردی گئی اور پھر مریدوں نے توبہ کرلی کہ آئندہ کبھی اس نوعیت کی کتابوں کی طرف توجہ مبذول نہ کریں گے نہ کبھی انہیں ہاتھ لگائیں گے۔

یہ خیالات تھے جنہوں نے مضبوطی سے مسلمانوں کے دلوں میں جڑ پکڑلی تھی اور جس کا اثر مگر قوی اثر اب تک جب پیارے شہید نے تعلیم پانی شروع کی باقی تھا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان میں علوم نقلیہ کے ساتھ علوم عقلیہ کا بھی رواج تھا، اور ملانوں کو بھی کچھ مساوات ہوگئی تھی، وہ بھی اتنی غرغش نہ کرتے تھے گو انہیں ایسے علوم کی (اس لئے کہ انہیں نہ آتے تھے) تعلیم بُری لگتی تھی اور حتی الوسع وہ اپنے وعظوں میں لوگوں کو روکتے تھے کہ سوائے تفسیر و حدیث و فقہ مسلمان کو دوسری چیز پڑھنا حرام ہے۔

ان بیہودہ خیالات پر جس میں شہر دہلی کا ایک بہت بڑا حصہ پھنسا ہوا تھا، پیارا شہید چھوٹی سی عمر میں لائق ریاضی دان بن گیا۔ اس کے بعد اُس نے منطق وغیرہ کی کتابیں پڑھیں، تواریخ اور جغرافیہ کا بھی اس والاشان خاندان میں رواج تھا، کیونکہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک قصیدہ میں سوڈان کا حال بیان کیا ہے، اور اس ملک کی مشرح کیفیت ادا کردی ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب اعلیٰ درجہ کے جغرافیہ دان تھے، اور یہ ہمیں تحقیق ہوا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب علم جغرافیہ اور تاریخ سے کامل ماہر تھے۔ جس کی شہادت اُن کی تصانیف دے رہی ہیں۔

مولانا شہید کی پرشوق نظریں علم دین پر زیادہ پڑ رہی تھیں، اور آپ کو دنیوی علوم سے اتنی دلچسپی نہ تھی، گو آپ ان کی تحصیل اشد ضروری اور انسان کے لئے لابد خیال فرماتے تھے۔

---

[1] تفسیر کشاف جاراللہ زمخشری کی تصنیف سے ہے جو ایک معتزلی تھا۔ اس کی لاجواب کون تفسیر کا مطلب جو کٹ ملانے نہیں سمجھ سکتے، اس لئے اس کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اتنے بڑے مصنف کی قدر مطلق نہیں کی جاتی اور اس کو معتزلی سمجھ نے غلطی کی اختیار کی ہے۔ معتزلی ہونا منافی علم ولیاقت نہیں ہے۔ جاراللہ زمخشری ایک فاضل اجل عالم تھا ایسا عالم کہ جس پر اسلام ہمیشہ فخر کرے گا۔

دینے والی نہ تھی، پھر بھی یہ ضرور تھا کہ آئندہ اہم معاملات کو سلجھانا اور نئے نئے جھگڑوں میں سے موشگافیاں کرنا قسمت ہو چکی تھیں، اس لئے لازمی تھا کہ آپ کتب معقول کی تعلیم پاکے ان پر عبور حاصل کرتے۔

القصہ مولانا شہید نے اس زمانہ بے ترتیب میں اس عمدگی اور قاعدہ سے تعلیم پائی، اور اسے پائی کر لیا جو آئندہ آپ کے اور آپ کی جماعت کے کام آیا اور جس مبارک تعلیم نے اب تک اپنا شیریں اور مقدس اثر لاکھوں بندگان خدا پر ڈال رکھا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ مولانا شہیدؒ نے کبھی کسی علم کے سیکھنے میں اور طلباء کی طرح سے محنت نہ کی۔ بلکہ جو کچھ استاد کے آگے پڑھا اُسے پھر اُلٹ کے گھر میں نہیں دیکھا۔ اس ذہن اور چونچال تیز طبیعت پر بڑے اعتبار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے، ایسے طباع طلبہ کئی صدی کے بعد پیدا ہوتے ہیں، جن کو معمولی تعلیم آسمان فضل پر پہنچا دیتی ہے۔ ارسطو جیسا فاضل حکیم جب پڑھنے بیٹھتا تھا تو ایک لوہے کا گولہ ہاتھ میں رکھ لیتا تھا اور طلب کے نیچے جست کا طاش رکھ لیتا تھا کہ جہاں نیند آئی اور وہ گولا ہاتھ سے چھوٹ کے طاش میں گر پڑتا۔ اُس کی آواز سے فوراً ارسطو بیدار ہو جاتا تھا اور پھر اپنا سبق یاد کرنے لگتا تھا۔ بعض شب اسے پوری محنت کرتے ہوئے گزر جاتی تھی، اور مہینوں ہوش نہ رہتا تھا کہ رات اور دن کہاں گزرتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا شہید کی بے پروائی یاد کرنے کی ایسی حیرت انگیز ہے کہ جس نے قوانین فطرت کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ یکایک ان باتوں کو باور نہیں کر سکتا۔ مگر جو کھوپڑیوں کے علم اور بناوٹ سے آگاہی رکھتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ روز ازل ہی میں خاص خاص صفتیں خاص خاص نفوس میں ودیعت کی گئی ہیں۔ کروڑوں مر گئے اور روزمرہ مرے چلے جاتے ہیں، لیکن ہر قوم میں جو ممتاز لوگ ہو گئے، اُن کا ثانی کئی صدی میں بھی مشکل سے دیکھنے میں آیا، مثلاً اسلام میں چار امام اور بڑے بڑے مفسر گزر گئے، مگر فطرت نے ان کے گزرنے کے بعد کسی کو یہ شان علمی نہیں بخشی، نہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سا کوئی پیدا ہوا، نہ امام شافعی اور امام مالک اور حنبل کا ثانی دیکھنے میں آیا، نہ حضرت امام بخاریؒ جامع اور احادیث نبویہ جیسا حامی دین متین پھر زمانہ کو دوسرا پیدا کرنا نصیب ہوا اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ نہیں یہ قانون فطرت کے خلاف ہے کہ ایک کے مرنے کے بعد دوسرا ویسا پیدا ہی ہو تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی سی مقبولیت نصیب نہ ہوئی یہ کچھ ضرور نہیں

کہ قوم اسلام ہی میں یہ بات ہو، نہیں، بلکہ یورپ میں جوں جوں بدن ترقی کرتا جاتا ہے یہی کیفیت ہے پہلے شیکسپیئر کو لو جو ڈراما کی نظم کا بجائے خود ایک موجد ہے۔ جوں جوں صدیاں گزرتی گئیں اس کی ڈرامیٹک نظم کو مقبولیت ہوتی گئی، اور آخر ایسے زمانہ میں جب ترقی کا تخت ہے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس قسم کی نظم کوئی نہیں لکھ سکتا۔ نہ ملٹن کی سی لاس آف پیراڈائز کسی کو اب تک لکھنی نصیب ہوئی، اہل ہنود میں آج تک کالی داس جیسا شاعر اور بیاس جیسا جامع وید کوئی پیدا ہوا نہ آئندہ پیدا ہونے کی امید ہے۔

گو ہر صدی میں ہر قوم میں بڑے بڑے طباع اور ذہین پیدا ہوئے ہیں مگر مقبولیت ایک دوسری چیز ہے جسے معمولی جانے وہی مقبول انام بنتا ہے۔ حالانکہ یہ ہم مانتے ہیں۔

نکوئی گر رود زین بحر نیکوتر شود پیدا　　چو گیرد قطرہ راہ عدم گوہر شود پیدا

سچ ہے خدا تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں فرمایا ہے "ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے" خدا جانے کہ وہ نعمت تھی جو مولانا شہید کو عطا ہوئی تھی۔ اور اس بخشش کے لائق بھی ویسی ہی برتر ذات مولانا شہید کی تھی۔

جہاں تک مجھے تحقیق ہوا میں نے مولانا شہید کی تعلیم کی نسبت لکھ دیا۔ اس کے بعد میں صرف یہ لکھ کے اس بات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کچھ مولانا شہید نے حاصل کیا وہ چودہ یا پندرہ برس کی عمر تک اور بعد ازاں آپ فارغ التحصیل ہو گئے۔ کچھ مولانا شہید ہی پر چودہ پندرہ برس کی عمر تک فارغ التحصیل ہونا موقوف نہ تھا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب اور آپ کے والد ماجد بھی پندرہ ہی برس کی عمر میں تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ محمد اسحٰق صاحب غرض اس واجب الاحترام خاندان کے کل ممبر پندرہ پندرہ چودہ چودہ ہی برس کی عمر میں پڑھ پڑھا کے فارغ ہو ہو گئے تھے۔ اس خاندان پر کیا منحصر ہے، جتنے اسلام کے ارکان گزر گئے، انہوں نے اتنی ہی عمر میں تحصیل سے فراغت پائی تھی۔

صرف ان ہی الفاظ پر ختم باب کرتا ہوں کہ ہر علم کی جتنی کتابیں درس میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے ہاں پڑھی جاتی تھیں وہ سب مولانا شہید کو ازبر ہو گئی تھیں، اور یہ آپ کی فرصت اور خوشی پر موقوف تھا کہ آپ اور غیر معمولی کتابیں مطالعہ کرتے ہیں۔

دُوسرا باب

مولانا شہیدؒ کی ورزشیں

ہندی اسلامی سلطنت کی ملکی اور مذہبی قوت کے ضعف نے سپاہیانہ فنون کو بھی مسلمانوں میں کمزور کر دیا تھا، روزمرہ کی خونخوار جنگلوں سے امن مل گئی تھی، اور اب اسلامی تلوار مضبوطی سے میان میں دے دی گئی تھی، اور پھر یہ عہد و پیمان تلوار اور میان میں ہو گیا تھا کہ باہم کبھی مفارقت نہ ہو گی۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں جب ہمارے قاطع بدعت کا ظہور ہوا، مسلمانوں کے اولوالعزم ارادے مع ان کے اسلامی جوش و خروش کے خیرباد ہو گئے تھے، اور ان میں صرف عیش پرستی اور سُستی رہ گئی تھی، گھوڑے پر چڑھنا، نیزہ بازی کرنا اور تلوار سے نیمو کا کاٹنا، مینیں اُکھیڑنا، گولی چلانا، شیروں کے شکار کھیلنا، غرض اسی قسم کے سپاہیانہ کھیل جو سابق کے مسلمانوں کا روزمرہ یا زیور تھے، کبھی کے رفوچکر ہو گئے تھے، اور ان کی جگہ تکیوں میں بھنگ گھوٹنے کے ڈنڈوں سے شب و روز سروکار تھا، بایں ہمہ پھر بھی مغلیہ سلطنت کا اثر کچھ نہ کچھ مسلمانوں کی طبائع میں باقی تھا، اور اُن کے جوش کی ٹھنڈی راکھ میں کبھی نہ کبھی پہلی چنگاری اپنی چمک دے جاتی تھی۔

دہلی میں ہر محلہ میں ایک نہ ایک اکھاڑا موجود تھا، جہاں علاوہ معمولی لڑنت کے پٹے بازی بنوٹ وغیرہ کی بھی مشق ہوتی تھی۔ مگر یہ نظارہ سخت تعجب خیز ہو گا کہ مسلمان شرفا ان ورزشوں سے نفرت کرتے جاتے تھے، اور ان کی طبائع ان ورزشوں سے جو انسانی زندگی کے لئے درحقیقت قیمتی ہیں ہٹتی جاتی تھیں، اور یہ تمام سپاہیانہ فنون زیادہ تر نیچ قوم میں محدود ہوتے جاتے تھے۔ اس کی وجہ امراء اور شہزادوں کی آرام طلبی تھی، ورنہ اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا، مولانا شہیدؒ جب اپنی کتابی تحصیل سے فارغ ہوتے، اور اب آپ کو پبلک لائف کے میدان میں پہلے قدم رکھنے کا موقع ہوا تو اپنے

کے لئے پہلے ضرورت سپاہیانہ فنون میں تکمیل
ارادوں کی تکمیل اور اپنے ربانی فرائض کی انجام دہی
پیدا کرنے کی لاحق ہوئی، مولانا شہید کی معاشرت گو مولویانہ طرز کی تھی، پھر بھی آپ کی تیز تیز نظریں
اس بے نظیر جرأت اور بے مثال دلیری کی طرف بلند ہو رہی تھیں، جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کو
خاص ودیعت ہوئی تھی، اور جس سے مسلمان ہمیشہ نام آور اور نیک نام ہوتے چلے آئے ہیں۔
آپ کی پیدائش گو مولویانہ گروہ میں ہوئی تھی، لیکن آپ میں خالد جیسے بے دھڑک شجاع کی روح اور
موسیٰ فاتح اندلس جیسے بے خطر دلیر کی طبیعت اور طارقؔ جیسے عظیم الشان جنرل کا اولوالعزم ارادہ
کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ایسی نڈر طبیعت بے دھڑک دلیری اور بے خوف شجاعت نے فطرتی طور پر مولانا شہیدؒ کو
ابھارا کہ وہ مولویت کے امن پسند اور سیدھے سادھے دائرہ سے اپنے آپ کو نکالیں اور دنیا کے
بڑے جنرلوں اور لڑاکوں میں شریک ہوں۔

مولانا کسی امیر اور شہزادہ کی صحبت زیادہ پسند نہ کرتے تھے گو اپنے خیال میں امراء اور
شہزادے اپنی زندگی پرشان اور نوق البھڑک سمجھتے تھے، لیکن مولانا ایسی حالت کو سخت حقارت
کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح عمری پڑھی تھی، اور حضرت عمر
رضی اللہ عنہ کا یہ قول یاد تھا کہ میں کسریٰ اور قیصر کی سلطنت ایک ادنیٰ مسلمان کے خون کی بوند سے
کم قیمت سمجھتا ہوں، اپنے لاثانی اور فاتحان ممالک پیشواؤں کے حالات نے مولانا شہیدؒ کو اُن
کے ارادوں میں اور بھی زیادہ مضبوط اور دشوار گزار راہ میں جس کو وہ طے کرنا چاہتے تھے زیادہ
استوار بنا دیا۔

پہلے مولانا شہیدؒ نے گھوڑے کی سواری میاں[۱] رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی۔ اور گھوڑے کی
سواری میں اتنی مشق بڑھائی کہ چاہے جیسا چلبلا اور منہ زور گھوڑا ہو پھر بھی بے زین و رکاب اُس پر سوار

---

[۱] رحیم بخش ایک سن رسیدہ شخص تھا۔ لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں دہلی فتح کی ہے تو اس کا باپ الٰہی بخش لارڈ موصوف کے
گارڈ میں تھا۔ رحیم بخش پہلے بدعتی تھا اور گور پرست تھا، لیکن بعد ازاں مولانا شہیدؒ کے طفیل سے سچا محمدی ہو کر
مولانا صاحب موصوف کے ساتھ پشاور کے گرد و نواح میں ایک خونخوار میدان سکھوں سے لڑ کر شہید ہوا۔ اس کی عمر ستر
کے پیٹے میں تھی، لیکن نوجوانوں کی سی اولوالعزم طبیعت رکھتا تھا۔

مولانا نے جھینوں اکھاڑے میں جو اپنے ہی مکان کے پاس متصل چتلی قبر اور حویلی اعظم خان بنایا تھا ڈنٹ کی ہے۔ ایک دن آپ ڈنٹ کر رہے تھے کہ دو شہزادے جو مرزا رحمۃ اللہ بیگ کے شاگرد تھے آئے۔ گو انہیں شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کا بڑا ادب تھا، پھر بھی مولانا کی صورت دیکھ کے وہ مسکرائے، ان کا مسکرانا حقارت انگیز تھا اور وہ یہ سمجھ کے ہنسے تھے کہ مولویوں کو ان سپاہیانہ فنون سے کیا علاقہ۔

مولانا نے ان کی حقارت انگیز ہنسی کو تاڑ لیا اور جب آپ ڈنٹ کر چلے تو شہزادوں کی طرف مخاطب ہو کر یہ فرمایا میں ان کی اولاد میں سے ہوں، جنہوں نے ایسی ہی حالت سے دنیا بھر میں اسلام کی اشاعت کی، اور اسلامی سلطنتیں قائم کر دیں اور آپ ان کی اولاد میں سے ہیں، جنہوں نے اپنی آرام طلب فطرت کے صدقہ میں اسلامی سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہزادے نہ تھے پانچ لاکھ عرب جو آپ کی ماتحتی میں کسریٰ و قیصر کی سلطنت میں کام کر رہے تھے، لال قلعہ کے رہنے والے اور شہزادے نہ تھے جو کچھ انہوں نے کام کیا وہ بھی زمانہ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے اور جو کچھ آپ کے بزرگوں کی آرام طلب روح نے کیا وہ بھی زمانہ نہیں بھولا ہے۔ صاحب عالم کوئی ہنر اور علم کسی کا خاص حصہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اُسی کو اپنی ودیعت سونپتا ہے جو اس کے قابل ہوتا ہے۔

مولانا صاحب کی یہ دھیمی اور سنجیدہ وزنی تقریر دونوں شہزادوں کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اپنی بیہودہ ہنسی سے نہایت ہی پشیمان ہوئے اور انہوں نے مولانا صاحب سے معافی مانگی۔ اس پر بھی مولانا صاحب نے ان سے دو دو ہاتھ کرنے چاہے بڑے انکار کے بعد وہ راضی ہوئے۔ اُن شہزادوں کی مشقیں بہ نسبت مولانا کے زیادہ پرانی تھیں، لیکن دو تین ہی ہاتھوں میں انہیں معلوم ہو گیا کہ جس ملازادہ پر ہم ہنستے تھے وہ سپاہیانہ فنون میں ہم سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ مولانا کی ذہین طبیعت جیسی علم کی طرف رہنما تھی، ایسے ہی فنون کی طرف بھی مددگارانہ رہبری کرتی تھی۔ گولی لگانے میں مولانا نے اتنی مشق بڑھائی تھی کہ درخت پر سے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو گولی سے گرا دیا کرتے تھے۔

ایک دن شکار میں مولانا نے فخراً بیان کیا کہ یہ ناممکن ہے، جانور میرے سامنے آئے اور پھر زندہ نکل جائے، ایک ساتھی نے ہنس کے کہا اگر اس کی موت ہی نہ ہو تو آپ کیونکر اُسے مار سکتے ہیں

مولانا نے جواب دیا جب اس کی موت نہ ہوگی تو میرے سامنے آنے ہی کا نہیں، یہ برجستہ جوابی اکثر موقع پر سامعین کو حیرت و استعجاب میں ڈالتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ (جب پانچ برس کی عمر تھی) اپنے ملازم کی گود میں جا رہے تھے کبھی اس کی انگلی پکڑ کے چلتے اور کبھی وہ گود میں لے لیتا۔ غالباً باغ تھا یا کوئی سبزہ زار تھا کہ ایک شخص پانچ چھ کتے لیئے ہوئے نکلا یہ کتے والا شخص مسلمان تھا، اور اکثر کتوں کا شائق تھا۔ اس نے قریب آ کے مولانا کے ملازم سے دریافت کیا کہ یہ کس کے صاحبزادے ہیں، دریافت کرنے کے بعد وہ باتیں کرنے لگا، پھر مولانا نے اس سے اپنی بھولی بھالی بولی میں کہا تم نے کتے کیوں پال رکھے ہیں، مسلمان کتے نہیں پالتے۔ اس نے کہا میاں کچھ بُرا ہے، مولانا نے کہا رحمت کے فرشتے نہیں آتے جہاں کتے پلے ہوئے ہوں۔ اُس نے مسکرا کے جواب دیا میں نے اسی لئے کتے پالے ہیں کہ فرشتے نہ آویں کیونکہ جب فرشتوں کی آمد و رفت بند ہو جائے گی تو پھر مجھے اپنی موت کا خوف نہ رہے گا، مولانا نے جواب دیا کہ جو فرشتے تیرے کتوں کی روح قبض کرنے آئیں گے وہی تیری بھی قبض کریں گے، غرض تو فرشتوں کی دستبرد سے نہیں بچ سکتا، یہ سن کر وہ از حد خوش ہوا، اور مولانا کی خدا داد ذکاوت کی تعریف کی۔

جب مولانا کل ضروری سپاہیانہ فنون کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ نے تیرنا سیکھا ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ تین تین دن تک دریا میں پڑے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں طلبہ کو سبق بھی برابر دیا جاتا تھا، وقت معینہ پر جب طلبہ جمع ہو جاتے تھے تو کنارہ پر آ کے سبق پڑھا دیا کرتے تھے، بعض روایتوں کے بموجب تین برس اور بعض اقوال کے بموجب چار برس کامل مولانا پانی میں رہے ہیں۔

اس کثرت سے پانی میں رہنے نے آپ کو جل مانس کا لقب دلوا دیا تھا ہمارا مؤرخ ہمیں رپورٹ کرتا ہے کہ مولانا دریائے جمن کی راہ سے دہلی سے آگرہ اور آگرہ سے دہلی کئی کئی بار آئے اور خدا نے ہمیشہ آبی خوفناک جانوروں سے پناہ دی۔

آپ کو ہرگز عادت نہ تھی کہ آپ اپنا کمال کسی کو دکھائیں اور واہ واہ کے محتاج ہوں یا کسی کی داد کی خواہش ہو بلکہ جن غرضوں سے یہ فنون حاصل کیئے جاتے تھے وہ اچھی دل بن

قوتوں کا جو خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی ہیں فطرتی قوتوں سے مقابلہ کر کے اندازہ کرتا ہوں آیا
انسان بحیثیت اپنی اشرفیت کے سب پہ غالب آسکتا ہے، تو میں نے اس کا تجربہ کر لیا کہ ہاں انسان
اگر چاہے تو اسے خاک باد آب آتش مضرت نہیں پہنچا سکتی۔ مولانا کا یہ جواب ایسا حکیمانہ تھا
جس سے فطرۃ اللہ کا اصلی منشا ظاہر ہوتا تھا اور یہ کھلتا تھا کہ آپ نے انسانی قوتوں کے اندازہ
کرنے کا کیا سہل اور آسان رستہ نکالا تھا۔

جب اس میں بھی آپ کو پورا ملکہ ہو گیا تو اب آپ نے بھوکا پیاسا رہنا شروع کیا۔ لیکن
اس بھوکے پیاسے رہنے میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں کچھ فرق نہ آتا تھا اور کسی طرح آپ
سست نہ ہوتے، شدہ شدہ اتنی مشق بڑھائی کہ اگر تین چار روز تک کھانے کو نہ ملے تو آپ
بے تاب و تواں ہو کے بیکار نہ ہو جائیں۔ یہ معتبر ذریعہ سے سنا گیا ہے کہ آپ تین دن کامل گرمیوں
کے دنوں میں بے پانی رہ سکتے تھے، اور کسی قسم کی افسردگی واقع نہ ہوتی تھی، گو لب خشک ہو
جاتے تھے اور حلق سوکھ جاتا تھا مگر اس پر بھی اپنی معمولی کڑاکے کی آواز میں وعظ کہنے سے نہ
رکتے تھے، اور اسی طرح محنت کرتے تھے۔

کڑکتے جاڑوں میں آپ نے اپنے کو برہنہ رہنے کا اکثر عادی بنایا تھا۔ لوگ جاڑے
لحافوں میں گھسے پڑے رہتے، اور آپ اکہرے کپڑوں سے اپنے مکان کی چھت پر ٹہلتے
رہتے تھے، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بغیر مدتوں کی مشق کے آپ میں جاڑے میں برہنہ پھرنے کی قدرت
ہو گئی تھی نہیں ہر مشق بتدریج بڑھائی تھی، اور یہ ثابت کر کے دکھا دیا تھا کہ انسان فطرت کی ہر قوت
پر غالب آسکتا ہے۔

کم سونے میں بھی مولانا نے کمال حاصل کیا تھا، اور ہمارے سوانح کا ناظر تعجب سے سنے گا
مولانا آٹھ آٹھ دس دس دن کا [illegible] سوتے تھے، اور آپ نے آخر [illegible] اتنی قوت بڑھائی تھی کہ جب
چاہے سو رہیں اور جب چاہیں جاگ اٹھیں اور ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں ایک
منٹ کا بھی فرق نہ ہوتا تھا، مثلاً ابھی پورے دس بجے ہیں اور سوئی پورے دس پر پہنچ گئی اور مولانا
سونا چاہتے ہیں تو نصف منٹ آپ کو نیند کے رستہ دیکھنے میں نہ لگے گا یا آپ شب کے دو
بجے جاگنا چاہتے ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ دو پر نصف منٹ زیادہ گزر جائے یا دو میں نصف منٹ کم

رہے جب آنکھ کھل جائے، جب مشق پوری بڑھ گئی تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اپنے ارادہ میں مولانا فیل ہوئے ہوں۔

جب یہ تمام قوتیں کم وبیش مولانا کے قبضہ میں آگئیں تو آپ نے زیادہ دیر وعظ کہنے کی عادت بڑھائی اور ہمیں معلوم ہوا ہے (بشرطیکہ وہ صحیح ہو) کہ بعض اوقات مولانا کو سید احمد صاحب کی ہمراہی میں ایک ہی دن میں تین تین چار چار بار وعظ کہنے کا دو دو تین تین گھنٹے اتفاق ہوتا تھا لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ کی آواز بیٹھ گئی ہو اور حلق سے آواز نہ نکلتی ہو یا وعظ کہنے میں پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہو۔

غرض تمام ضروری ورزشیں جو آئندہ ارادوں میں جان ڈالنے والی تھیں، مولانا نے چند سال میں ان میں کمال پیدا کرلیا، اور اب آپ چاق چوبند ہو گئے، اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں پہلا قدم رکھنے کا قصد ظاہر فرمایا۔

مولانا خوب جانتے تھے کہ روحانی قوت کا اُبھار اور اس کی پائیداری جسمانی قوت باقی رہنے سے متصور ہے، اسی سے کل مذہبوں میں اسلام کو فخر ہے کہ اس نے جسمانی قوت کے ساتھ روحانی قوت کے بڑھانے کی ہدایت کی ہے، اور دین کے ساتھ دنیا کا پاس، لحاظ رکھنے کے لئے بھی فرمایا ہے۔

تیسرا باب

مولانا شہیدؒ کا پہلا وعظ اور عوام النّاس کی شورش

رمضان المبارک گزر چکا ہے، اور الوداع کا دن ہے۔ ہزاروں مسلمان ہر طبقہ اور گروہ کے الوداع کی نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں جمع ہیں، بڑے بڑے واعظ اور مولوی بھی اپنے معتقدوں اور مقتدیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں، حوض پر فوارے چھوٹ رہے ہیں، اور سودے والے بھی خوانچے لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ غرض عجیب لطف آرہا ہے، ساتھ ہی اس غل و شور اور کشمکش کے یہ بھی چرچا ہو رہا ہے کہ مولانا اسمٰعیل صاحب وعظ فرمائیں گے، عوام الناس کو چنداں اس کا خیال نہیں ہے، لیکن لکھے پڑھوں کے گروہ میں ایک تحریک سی پھیل رہی ہے اور ہر شخص یہ کہتا ہے دیکھئے مولانا صاحب کیا فرمائیں گے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب بھی خاموشی سے اس افواہ کو سن رہے ہیں، لیکن کچھ نہیں کہتے۔ طلبہ کا جمگھٹا اور ان کی بحثم بحثا عجیب دلچسپی دکھا رہی ہے۔ ہر طالب علم اپنے خیال میں افلاطونؔ و ارسطو کا قبلہ گاہ بن رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مولوی اسمٰعیل کو ایک بات میں بند کر دوں گا۔ مولانا شہیدؒ نے گو پہلے یوں کھلم کھلا وعظ نہ فرمایا تھا۔ لیکن ان کے خیالات کی کچھ سن گن لوگوں کے کانوں میں پہنچ گئی تھی اور پہلے اس کے کہ وہ اپنے خیالات پبلک میں ظاہر کریں، عام مسلمان خصوصاً مولانا فضل حق صاحب اپنی منطق اور فلسفہ کے نشہ میں سرشار بے پروایانہ وضع میں بیٹھے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف کو مولوی اسمٰعیل صاحبؒ جیسے عالم کی کچھ پروا نہیں ہے۔

ایک طرف کا تو یہ رنگ ہے اور دوسری جانب صوفیوں کا گروہ جلوہ افزا ہے، ان میں بھی مولانا شہید کے وعظ کا چرچا ہو رہا ہے۔ ہر صوفی سو پچاس مرید رنگین کپڑے پہنے اپنے ساتھ

رکھتا ہے جو اس کے ساتھ اس ادب سے چلتے ہیں جس کی نظیر پہلے اسلامیوں میں بہت کم نظر آتی ہے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب عاجزانہ صورت بنائے پہلی صف میں خاموش بیٹھے ہیں، نہ انہیں کسی کی کاناپھوسی کی پروا ہے اور نہ کسی کی گپ شپ کا خیال ہے، اور اسی میں آپ مستغرق ہیں نہ کوئی مرید ساتھ ہے نہ مقتدی پیچھے بیٹھا ہوا ہے، نہ معتقد ہمراہی میں ہے تنہا ہیں، لیکن اپنے ساتھ تہار سلطان کو جس کو یہاں سجدہ کرنے آئے ہیں دل کی پوری عاملانہ قوت سے سمجھتے ہیں یہی آپ کا مایۂ فخر ہے اور یہی آپ کا ایمان اور دین ہے۔

ادہر نماز ہو چکی اور ادہر مولانا شہید دلیرانہ بیچ کے در میں آکھڑے ہوئے۔ آپ کو دیکھتے ہی غول کے غول آآکے جمع ہونے لگے، اور ہر طبقہ اور درجہ کے آدمی جن میں طلبہ علماء رئیس غیرہ سب تھے آکے جمع ہوگئے اور ہر شخص ہمہ تن گوش ہوکے مولانا شہید کا پہلا وعظ سننے کا شائق بن گیا۔

جب کثرت سے لوگ جمع ہوئے اور مولانا شہیدؒ نے اس کثرت سے مسلمانوں کو جمع اور اپنے وعظ کا شائق پایا تو پہلے کڑاکے کی آواز میں یہ پڑھا:۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ	سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ہے وہ اکیلا ہے کوئی
لَہٗ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ وَھُوَ	اس کا شریک نہیں ہے اسی کو سلطنت ہے اور
عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ	اسی کو تعریف اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مولانا شہید نے اس خوش لہجگی اور کڑاکے کی آواز میں کہا کہ سامعین کے دل پر ایک چوٹ لگی اور سب کے دل کانپ گئے اور کثرت سے مسلمان بے اختیاری کی حالت میں اس شدت سے روئے کہ بعض آوازیں رونے کی خاموشی میں بلند ہوگئیں، اور خاموشی کی پُرامن سلطنت میں رخنہ پڑ گیا، اس کے بعد دوبارہ اسی کڑاکے کی آواز میں ہی پڑھا، پھر اسی طرح سامعین کے کلیجے ہل گئے، اور اب ہر شخص اور بھی زیادہ وعظ سننے کا شائق دکھائی دینے لگا، پھر مولانا صاحب نے یہ فرمایا:

لہ ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب کا وعظ بلفظہٖ نقل نہیں کرسکتے اس لئے کہ جو کاغذات منشی ... کے زبانی ...

مسلمانوں تم جانتے ہو دنیا میں اول جس نبی نے وحدت پرستی کا پُرزور اعلان دیا وہ ہمارا آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا ہے، گو کل نبی خاص وحدت پرستی پھیلانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ ہمارے فخر انبیاء فخر موجودات ہی کو یہ شرف ملا ہے کہ آپ کا ایسی حالت میں کہ جدھر نظر جاتی تھی سوائے بُت پرستی کے رواج اور بُت پرستوں کے زور شور کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، اور ہر شخص انتہا درجہ بت پرستی میں غلو رکھتا تھا، اور ہزاروں کوس خدا پرست کا پتہ بھی نہ تھا۔ مخالفانہ نظریں وہ بھی شدت اور غضب کے ساتھ نبی پر پڑ رہی تھیں اور ایک متنفس بھی خدا پرستی کی تصدیق کرنے والا نہ تھا، اس نفرت انگیز دائرۂ بت پرستی میں دلیرانہ یہ فرمانا کہ خدا ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں، تمام دیوی اور دیوتا محض نکمّے اور بیکار ہیں نہ صرف مسلمانوں ہی کا بلکہ تمام عالم کا حد سے زیادہ مایۂ افتخار ہے، کلام اللہ کو اول سے آخر تک دیکھ جاؤ جس قدر توحید پرستی پر زور دیا ہے وہ اور کسی الہامی کتاب میں کم ملے گا۔ قرآن مجید میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اس قدر کھلا ہُوا اور روشن ہے کہ ہر مسلمان بشرطیکہ اسلام اور ہادیٔ اسلام سے اُسے محبت ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے، تمام خدا پرستی کے منازل اور راہیں اسی قدر صاف ہیں جتنی ممکن ہو سکتی ہیں نادان سے نادان شخص بھی اس سے اسی قدر مستفیض ہو سکتا ہے جتنا ایک عاقل شخص جس مطلب کو صاف طور پر خدا تعالےٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲) ہاتھ کے لکھے ہوئے ہمیں ملے ہیں۔ وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہوئے ہیں کہ ہم بلفظہ نقل کرنے کا فخر نہ حاصل کر سکے ہاں یہ خوشی کی بات ہے ہم نے مولانا شہید کے خیالات کا اس پریشان تحریر سے اقتباس کر لیا اور اسے اپنی طرز پر ادا کر دیا لیکن ناظر کے اطمینان کے لئے یہ لکھ دینا کافی ہے کہ ہم نے بالکل اپنی عبارت میں مولانا شہیدؒ کے بکھرے ہوئے خیالات ادا کرنے ہیں اور جگہ بجگہ وہ آیتیں اور حدیثیں نقل کر دی ہیں جو وعظ کے پریشان کاغذ میں ہم نے لکھی دیکھیں۔ بایں ہمہ ہم افتخار سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو عبارت ہمیں صحیح وسالم ملی وہ ہم نے بجنسہٖ درج کر دی۔

اس عبارت میں ہم نے احتیاطاً دستبرد نہیں کی گو ہمیں اس میں دست اندازی کرنے کا حق حاصل ہے اس لئے کہ وہ مولانا شہید کی قلم کی لکھی ہوئی نہیں ہے پھر بھی ہم نے اس خیال سے کہ اس عبارت میں بہت سے الفاظ اور فقرے مولانا شہید کے ہوں گے بلفظہٖ درج کر دی ہے گو بعض مقام سے عبارت کی سخت بے ربطی نے ہماری اس خواہش کو بھی پورا نہ ہونے دیا، بہرحال مولانا شہیدؒ کا پورا اسلامی جوش اس عبارت سے اندازہ کرے گا۔ جن احادیث کو مولانا نے اپنے وعظ میں فرمایا ہے، میں نے تلاش کر کے کہ اس کا راوی کون ہے حاشیہ پر ہر حدیث کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ ..

نے اپنے کلام پاک میں فرمادیا ہے اور اس سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا، چنانچہ وہ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۔

اور بیشک ہم نے تیری طرف کھلی باتیں اتاریں، اور منکر اُن سے وہی ہوتے ہیں جو لوگ بے حکم ہیں۔

یہ بدیہی طور پر ثابت ہوگیا کہ خالق ارض وسما نے ایسی کھلی باتیں اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے اُتاریں کہ ہر فرد بشر اُن سے استفادہ کرسکتا ہے، ہاں صرف ایسے لوگ منکر ہوتے ہیں جو بے حکم ہیں یعنے خدا کے کھلے حکموں کو نہیں مانتے اور اپنے بے جا تمرّد اور ناروا سرکشی کے نشہ میں ان روشن احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔

یہ خوب سمجھ لو جو کتاب تمہاری ہدایت کے لئے بذریعہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم بھیجی گئی وہ ضرور ایسی ہونی چاہیے، جسے بلا تکلیف تم سمجھ سکو اور اس سے تمہیں بخوبی ہدایت ہو۔ خداوند تعالے خود فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔

وہ اللہ ایسا ہے جس نے اُن پڑھوں میں ایک رسول کھڑا کیا کہ اس کی آیتیں اُن پر پڑھتا اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و عقل کی باتیں سکھاتا ہے اور بیشک وہ پہلے سے گمراہی صریح میں تھے۔

آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ناپاکوں کو پاک کرنے اور جاہلوں کو عالم بنانے اور نادانوں کو عاقل بنانے اور احمقوں کو دانا اور سمجھ دار بنانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے، آپ نے اُن ان پڑھوں کو عقل کی باتیں سکھائیں اور انہیں جہان سے افضل بنادیا، اور ایسی کتاب کا سبق دیا جو ان کی روحانی اور جسمانی پاکی کی ایک کامل مددگار اور معاون بنی اور انہیں تمام اُن ناپاک الائشوں اور متعفن بیہودگیوں سے پاک کردیا جس میں وہ صدہا برس سے پھنسے ہوئے تھے، وہ غلیظ اور قابل نفرت عادتیں جو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں، اور جن ناقابل بیان خباثت میں وہ ایک زمانۂ مدید سے پھنسے ہوئے تھے، انہیں اس طرح پاک کردیا گویا وہ دوبارہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، اور پھر اُن کے ایسے نتھرے ہوئے خیالات ہوئے، جن پر آج اسلامی عالم ناز کرتا ہے۔

آپ جانتے ہوں گے کس وجہ سے اُن میں جہان کی بُرائیاں آگئی تھیں اور کس بوں اور زشت خصلت نے ان کی پاکیزہ اور بے گناہ فطرت کو طہارت سے دور کر دیا تھا۔ وہ صرف بُت پرستی شرک اور خدا سے دوری تھی جس نے انہیں برباد کر کے ہلاکت کے کنارہ تک پہنچا دیا تھا۔

انہوں نے اپنے سچے خالق کی قوتوں کو تقسیم کر دیا تھا اور اس کی عظیم الشان اور غیر قابل تقسیم قوت کے حصّے کر کے اپنے ہاتھ کے گھڑے ہوئے بتوں اور سنگی دیبیوں میں بانٹ دیئے تھے، وہ اپنے دیبیوں اور بتوں کو جنہیں سجدے کرتے تھے بادلوں اور ہواؤں پر حکمراں چاند سورج پر قادر خیال کرتے تھے وہ عقل کے دشمن جانتے تھے۔ ہمارے ہی ہاتھ کے گھڑے ہُوئے بُت ہماری مشکل کشائی کریں گے۔ بعضوں نے چاند سورج کو اپنا معبود بنا لیا تھا، اور انہیں کے آگے سجدے کرتے تھے۔ انسانی نیکی اور اشرفیت کو مٹانے والا یہی ایک بہت بڑا عیب تھا جو مخلوق میں خون کی طرح رگوں میں ساری ہو رہا تھا۔ غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہُوا، الحمد للہ آپ کی نبوت کا جو منشا تھا وہ پورا ہوا، خدا کا سچا جلال عالم پر چمکا اور دریائے باسفورس سے گنگرس تک اور گنگرس سے جمنا تک اس نور کا کامل پرتو پڑ گیا۔

مگر میں افسوس سے دیکھتا ہوں کہ بعض کوتاہ اندیشیوں اور ملکی جنگوں کے اُتار چڑھاؤ سے جو سلطنت ہند میں رہے، اور اہل ہنود کے ربط و ضبط سے اکثر ایسے خیالات جنہیں ٹھیٹ اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے، موجودہ نسلوں میں پائے جاتے ہیں، جن سے روحانی قوتوں کو شکست ملی اور اسلامی برکتوں نے ہند سے اپنا کوچ کیا۔

دیبی دیوتاؤں یا جن یا پریوں یا پیر شہید کی پرستش یا اُن سے حاجتیں طلب کرنا یا اُن کی قبروں پر اعتقاد اور صدق دلی سے چڑھاوا چڑھانا یا ضرورت کے وقت انہیں پکارنا جو دراصل بُت پرستوں اور نصرانیوں کا شعار تھا زمانہ کی دستبرد سے ہمارے بھائیوں میں بھی جاری ہو گیا۔ جسے ایک سچے مسلمان کی آنکھ نہایت حسرت و یاس سے دیکھتی ہے، ہم نے خدا و رسول کے علم کو بھلا دیا، فطرت اللہ کا وہ منشا جس سے آخر الزمان نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے تھے بالکل نسیاً منسیا کر دیا۔ اسی سے ہمیں دنیاوی اور دینی تنزل حاصل ہے، اور اسی سے ہماری یہ گت بنی کہ ہم آخرکار دنیا کی متبذل قوموں میں شمار کئے جانے لگے۔

بایں ہمہ ابھی ہمیں بہت کچھ اصلاح کی امید ہے اور ہم اپنے رب کے سچے کلام پر بھروسہ کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً ہم اگر اپنی یہ بُری عادتیں چھوڑ دیں گے اور گناہوں سے توبہ کرینگے تو فلاح کا رستہ دیکھنے میں کوئی شبہ باقی نہیں ہے۔ چنانچہ خداوند کریم اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا۔

اگر تم بُری چیزوں سے بچتے رہو گے جو تمہیں منع ہوئیں تو ہم تمہاری تقصیریں معاف کرینگے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کرینگے۔

یہ سچ ہے اگر تم نیک نیتی سے خدا سے ڈر کر اپنے بُرے اعمال سے توبہ کرو گے تو خوب سمجھ لو خداوند کریم کا یہ وعدہ تمہارے ساتھ پورا ہوگا اور پھر اس کی برکتوں سے مالامال ہو گے اور تم پر اُس کی رحمتیں نازل ہونگی۔

خدا کی بے شمار بخششوں کی سرتاج ایک بخشش وحدت پرستی ہے یعنی خدا کو ایک جاننا اور اسی پر اپنی تمام اُمیدیں اور ضرورتیں موقوف رکھنا اور یہ سمجھنا کہ ہمارا سچا مشکل کشا وہی ہے، اور وہی ہمیں ہدایت کرنے والا ہے۔ کیا تمہیں اس کا خیال نہیں۔ تم پانچوں وقت کی نمازیں ہر رکعت کے ساتھ پہلے کیا آیت پڑھتے ہو۔ بھائیو وہ سورہ فاتحہ ہے جس میں یہ مضمون درج ہے "تو ہی ہمارا معبود ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔ اسلام میں یہ ایک پہلی تعلیم ہے جو ہر مومن کو دی جاتی ہے۔ خدا کی بیشمار عنایتوں کا خیال کرو، کہ وہ اپنے بندوں کو کس کس طریقہ سے تعلیم دیتا ہے۔ اور انہیں نیکی اور سچی عبودیت کا کس بُردباری اور رحم سے رستہ بتاتا ہے، اس نے سکھایا ہے تم جب میری عبادت کرو تو ہر بار یہی کہو ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں، جب دن بھر میں صدہا بار ہماری زبان سے یہی نکلے گا تو ہمارے خیالات اور اعمال پر بھی اس کا اثر ہوگا اور پھر ہم اپنی ضرورتیں کبھی کسی پیر شہید یا جن پری پر موقوف نہ رکھیں گے، اور ہماری انسانی شرافت اور فضیلت کے دامن پر دھبہ نہ آئے گا۔ خدا کا جلال کامل طور سے ہماری روح پر چمکے گا، اور ہم اللہ کے پیارے بندوں میں سے ہو جائیں گے۔

بھائیو! تم اپنی پانچوں وقت کی نمازوں میں کیا پڑھتے ہو اور ان نمازوں سے کیا سیکھتے ہو یا ان نمازوں کا مفہوم کیا سمجھتے ہو۔ اسلام کے روشن اصول ہمیں بتاتے ہیں کہ اس عبادت کا سچا مفہوم یہ ہے ہم پر ہمیشہ خدا کا خوف طاری رہے، اور کبھی اس کے آگے دوسرے کو معبود نہ بنائیں، اسی پر بھروسہ کریں اور اپنی تمام قوتوں کا انحصار اسی کی تائید پر موقوف سمجھیں، بغیر اس کے نجات دارین کبھی نہیں ہو سکتی جیسا نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں:

اَلصَّلٰوتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَۃُ اِلَی الْجُمُعَۃِ یُکَفِّرْنَ مَا بَیْنَھُمَا اِنِ اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ۔[1]

پانچوں نمازیں اور جمعہ دوسرے جمعہ تک اُن گناہوں کو دُور کرتی ہیں جو اُن کے درمیان ہوں اگر بڑے گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

خداوند کریم کے دربار میں جب تم نہایت اطاعت نہایت فروتنی نہایت انکساری سے حاضر ہوتے ہیں اس وقت ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ ہم یہ کہیں تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں تو ہمیں وہ رستہ دکھا جس پر تیری برکت نازل ہوتی ہے اور اس راہ سے بچا جس پر تیرا غصہ ہے۔ پھر بڑے افسوس اور حسرت کا مقام ہے خدا کے دربار میں تو حاضر ہو کر ہم یہ عرض کریں اور جب وہاں سے اپنے گھر آئیں تو کسی پیر شہید کی قبر پر چلہ باندھنے جائیں اور یہ عہد کرائیں جب ہمارا فلاں کام نکل آئے گا تو ہم آپ کی یہ نیاز دلوائیں گے۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے خدا کے آگے تو یہ التجا اور یہ وعدہ اور پھر شہید کی قبر پر یہ چڑھاوا اور یہ حاجت طلب کرنا۔

ہمارے یہ کام نہایت ہی خوفناک اور تباہی کرنے والے ہیں اور یہی وہ کمبخت افعال ہیں جو ہمیں دین و دنیا میں بدنام کریں گے، اور کبھی ہمیں اسلامی برکتیں حاصل نہ ہوں گی، اور ہم دین تو دین دنیا میں بھی اپنے پرائے کی آنکھ میں ذلیل و خوار ہو جائیں گے، اور ایک عالم میں نکو بنے رہیں گے۔

یہ کس حسرت و یاس سے دیکھا جاتا ہے کیا تو وہ زمانہ تھا کہ اسلام نے بہت دھوم دھام سے یہ اعلان کیا تھا۔

شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ — اللہ نے گواہی دی کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا

[1] مسلم بروایت ابوہریرہ ؓ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو کر اللہ تمہیں چاہے اور تمہارے گناہ بخش دے۔

اسلام کی صرف یہی ایک نشانی ہے کہ خدا کو واحد جاننا اور نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا پاک نبی سمجھنا اگر یہی ایک بات نہیں ہے تو کس مُنہ سے کہا جاتا ہے ہم مسلمان ہیں۔ اب اس کے علاوہ کسی کا ایمان ہے تو اس پر افسوس اگر ذرا ہم اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈالیں اور اپنے اعمال کی طرف دیکھیں جنہوں نے ہمیں ٹھیٹ اسلام سے بہت دُور پھینک دیا ہے تو ہمیں معلوم ہو کہ ہم خدا اور اس کے نبی سے کتنے برگشتہ ہیں اور اس سے اپنی جانوں پر کیا غضب توڑ رہے ہیں۔ ہمارے کیسے پکے عقیدے اور ہمارا ایمان کیسا ضعیف ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی محبت ہمارے دل میں مطلق نہیں رہی، اور ہم اپنی معمولی کمینی ضروریات پر کہیں شیخ سدو کا بکرا کرتے ہیں، اور کہیں سید احمد کبیر کی گائیں کرتے ہیں، اور کبھی پریوں کا کونڈا کرتے ہیں، اور کبھی حضرت علی مشکل کشا (یہ خطاب شیعوں نے حضرت علی کو دیا ہے، اور اسی کا اثر تمام سُنیوں پر پھیل رہا ہے) کا دونا کرتے ہیں۔ کبھی کسی قبر پر چڑھاوا چڑھاتے ہیں، اور کبھی کسی پیر کی قبر پر چلہ باندھتے ہیں، غرض ہم اپنی کمینی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے کیا کیا کچھ شرک و بدعت نہیں کرتے، اور پھر کتنی دور اسلام سے جا پڑتے ہیں۔ ہمارے ایمانی ضعف کا یہ سارا طفیل ہے، کاش ہم میں ایمانی ضعف نہ ہوتا تو یہ بیہودہ باتیں کبھی ہم سے ظہور میں نہ آتیں۔ جہاں خداوند کریم صاف طور سے اپنے کلام مجید میں یہ فرماتا ہے۔ تو دعا کریں قبول کروں گا، وہاں ہم محض اپنی دلی کمزور کل جوش اور نالائق جذبہ کے مطیع ہو کے اس بیش قیمت وعدہ پر تو نگاہ نہ کریں، اور ادھر اُدھر بھٹکتے پھریں، تف ہے ہماری اس حمیت اسلامی پر لو داغ ہے ہماری اس مسلمانی پر۔

یہ نہیں جانتے کہ جن سے تم اپنی حاجتیں طلب کرتے ہو وہ بھی تمہاری طرح خدا کے محتاج ہیں جب وہ اپنی مشکل کشائی نہیں کر سکتے تو تمہاری کیا کر سکتے ہیں۔ وہ خداوند کریم کے عاجز بندے ہیں اور ان کی بخشش صرف اُسی کی مرضی پر موقوف ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا اُن کی نجات بھی ہوئی یا نہیں کیونکہ سوائے ان چند صحابہ کے جن کی بشارت خود نبی عربی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دی ہم کبھی قطعاً کسی کو ناجی اور ناری کہنے کے مجاز نہیں ہیں تو تم آپ خیال کر سکتے ہو کہ جب ان

کے محتاج ہونے کی کوئی شہادت تمہارے پاس موجود نہیں ہے، پھر کس طرح ان سے حاجتیں جا کے طلب کرتے ہو اور انہیں اپنا مشکل کشا بنا رکھا ہے، کیا تم سے بھی زیادہ کوئی محسن کش اور احسان فراموش ہو سکتا ہے، خداوند تعالیٰ تم پر کیسا مہربان ہے اور تم سے کیسی محبت رکھتا ہے اور تم اس سے بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ ہمارا فرض ہے اور یہی ہمارا مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ ہر حالت میں اسی کی طرف رجوع کریں کیونکہ جب تک ہم اس کی طرف رجوع نہ کریں گے ہماری بخشش نہیں ہو سکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۔ وہ رجوع لانے والوں کو بخشتا ہے۔

بعض ہمارے بھائی یہ بہانہ کرتے ہیں کہ ہم۔۔۔ بزرگوں سے اپنی حاجتیں طلب نہیں کرتے بلکہ ان کے وسیلہ سے خدا سے مانگتے ہیں اور اپنے اس دعوے کی دلیل دنیاوی معاملات پر منحصر رکھتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص سفارشی نہ ہو امیر کے دربار تک رسائی نہیں ہوتی، مگر یہ خیال اُن کا جیسا رکیک ہے اسی قدر کم عقلی پر دلالت کرتا ہے، امیر کے دربار اور خداوند تعالیٰ کے دربار کی مناسبت نہیں ہو سکتی، امیر کسی حاجت مند کی حاجت بغیر عرض کئے نہیں جان سکتا۔ اور خدا کو اپنی کل مخلوق کا رتی رتی علم ہے۔ امیر بغیر اطلاع کئے نہیں پہچان سکتا کہ مجھ سے کون ملنا چاہتا ہے، لیکن خدا صرف دل کے ارادے سے جان جاتا ہے پھر ایسے عالم الغیب چھپی اور پوشیدہ چیز کو جاننے والے مخلوق کے دلی خیالات کا علم رکھنے والے کے دربار میں کسی سفارشی کی ضرورت ہے اور نہ کسی اطلاع کرنے والے کی حاجت ہے، شریعت کا رستہ صاف اور کھلا ہوا ہے، دین کی نعمت ہم پر پوری ہو چکی ہے، اس کی تکمیل کی ضرورت اب نہیں رہی، پھر کیا ضرور ہے کہ غیر ضروری باتوں کی طرف ہم اپنا دل رجوع کریں، اور اسلام کے روشن احکام سے برگشتہ ہوں فقط۔

یہ اس قیمتی وعظ کا خلاصہ ہے جو مولانا شہید نے اول بار الوداع کے دن فرمایا گو وعظ اتنا بڑا ہے کہ پندرہ سولہ جزو میں اگر پورا تحریر کیا جاوے تو بشکل تمام ہووے لیکن ہم نے اس پریشان اور بے ربط تحریر سے جو ان کے منشی ہیرا لال کے ہاتھ کی نہایت جلدی میں لکھی گئی تھی بشکل بڑے غور و فکر کے بعد یہ خلاصہ کر لیا ہے، اور بہت سی حدیثیں اور آیتیں نقل ہیں لیکن وہ ایسی اشاروں

میں لکھی ہوئی ہیں کہ ہم سے مطلق نہیں پڑھی گئیں۔ بہرحال مولانا کے پر جوش اسلامی خیالات کا اسی سے ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس سادے بیدھے وعظ سے جو بالکل اسلامی عقائد کو ظاہر کرتا تھا عوام الناس میں خوفناک تحریک پھیل گئی، اور ان کے فاسد خیالات کے سمندر میں ایک مہیب تموج پیدا ہو گیا وہ نیاز نذر کرنے کے مدت سے عادی تھے وہ اس بات کو اپنا دین وایمان سمجھتے تھے کہ ضرورت کے وقت پریوں کا کونڈا کریں، اور سید احمد کبیر کی گائے اور شیخ سدّو کا بکرا کریں، انہوں نے یہ تقریر کاہے کو سُنی تھی کہ یہ ساری باتیں بدعت و شرک ہیں اور اسلام سے انہیں کچھ علاقہ نہیں ہے، اسلام میں اگر توحید کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو واقعی ایسا نازک اور باریک ہے کہ بمشکل آدمی شرک سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً یہ سمجھنا کہ ابر خود آپ پانی برساتا ہے اسلام میں شرک ہے، اور یہ عقیدہ رکھنا کہ پانی کھیتوں میں اناج کا نمو کرتا ہے شرک ہے، چہ جائے کہ اپنی حاجتوں کے انبار کو پیر شہید کی گردن پر رکھنا اور ان ہی پر اپنی تمام ضروریات کے حل ہونے کو موقوف سمجھنا یہ تو صریح کفر اور شرک ہے۔

اپنی کسی حاجت پر خدا کے سوا کسی کو پکارنا یہ ایک کمزور ابال ہے جو ضعیف طبائع میں اکثر اٹھتا ہے، انسان کی طبیعت میں قدرتی احسان فراموشی اور محسن کشی کا مادہ بہت ہے مگر اُن پاک اور مقدس انفاس کا ذکر نہیں جن پر اسلام کی پوری برکتیں نازل ہو چکی ہیں اور دین خدا کا پورا جلال اپنی تابانی اُن کے جملہ قلوب پر دکھا چکا ہے وہ ہر حالت میں خدا ہی کو پکارتے ہیں اور چاہے ان پر کیسی ہی مصیبت آکے واقع ہو وہ خداوند کریم کے سوا کسی کی بھی نہیں مدد چاہتے، یہی ان کا مایۂ بساط ہے اور اسی پر انہیں ناز اور فخر ہے وہ خدا پرست قوم جس نے اول وحدت پرستی کا دنیا میں نور چمکایا، مسلمانوں کی مرحوم قوم ہے خدا وہ دن نہ کرے کہ اس کی خدا پرستی کی صفت مثل گور پرستی، بُت پرستی اور تعزیہ پرستی کی صفت آجائے یہ سب جانتے ہیں، خدا کے آگے سب عاجز ہیں کسی کی یہ مجال نہیں کہ کسی کی سفارش اللہ کی درگاہ میں کر سکے، حشر میں جب تمام پیغمبروں کی اُمتیں باری باری سے اپنے نبیوں کے پاس جائیں گی، اور بزاری یہ عرض کریں گی کہ آپ ہماری شفاعت خدا کے آگے کیجئے تو وہ خوف باری تعالیٰ سے کانپیں گے اور یہ کہیں گے ہم میں مجال نہیں ہے کہ ہم تمہاری سفارش کر سکیں، ایک نبی دوسرے نبی کے پاس بھیجے گا اور وہ

بھی کہہ کے ٹال دے گا، حتیٰ کہ ہمارے آخرالزمان نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے اور آپ خداوند تعالیٰ سے (اس کے حکم سے) سب کی شفاعت (مومنین سے غرض ہے) چاہیں گے۔ انبیاء علیہم السلام جو معصومین ہیں ان کی یہ کیفیت ہے وہ خدا سے کسی کی سفارش کرنے کی مجال نہیں ہیں پھر ہم حیران ہیں کہ یہ کیونکر سمجھ لیا گیا اگر فلاں شہید یا ولی کی نیاز دلوائی جائے گی، اور اس کی قبر پر کلاوے کا لال ڈورا باندھا جائے گا اور منت مانی جائے گی، محض اس اُمید سے یہ خدا سے ہماری سفارش کر دیں گے اور ہماری ضرورت یا ہماری مشکل حل ہو جائے گی یہ کتنے قہر کا مقام ہے، خصوصاً مسلمانوں کے لئے جن کے اسلام کے خلاف ایسے عقیدے ہوں اور پھر وہ اپنے کو مسلمان کہیں یہ سچ ہے کہ ضرورت دنیا میں ایک ایسی قہر کی چیز ہے کہ انسان سے ناگفتہ بہ افعال صادر ہوتے ہیں، اور ایسے ایسے قبیح کاموں کے کرنے کی مبادرت کرتا ہے کہ اگر ضرورت نہ پڑتی تو کبھی نہ کرتا مگر پھر بھی مسلمانوں کے لئے خدا کے وعدے ایسے زبردست سہارا دینے والے ہیں اگر وہ ان پر غور کریں اور اپنے دل میں سمجھیں اور ان کا پورا یقین اپنے قلب میں کر لیں تو کبھی بھی ضرورت کا خوفناک جن انہیں نہ ستاوے، اور وہ ہمیشہ محض خدا کے بھروسہ پر مصیبت کے وقت بھی مطمئن اور خوشحال رہیں، سب سے زیادہ ایسے لوگوں پر بھی افسوس ہے جو ضرورت کے وقت یا اپنی سخت تر مصیبت کی حالت میں جب وہ اپنے معاونین کی مدد سے ناامید ہو جاتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں خدا ہی سے مدد چاہنی بہتر ہے اور بغیر اس کی مشکل کشائی کے کچھ بھی نہیں ہوگا تو وہ اس وقت اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں اور خدا ان کی مدد کرتا ہے کیونکہ خدا نے خود وعدہ فرمایا ہے جو مجھے سچے دل سے پکارتا ہے میں اس کے پاس پہنچتا ہوں۔ اور جب وہ احسان فراموش اس مصیبت سے رہائی پاتے ہیں تو اپنے ناپاک خیالات اور نامقدس افعال کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور پھر دین و دنیا میں خسارہ پاتے ہیں جن کی حالتوں پر خود خداوند تعالےٰ افسوس کرتا ہے اور فرماتا ہے :۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ۔

پھر جب سوار ہوئے کشتی میں پکارنے لگے پوری اسی پر نیت رکھ کے اور جب انہیں زمین پر بچا لایا تو لگے شریک کرنے۔

ایسے ناواقف اور بھونڈے طبائع پر افسوس۔ اس آیت کا صاف یہ مفہوم ہے کہ اگر کشتی میں سوار ہو اور کوئی بحری یا سماوی آفت آگے واقع ہو تو خدا ہی سے مدد مانگو کیونکہ وہی ناگہانی بلاؤں سے بچاتا ہے، اس سے صریح خدا پرستی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے، مگر ہٹ دھرم اور ضدی بندے نہیں سمجھتے۔

جب یہ وعظ جس کو ہم نے مختصر طور پر لکھا ہے مولانا صاحب نے کیا تو اکثر مسلمان ناراض ہوئے اور انہوں نے باہم یہ کانا پھوسی کرنی شروع کی مولانا نے بزرگان دین کی سخت توہین کی ہے اور بڑی بے ادبی سے پیش آئے ہیں، اور نیاز نذر کو برا بتاتے ہیں، غرض باتوں کے بتنگڑے بن گئے، اور نئے نئے اتہامات اور الزامات وعظ میں جن کا سان و گمان بھی نہ تھا مولانا کی بے گناہ ذات پر لگائے گئے، کسی نے یہ مشہور کیا انہوں نے نبی کی توہین کی اور کہا وہ ہم سے زیادہ (معاذ اللہ) نہیں ہیں، کسی نے یہ کہا وہ حدیث و قرآن پر اعتراض کرتے ہیں، اور اپنے آگے کسی کی کچھ حقیقت نہیں بتاتے۔ غرض وہ باتیں کہ جن سے سراسر دشمنی ٹپکتی تھی، مولانا کے سر چپکائی گئیں، اور خدا واسطہ کی وہ وہ باتیں جن سے مولانا کی ذات والا بہت دور تھی زبردستی آپ کے وعظ میں داخل کرنی چاہیں۔

یہ لوگ اپنی ان چالاکیوں میں کامیاب ہوئے، اور مولانا کے خلاف تمام شہر میں ایک جوش پھیل گیا، چند سنجیدہ لوگ انصاف پرست بزرگ جو اس جلسہ میں موجود تھے، اور جنہوں نے مولانا کی تقریر خوب گوش دل سے سنی تھی، ایک عام مخالفت کے آگے کچھ دم نہ مار سکتے تھے۔ انہیں اپنی جانوں اور عزت کا خیال تھا کہ کہیں اس طوفان بے تمیزی کے ہم ہی نذر نہ ہو جائیں۔

طلبہ کے گروہ میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا، اور انہوں نے بھی خواہ مخواہ کی مخالفت میں قدم رکھا۔ یہاں عجب کیفیت تھی کہ طلبہ اور غیر طلبہ سب ہی ایک ہی کھوپڑی کے لوگ تھے، بھلا جب شاہ عبدالعزیز صاحب کی مستورات بیوی کی صحنک کرتی تھیں، اور کوئی منع نہ کر سکتا

[illegible]

تھا تو اور گھروں کا کیا کہنا، جو لوگ تعزیہ پرستی کرنی دین وایمان جانتے تھے، اور سیتلا کو پوجتے تھے، ان کے آگے دین اسلام کی ایسی باتیں بہت ہی گراں گزریں گی، اور وہ خواہ مخواہ مخالفت کرنے پر تیار ہوں گے۔

طلبہ اس بات پر آمادہ ہوئے کہ ہم مولانا سے اس بارہ میں گفتگو کریں گے کہ کیوں نبیوں ولیوں اور شہدار کو وسیلہ خدا کی درگاہ میں بنایا جائے؟ اور ان سے کس وجہ سے نہ حاجتیں طلب کی جائیں بعض اس بات پر آمادہ تھے ہم حدیث میں گفتگو کریں گے، اور مولوی فضل حق صاحب کے شاگرد تو بہت سرگرمی سے اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ہم معقول میں مولانا سے بحث کریں گے۔ غرض ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق مولانا کی مخالفت پر ٹوٹ پڑا، اور شہر دہلی میں نئی نئی افواہیں نئی نئی باتیں مولانا شہید کی نسبت روز اُڑنے لگیں، یہاں تک کہ عورتوں میں بھی اس کی گفتگو شروع ہو گئی، اور وہ بھی اپنے مخالفت کے ہتھیاروں کو مولانا کے مقابلہ میں استعمال کرنے لگیں، یعنے کوسنے دینے اور مولانا کا نام لے لیکے پیٹنا۔ ایک دن مولانا شہید عصر کی نماز پڑھ کے جامع مسجد میں حوض پر بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک بڑھیا مولوی صاحب کے پاس آئی اور اس نے کہا مولوی صاحب موا اسمٰعیل کون نیا مولوی پیدا ہوا ہے جو یہ کہتا ہے بیوی کی صحنک نہ کرنی چاہیئے، آپ نے جواب دیا بڑی بی موا اسمٰعیل نہیں کہتا بلکہ جس بیوی کی تم صحنک کرتی ہو اس کے باپ نے منع کر دیا ہے میری بیٹی کی صحنک نہ کیا کرو۔ یہ سنتے ہی وہ یہ کہنے لگی جب بیوی کا باپ یہ کہتا ہے میری بیٹی کی صحنک نہ کیا کرو میں اس پر صدقہ گئی آئندہ سے نہ کیا کروں گی واری جاؤں یہ بات ہے تو سچ نا۔ آپ نے فرمایا خدا گواہ ہے یہ بالکل سچ ہے وہ بڑھیا مولانا کی بلائیں لینے لگی اور دعا دیتی ہوئی چلی گئی۔ اس سے ناظر سوانح اس عام مخالفت کا اندازہ کر سکتا ہے، جو مولانا شہید کی عورت و مرد میں پھیل گئی تھی اور یہ ضرور ہونا تھا صدیوں کی بُری عادتیں

(بقیہ حاشیہ صہ ۶۲) عامل بالحدیث ہونے کا افتخار رکھتا تھا بہر حال اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ امرار اور شرفار ہی کی مستورات شرک و بدعت میں مبتلا نہ تھیں بلکہ مولویوں اور لکھے پڑھوں کی عورتیں بھی ایسا ہی کرتی تھیں اور کوئی اُنہیں روکنے والا نہ تھا ایسی بڑی بات جیسی کتاب مذکور کا مصنف لکھتا ہے، بغیر ایک کافی اور بڑی شہادت کے ہم نہیں مان سکتے ۱۲

جو دہلی والوں کی گھٹی میں بیٹھ گئی تھیں، یکایک بغیر ایک عظیم الشان جھگڑے کے نہ جا سکتی تھیں، مولانا شہید کو ایک ایک ادنیٰ واقع کی روزمرّہ رپورٹ گزرتی تھی، اور آپ ہر مخالفت کی خبر کو نہایت سنجیدگی سے سنتے تھے، اور اُس پر غور کرتے تھے، لُطف یہ تھا کہ ابھی یہ وعظ نہایت دھیما تھا اور جو بات یا ہدایت کی گئی تھی وہ صیغہ غائب میں کی گئی تھی، اور ابھی ان رسوم کی بات کو بہت کم بیان کیا گیا تھا جو قلعہ اور قلعہ کے باہر کی جاتی تھیں، ابھی تقلید شخصی اور پیر پرستی کی بحث ہی نہیں ہوئی تھی، نہ اس پر کسی قسم کے اعتراض کئے گئے تھے، ایسے سادے وعظ پر جب یہ غل و شور ہوا تو اس کا اندازہ ہو سکتا تھا کہ جب کھلم کھلا ہر مسئلہ پر بحث کی جائے گی تو کیا آفت برپا ہوگی۔

مولانا شہید نے خطرہ کے وزن کو پورا پہچان لیا اور گو ابھی عمائد و اعیانِ شہر اس طرف رجوع نہ ہوئے تھے، اور نہ ابھی مولوی فضل حق صاحب کی مخالفانہ کارروائی شروع ہوئی تھی، پھر بھی عقلمندی یہ تھی کہ ہر طرح سے بندوبست کیا جائے، اور ایسا نہ ہو مخالف غافل پا کے کوئی جسمانی مضرت پہنچائیں۔

آپ نے پہلے چند بڑے بڑے بدمعاشوں کے سرغنوں کو اپنی جادو بھری تقریر سنا کے مرید کیا، اور انہیں اپنا ایسا معتقد بنایا کہ وہ اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے، مصلحت اس کی مقتضی تھی کہ یہ کارروائی کی جائے کیونکہ دن بدن مخالفت کی آگ بھڑکتی جاتی تھی، اور خدا کی شان سے روزمرّہ ایسی ایسی باتیں سرزد ہوتی تھیں کہ اس مخالفت میں اور جان پڑتی تھی، مثلاً ایک دن مولوی اسماعیل شہیدؒ اپنے چند معتقدوں کے جامع مسجد میں حوض پر بیٹھے ہوئے تھے، اُس عرصہ میں خدام زیارت[1] کی چیزیں لے کے اکبر شاہ کے لئے قلعہ میں جانے

---

[1] تبرکات جو جامع مسجد میں رکھے ہوئے ہیں محمد شاہ کے وقت قلعہ سے جامع مسجد میں لاکے رکھے گئے تھے کیونکہ وہاں فسق و فجور بہت ہوتا تھا اور یہ خیال کیا گیا ہے کہ قلعہ پر اسی لئے تباہی پڑی ہے جہاں یہ تبرکات رکھے ہوئے ہوں وہاں اس قسم کی عیاشی ہو جس کی نظیر دنیا میں کم ملے گی، ان تبرکات میں موئے مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جبۂ شریف نبی اکرم، نعلین شریف نبی اکرم، قدم مبارک نبی اکرم، پارہ کلام مجید نوشتہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، پنجہ شریف حضرت علی، قرآن شریف نوشتہ حضرت امام حسنؓ، موئے مبارک (باقی برص۶۵)

لگے، جتنے لوگ جامع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے سب کھڑے ہوگئے اور سب نے نہایت خوش اعتقادی سے اُٹھ کے تعظیم دی اور کلمہ طیبہ پڑھنے لگے مگر مولانا شہید اور آپ کے رفقا بیٹھے رہے، اور تعظیم پر مطلق توجہ نہ کی، تمام معتقدین اشیائے زیارت جل کے خاک ہوگئے، اور خدام تو اس قدر ناراض ہوئے کہ ان کا بس نہ چلا نہیں تو وہ وہیں خون خرابا کر ڈالتے وہ سیدھے اکبر شاہ ثانی کے دربار میں حاضر ہوئے، زیارت کی چیزیں دیکھ کے اکبر شاہ سرتاپا کھڑے ہوگئے، اور بڑے تپاک سے سب کو آنکھوں سے لگایا، اور ان پر بوسہ دیا، یہ کہہ کے خدام رونے لگے، اور انہوں نے ہاتھ باندھ کے

(بقیہ حاشیہ صہ ۶۴) حضرت امام حسنؓ، پارہ کلام مجید نوشتہ حضرت امام حسینؓ شہید کربلا، موئے مبارک حضرت امام حسین، پارہ کلام مجید حضرت امام جعفر صادق، غلاف روضۂ اطہر نبی اکرم، غلاف کعبہ شریف، ان تبرکات کی تاریخ یہ ہے جب تیمور لنگ نے دمشق فتح کیا ہے اور وہاں کی غنائم اس کے قبضہ میں آئی ہیں تو سب متبرک چیزیں جو اس کے قبضہ میں آئیں وہ مذکورہ بالا تھیں یہ وہ دمشق ہے جو کئی صدی تک بنی امیہ کا پائے تخت رہ چکا تھا اور یہاں شاہی جبروت کی انتہا ہو چکی تھی یہ تبرکات تیمور نے بہت ادب سے اپنے قبضہ میں رکھے اور جہاں جاتا انہیں اپنے ساتھ لے جاتا چنانچہ جب وہ ہندوستان میں آیا تو ان تبرکات کو بھی ساتھ لایا اس کے آگے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ تبرکات شریف بابر بادشاہ کے ہاتھ کیوں کر پڑ گئے، ایک روایت کے بموجب یہ معلوم ہوا کہ بابر ان تبرکات کو لے کے بلخ روانہ ہوا، جب بابر کی وفات ہو گئی تو یہ تبرکات بخارا میں چلے آئے، اور وہاں ایک عرصہ تک رہے۔ ہندوستان میں جب شاہجہان کی سلطنت ہوئی تو اس نے ان تبرکات کو اس بنا پر کہ یہ میرے لشکر دادا بابر کی ملک تھے، امیر بخارا سے واپس منگائے، اور انہیں نہایت ادب سے موتی مسجد میں رکھا۔ بعد ازاں یہ مقدس چیزیں دہلی کے لال قلعہ میں چلی آئیں، اور جب عالمگیر دکن پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہوا تو یہ مقدس چیزیں لال قلعہ سے جامع مسجد میں مغربی جانب داہنی منار کی طرف رکھ دیں۔ ۱۸۵۷ء کے طوفان خیز غدر میں بڑی جانفشانی سے یہ تبرکات محفوظ کئے گئے اور سرائے روح اللہ خان میں انہیں بڑی امانت اور حفاظت سے رکھا گیا۔ ۱۸۱۳ء میں جب جامع مسجد واگزاشت ہوئی، عمائد شہر دہلی ان تبرکات کو اس سرائے سے جامع مسجد میں لے آئے اور جنوب رویہ بارہ دری میں انہیں محفوظ کیا چنانچہ وہ اب تک موجود ہیں۔ یہ تاریخ ان تبرکات کی ہے جو ہماری آنکھوں کے آگے رکھے ہوئے ہیں، خدام تبرکات کی بیان کی ہوئی تاریخ۔ مگر کسی معتبر تواریخ میں ہم نے اس کا کہیں ذکر نہیں پڑھا۔ سر ولیم میور صاحب نے مختلف تبرکات کا تذکرہ کیا ہے (دیکھو لائف آف محمد صہ ۵۵۹ کا فٹ نوٹ) لیکن ان تبرکات کی (باقی بر صہ ۶۶)

اور آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے خیال میں کوئی جرم نہیں کیا ہے نہ دنیاوی نہ دینی پھر میں کیوں خوف کھاؤں، اور ابھی مجھے یہ بھی علم نہیں ہے، اکبر شاہ کا خیال میری نسبت کیلئے میں اس کی ناحق کیوں شکایت کروں میں دلیری سے اس کے پاس جاتا ہوں اور جو کچھ وہ دریافت کریگا اس کا شافی جواب دیا جائے گا۔

آخر آپ بڑی دلیری سے اکبر شاہ کے دربار میں پہنچے مگر ہاں ہم یہ لکھنا بھول گئے، دربار میں جانے سے پہلے آپ نے اکبر شاہ کو یہ لکھ کے بھیجا تھا اگر آپ مجھے دربار میں بلاتے ہیں تو میں ان تمام درباری قیود سے معاف کیا جاؤں جو آپ کے ہاں ایک لازمی امر ہے میں اسلامی طریقہ سے ملوں گا، اور جیسا ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تہذیب سکھائی ہے ہم اسی طرح عمل درآمد کریں گے۔

اکبر شاہ نے بعد فکر و غور اور مشورہ کے یہ بھی تسلیم کر لیا، پھر مولانا شہیدؒ دربار اکبری میں داخل ہوئے۔ جاتے ہی السلام علیکم کہا اور اکبر شاہ نے اسی گرمجوشی سے اس کا جواب دیا ملاقات پرائیویٹ تھی، سوائے دو تین خواجہ سراؤں کے اور کوئی نہ تھا، اکبر شاہ ایک گدی پر بیٹھے ہوئے تھے، شاہ صاحب بھی پاس جا کے بیٹھ گئے، اکبر شاہ نے نہایت خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا اور آپ کے خاندان عالی کی تعریف کرنے لگے، اس کے بعد اکبر شاہ نے یہ کہا میں نے آپ کی نسبت مختلف افواہیں سنی ہیں چونکہ مجھے ان کی تصدیق کرنی ضرور تھی اس لئے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے، کیا خدانخواستہ آپ کے ایسے خیالات ہیں، آپ اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے بُرے نہیں جانتے۔ یہ سُن کے مولانا شہیدؒ نے پہلے کلمہ طیبہ پڑھا اور پھر دین اسلام اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کئے اور اس خوش اسلوبی سے بیان کئے کہ اکبر شاہ حد سے زیادہ محظوظ ہوئے، اور آخر میں انہیں رقت آگئی وہ ہر چند چاہتے تھے اپنے کو ضبط کریں لیکن نہ کر سکے اور اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ ان کی ہچکی بندھ گئی جب یہ تمام باتیں ختم ہو چکیں تو اکبر شاہ نے دبی آواز سے یہ کہا جب رسول مقبولؐ کی آپ کی نظر میں یہ فضیلت اور بزرگی ہے پھر آپ نے جمعہ گزشتہ کو تبرکات کی کیوں نہیں تعظیم کی، میرے خیال میں شاید یہ بات غلط ہو کیونکہ آپ کی ذات سے یہ

بعید ہے آپ تبرکات کی تکریم نہ کریں، مولانا شہید نے جواب دیا نہیں یہ صحیح ہے میں نے بے شک تبرکات کی تعظیم نہیں کی اس لئے کہ میں انہیں تبرکات نہیں سمجھتا نہ ایسے تبرکات کی جو فرضی ہیں اسلام میں تعظیم کرنے کا حکم آیا ہے یہ سُن کے اکبر شاہ چونکے اور کہا یہ افسوس کی بات ہے آپ تبرکات کی عزّت نہیں کرتے، اس پر شاہ اسماعیل صاحب نے یہ کہا اگر یہ تبرکات ہوتے تو آپ ان کی زیارت کو جاتے نہ کہ یہ تبرکات آپ کی زیارت کو یہاں آتے یہ سنتے ہی اکبر شاہ کو سناٹا آگیا اور انہوں نے مولانا شہیدؒ سے معافی مانگی، اور کہا آئندہ میں یہ بدعت کبھی نہ کروں گا، پھر مولانا نے اکبر شاہ کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا، جس میں سونے کے کڑے تھے اور جن میں ایک بیش قیمت پتھر (جواہر کی قسم) جڑا ہوا تھا، اکبر شاہ نے جو مولانا شہید کے کہنے پر کہ مرد کو سونا پہننا حرام ہے، فوراً کڑے اُتار کے مولانا کے حوالے کیئے، مولانا شہیدؒ بڑے ذہین اور رسا طبیعت کے تھے، انہیں اپنے ہم وطنوں کی مشتبہ طبائع کا پورا اندازہ تھا، اور وہ اپنی بدنامی کا حتی الوسع خیال کرتے تھے، اس لئے آپ نے وہ کڑے واپس کر دیئے، اور فرمایا انہیں فروخت کر کے مساکین کو دے دیں میں نہیں لے سکتا، گو میں بھی محتاجوں کو دے سکتا تھا لیکن لوگ یہ طعن ماریں گے اسمٰعیل نے اکبر شاہ سے کڑے اترواکے آپ اینٹھ لئے، اسی لئے سونا پہننے پر اعتراض کیا ہوگا، لہذا میں ایسی بدگمانیوں سے حتی الامکان بچنا چاہتا ہوں، یہ سُن کے اکبر شاہ اور بھی خوش ہوئے، اور نہایت عزت و توقیر سے مولانا شہید کو رخصت کیا۔ ہمیں ایک راوی کی روایت کے بموجب یہ اطلاع ملی ہے کہ مولانا کو ایک خلعت فاخرہ سات پارچے کی بھی عنایت ہوئی تھی اور رخصت کرتے وقت اکبر شاہ نے یہ دعا دی تھی، "خدا کرے اسلام کے پیچیدہ کاموں کی مشکل کشائی تمہارے ہی قوت بازو سے ہو۔"

جب مولوی اسمٰعیل صاحب کا یہ اعزاز ہوا تو اور بھی مخالفوں کے دانت کھٹے ہوئے، اور انہیں اپنے خیالات میں ناکام ہونا پڑا۔ تبرکات کے امین آنکھیں پھاڑے ہوئے یہ رستہ دیکھ رہے تھے، اب ہم یہ سنیں اسمٰعیل قلعہ میں بے عزت کیا گیا، اور اکبر شاہ نے اسے قید کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا، مگر وہاں اور ہی صورت نظر آئی یہ وجہ اور بھی ان کی

چوتھا باب

ضروری تمہید، مولانا شہیدؒ کے مختلف مضامین پر وعظ اور مولوی فضل حق صاحب کی تلخ تر مخالفت

پہلے اس سے کہ ہم مولانا شہید کے وعظ اور اس تلخ تر مخالفت کا تذکرہ کریں، جو مولوی فضل حق صاحبؒ نے مولانا شہیدؒ سے برتی تھی، اور اپنی تمام سر رشتہ دانی کی قوت مولانا شہید کے مقابلہ میں صرف کر دی تھی۔

یہ بہتر ہوگا کہ ان دونوں علماء کا تذکرہ کریں، اور دونوں کی علمی قابلیت اور زہد و تقویٰ اور حمیت اسلامی کا مقابلہ کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کریں تاکہ انہیں دونوں کے افعال اعمال اور ضمیری جوہروں کے جانچنے کا پورا پورا موقع ملے، یہ بحث چونکہ دلچسپ ہے، اس لئے اُمید ہے شوق سے پڑھی جائے گی۔

پاکی اور تقدس جو اسلام کے نونہال بچے ہیں ہمیشہ اس کی گود میں نہایت لاڈ سے پالے گئے ہیں اور جن پاک اور برتر نفوس نے اسلام قبول کیا، انہوں نے بھی ان بچوں کی ایسی لاڈ اور احتیاط سے پرورش کی جس طرح کہ اسلام کی گودی میں پلتے تھے۔

اس انتظام کے لئے کہ لاڈ کی یہ چاہت اہل اسلام میں سے نہ نکل جائے، انہیں بذریعہ علم تہذیب سکھائی گئی، شائستگی اور ادب سے ان کے دل کو منور کیا، اور ان کے ضمیری جوہروں کو اپنے جلال اور جبروت کی پوری درخشانی سے تاباں کیا گیا، خداوند تعالٰے کے علم سکھانے سے (خواہ وہ منقولی ہو یا غیر معقولی) یہ مراد ہے کہ ہمارے اخلاق درست ہوں اور ہماری تہذیب دنیاوی دینی شائستگی کے ساتھ ترقی کرے ہم اسلام کے سچے فرمانبردار اور پیارے مقتدی بن جائیں، اور ہماری ذاتی طہارت اور دلی صفائی سے غیر اسلام کی نگاہوں میں اسلام کی توقیر

بڑھے اور وہ اس کی طرف رجوع ہوں۔

اسلام جو دنیا میں اپنے کو کل ادیان کا سرتاج سمجھتا ہے۔ ہمیشہ زیادہ تر اسی علم پر فخر کرتا ہے کہ جس کے ساتھ ایمان کا بھی لفظ ہے۔ اس میں شک نہیں علم کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو قاطع اسلام یا ایمان ہو، پھر بھی ایسے شخص کی ذات سخت نفرت انگیز ہے جو علم حاصل کر کے اسے اپنی ناپاک نفسانی خواہشوں اور حیوانی جذبات سے حظ حاصل کرنے کا آلہ بنائے، اور اپنی انسانی برتری اور فضیلت اسلامی اور حرمت علمی کو مٹا کے ذلت کے آخری درجہ پر پہنچ جائے۔ ایسے شخص کو کیا عالم کہیں اور کن شرمناک الفاظ میں اس کی اور اس کے علم کی تعریف کریں۔

علم بجائے خود کوئی مضر چیز نہیں ہے، لیکن دل اور دماغ کی خوبی ایسے کہ علم مضر اور مہلک بن جاتا ہے وہی خنک پانی ہے جو روح کو تازہ اور معدہ کو سیراب کرتا ہے وہ ہی پانی اگر ایک ایسے مریض کو دیا جائے جس کا پھیپھڑا گل چکا ہو اور ہر دم پر دم واپسیں کا شبہ ہو تو وہ ایک گھونٹ پیتے ہی عالم ارواح کو سدھار جائے گا، ایسی حالت میں ہم پانی کو مہلک نہ کہیں گے، بلکہ اس ظرف کو مریض بتائیں گے کہ جو ایسی عمدہ شے سے بجائے مستفید ہونے کے اپنی جان دے۔ ہمارے دین کی کتاب یعنے قرآن مجید میں روشن اور صاف الفاظ میں یہ لکھا ہوا ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	اللہ ان کے درجے بلند کرے گا جو تم میں
وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ	ایمان اور علم رکھتے ہیں۔

فطرۃ اللہ کا اصلی مفہوم اور کلام ربانی کا اصلی منشا صرف یہی ہے کہ وہ علم علم ہے جس کے ساتھ ایمان ہو اور وہ علم کچھ علم نہیں ہے جس کے ساتھ بد دیانتی بدنیتی زنا اور شراب خواری جو انسانی شرافت اور فضیلت کا خون کرنے والے ہی ہوں۔ علم انسانی ضمیری جوہروں کو چمکاتا ہے لیکن ایسے علم کو سلام ہے، جس سے وہ اعلےٰ جوہر اور بھی مدہم پڑ جائیں، اور پھر اُن میں ایسا زنگ آجائے کہ اُن کی ہستی تک مٹ جائے۔

اسلام نے ہمیشہ اپنی روشن اور سب سے برتر تعلیم پر فخر کیا ہے، اور اس کا فخر ہر صدی میں

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے بھی تھے، چونکہ ہمیں ان کی بابت کوئی بحث نہیں کرنی، اس لئے نہ اُن کا مبلغ علم دیکھنا ہے نہ اُن کے چال چلن کی جانچ کرنی ہے، صرف ہمیں مولوی فضل حق صاحب سے بحث ہے۔

مولوی یا منطقی صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے معقولی تھے اور یہ مشہور تھا کہ صدرا جیسا منطقی صاحب پڑھاتے ہیں، شہر میں اور کوئی نہیں پڑھا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے مولوی منطقی صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے لائق اور فائق شخص تھے، اور یہ بھی مسلم الثبوت ہے کہ آپ طلبہ کے پڑھانے کے ایسے پابند تھے کہ ناواجب موقع پر بھی نہ چوکتے تھے، یعنے جب آپ طوائف کے ہاں ہوتے تھے، اس حالت میں بھی سبق پڑھانے میں دریغ نہ کرتے تھے، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے آپ ادیب بھی بہت بڑے تھے، اور شاعر بھی اعلیٰ درجہ کے تھے، یہاں تک کہ ان کے بہت سے قصائد عربیہ بے نقط دیکھے گئے ہیں، ان قصائد پر نظر کرنے سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے مصنف یا شاعر ایک غیر معمولی لیاقت کا شخص ہے اور اسے خداداد ذہانت اور تیز طبعی کا بہت بڑا حصہ ملا ہے، لیکن افسوس یہ ہے اکثر اشعار عرب کے روزمرہ سے گرے ہوئے ہیں، اور بعض نحوی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں، بایں ہمہ مضمون کی عمدگی مطالب کی درستی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ ہم یہاں ان اشعار کو لکھ کر دکھاتے مگر جب رسالہ تیرہ[1] صدی میں تمام حواشی (جو مولوی فضل حق صاحب نے منطقی کتب پر چڑھائے تھے، اور اشعار کی پوست کندہ کیفیت درج ہے اور جس کی ترتیب مولانا سید احمد صاحب رامپوری نے دی ہے پھر کیا ضرور ہے کہ ہم اپنے صفحے اس بحث میں سیاہ کریں جن اصحاب کو شوق ہو وہ اس رسالہ میں دیکھ سکتے ہیں بعض حواشی معقولی کتب پر عجیب وغریب قابلیت سے مولوی منطقی صاحب نے چڑھائے ہیں لیکن مولوی صاحب موصوف کی وقعت کو کم کرنے والا وہ نظارہ ہوگا، جب ان لاجواب حواشی کو دوسرے علماء کے حواشی کا مترادف پائیں گے اور جن سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک

---

[1] مولوی امیر احمد صاحب مرحوم نے مولوی فضل حق صاحب کی تصانیف (حواشی) اشعار وغیرہ پر تیرہ سو اعتراض کئے ہیں، اور اس رسالہ کا نام تیرہ صدی رکھا ہے، مولانا شبلی صاحب نعمانی نے ان کثیر التعداد اعتراضوں کا جواب دینا چاہا تھا مگر بن نہ پڑا۔

نے دوسرے کی نقل کر لی ہے۔

بہرحال ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولوی فضل حق صاحب اپنی عالی دماغی جودت طبع اور علوم عربی (معقولی) میں قابلیت تامہ رکھتے تھے، اور یہ بات تعریف کے قابل تھی کہ درسی کتابیں ریاضی و منطق و ہیئت کی ایسی ازبر تھیں کہ باوجود وہ اپنی دلربا کی طرف اپنی طبیعت مائل رکھتے پھر بھی اپنے نکتہ چین اور جھکّی شاگردوں کا اطمینان ہی کر دیتے تھے۔ یہ بات تعریف کے قابل ہے کہ مولوی صاحب موصوف کی جدت پسند طبیعت اور عالی دماغی نے اُنہیں زمرۂ علمائے دین میں پابند نہ رہنے دیا، بلکہ ان کی لاثانی معقولی قابلیت اور قانونی دماغ نے مجبور کیا کہ وہ ملازمت انگریزی کریں گو پہلے انہیں کوئی عہدہ ملا ہو لیکن آخر میں وہ سررشتہ دار بن گئے تھے۔

اور اس سررشتہ داری میں اُنہیں وہ دبدبہ اور شوکت و قوت حاصل تھی جو اس زمانہ میں ڈپٹی کمشنر کو ہے۔ آپ کے مکان پر اہل مقدمہ کا دربار لگا رہتا تھا اور زندگی نہایت عزت اور آرام سے بسر ہوتی تھی۔ بایں ہمہ یہ بات قابل مدح ہے۔ ہمارے منطقی مولوی سرکاری کاروبار کی اس کثرت پر بھی طلبہ کو پڑھاتے تھے، اور مفتی صدرالدین کی طرح اپنے خالی وقت کا کچھ نہ کچھ حصہ طلبہ پر قربان کر رکھا تھا۔

ان کی معاشرت پر ہمیں ضرور نہیں کہ ہم نکتہ چینی کریں کیونکہ وہ مولوی کے نام سے مشہور تھے، لیکن سرکار انگریزی کے ملازم بن کے انہوں نے اپنے کو دائرہ علماء سے خارج کر لیا تھا، جب مولانا شہید کے وعظ پر نئے نئے حاشیے یار لوگوں نے چڑھائے اور شہر میں خواہ مخواہ ایک تلاطم برپا ہوا تو منطقی صاحب بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور اُنہوں نے بھی اپنی سررشتہ داری کی اسٹیج پر شہید کی مخالفت کا ایک پارٹ ایکٹ کرنے کو پسند کیا۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے ہمارے دوست منطقی لوگوں کی افواہوں کا کہاں تک خیال تھا اور وہ عوام الناس کی بکواس کو کہاں تک صحیح جانتے تھے لیکن یہ افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ کو اپنی سرکاری قوت کی مخالفانہ آزمائش کا پہلا موقع شہیدؒ پر ملا جو یقیناً ان الزامات سے بالکل بری تھا جو اس پر قائم ہوئے تھے۔ نئی نئی تدبیریں ہونے لگیں، اور روزمرہ مشورے اس امر میں ہوئے کہ جس طرح ہو سکے

مولانا شہیدؒ کا دوسرا وعظ فقیری پر[1]

آپ نے معمولی آیت قرآنی پڑھنے کے بعد فرمایا:۔

اے مومنین میں آج آپ کو ایسی باتیں سناؤں گا جو حضرت رسول مقبولؐ کے فرمان اور تمہاری موجود حالتوں میں موازنہ کریں گی، موجودہ زمانہ میں عموماً لوگوں کی زبان پر یہ ہے کہ فلاں شخص فقیر ہے، اور فلاں صاحبِ کرامت ہے، ایک حضرات صوفیہ کا گروہ ہے جو دریائے فقر میں ڈوبا ہوا ہے اور ہزاروں اُن کے مُرید بھی ہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ ان کی فقیرانہ معاشرت پر حملہ کروں یا اس پر اپنی کچھ رائے دوں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں (اگر اللہ میری مدد کرے) کہ فقیر کی اصلی حالت تم پر بیان کردوں کہ ہادیٔ اسلام اور نیز خود خداوند تعالیٰ نے کس شخص کو فقیر گردانا ہے، اور کون کون سی صفتیں ایسی ہیں جو ایک فقیر میں ہونی لازمی ہیں۔

دراصل فقر حاجت کی چیز کے ہونے کا نام ہے اور بے حاجت کے ہونے کو فقر نہیں کہتے، اس سے معلوم ہوا کہ سوائے خداوند تعالےٰ کے ہر چیز فقیر ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے دوسرے وقت موجود ہونے کی حاجت ہے مگر میں تمہیں اس منطقی الجھاؤ میں پھنسانا نہیں چاہتا جو حقیقت فقر کی خدا و رسول نے بیان کی ہے وہ میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں تاکہ اس سے تم اصلی اور بناوٹی فقیر کے شناخت کرنے میں غلطی نہ کرو۔

نقیر جس کو دوسرے الفاظ میں ہم محتاج کہہ سکتے ہیں اپنے ساتھ ایک وسیع معنے رکھتا ہے۔ شریعت غرّا نے اس شخص کو فقیر تسلیم کیا ہے جو سوائے خدا کے سب سے بے نیاز ہو اور جو دوسروں کا محتاج ہو وہ ہرگز فقیر کے لقب سے پکارے جانے کا مستحق نہیں ہے، (جزاک اللہ فی الدارین خیراً، ایک جوشیلی آواز سامعین میں سے آئی) مگر بھائیو یاد رکھو! ایسی فقیری سے جو دوسروں کا محتاج بنادے خود رسول مقبولؐ نے بھی پناہ مانگی ہے، جہاں آپ ارشاد کرتے ہیں اعوذ بک من الفقر، یعنی مفلسی سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ دوسری حدیث اور بھی ان ہی گرم الفاظ میں آئی ہے۔ کاد الفقر ان یکون کفراً[2]۔ قریب ہے کہ فقیری کفر ہو

---

[1] تذکرہ مشاہیر دہلی جلد ۲ صفحہ ۱۱۱ و تواریخ علمائے دہلی صفحہ ۱۲۳ [2] ترمذی بروایت انس حاکم بروایت ابو سعید۔ ۱۲ منہ

آیا اس قسم کے بنے ہوئے فقیر بھی اپنے کو اپنے معتقدوں سے ایسا منوانا چاہتے ہیں اور اپنے کو ان صفات سے جو خدا اور رسول کے لئے خاص ہوگئی ہیں شہرت دینا چاہتے ہیں یا یہ مضمون ہے کہ پیران نمی پرند و مریدان می پرانند ہیں ان کی نسبت اپنی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرتا، دل کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے مگر ان کی ظاہراً معاشرت اس طرح خیال کرنے میں مدد دیتی ہے کہ انہوں نے جو جو کچھ باتوں کے ہنگڑے بنا دیتے ہیں اور جس طرح وہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اس سے صاف یہ اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو ولی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ منوانا چاہتے ہیں وہ کسی مقبرہ میں یا کسی پیر شہید کی قبر پر گیروا کپڑے پہن پہن کے بیٹھے رہتے ہیں بظاہر لوگوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کھاتے اور شب و روز روزہ سے گزارتے ہیں مگر ان کی توانائی اور چاق و چست رہنے میں کوئی فرق نہیں آتا، ان کے یہ کرتب محض جاہلوں کو دھوکا دینے اور فریب میں پھنسانے کے ہوتے ہیں، شعارِ اسلام سے اے بھائی مسلمانو! اُن کی یہ باتیں بہت مستبعد ہیں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ایسوں سے جہاں تک تم سے ہو سکے اپنا دین و ایمان بچاؤ۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

ان کی صحبت بظاہر خوش اور سعید معلوم ہوتی ہے لیکن ان کا زہریلا اثر نہ صرف تمہارے مالوں کو زہر آلود بنا دے گا بلکہ تمہارے دین کو بھی ایسی سخت مضرت پہنچے گی کہ تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔

اگر میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی کہوں تو الٹا میرے مُنہ پر مارو، چونکہ تم مسلمان ہو اور تمہارا ایمان حدیث و قرآن پر ہے، اس لئے جو کچھ میں کہوں گا ان ہی دو مقدس مجموعوں سے کہوں گا، اور جسے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے تمہارا فرض ہوگا کہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرو۔ لو سنو! خدا تعالٰے کس فقیر کی شان میں ارشاد کرتا ہے، اور کس فقیری کی فضیلت بتاتا ہے۔

للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون — یعنی وہ مہاجر فقیر جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے ڈھونڈنے آئے ہیں اللہ کا فضل

حقیقت میں رسول مقبول نے کیا خوب فرمایا ہے " طوبیٰ لمن ھدی الی الاسلام و کان عیشہ کفافاو قنع بہ " یعنے خوشحالی ہو اس کو جو ہدایت کیا گیا ہو اسلام کی طرف اور اس کی معیشت بقدر گزران ہو اور اسی پر قانع ہو۔ پھر نبی نے خود فقیروں کی طرف مخاطب ہو کے یہ ارشاد کیا " یامعشر الفقراء اعطوا اللہ الرضی من قلوبکم تظفروا بثواب فقرکم والافلا " یعنے اے فقیروں کے گروہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اپنے دلوں سے کرو کہ تمہیں تمہارے فقر کا ثواب ملے ورنہ نہیں ملے گا۔"

کیا خدا کی رضا جوئی اسی میں ہے کہ ہم اپنے کو ولی کے نام سے شہرت دیں، اور لوگوں کو نجاتِ آخرت دلوانے کا ٹھیکہ لے لیں، تمام جہان کے مال کو ہڑپ کر جائیں، اور ہر وقت یہ نگاہ ہو کہ لوگ ہمارے جال میں آکے پھنسے، اولیاء اللہ کی قبور پر جا کے خود بھی اپنی حاجتیں طلب کریں، اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی گمراہ کریں، یا مولانا روم کی مثنوی خوش آوازی سے پڑھنے کا نام فقیری اور اس کا بھائی تصوف ہے، کیا خوبرو مردوں کے گانے پر تھرکنے کا نام فقیری رکھا ہے، کیا ان لمبی لمبی زلفوں میں ولایت گھسی ہوئی ہے، کیا یہ ٹیڑھا بڑنگا عصا عصائے موسیٰ کا حکم رکھتا ہے، کیا اسی کو عین اسلام کہتے ہیں، کیا یہی فرمودۂ خدا و رسول ہے۔ توبہ کرو اللہ سے اپنی مغفرت چاہو اور جو کچھ کر چکے ہو اس سے باز آؤ، اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہ مادر گہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اگر کوئی دنیادار ہوس دنیا میں مبتلا ہو تو اس قدر قابل نفرین نہیں لیکن وہ شخص یا وہ گروہ جو تارک الدنیا مشہور ہو۔ اور پھر حرام و حلال کی شناخت نہ کر کے دنیا کمانے میں محو ہو جائے وہ کس قدر قابل نفرین ہے لیکن میں کہتا ہوں اے مسلمانو تم ان کے لئے دعا کرو کہ خدا ان پر رحم کرے، حقیقت میں وہ لوگ قابل نفرین نہیں ہیں بلکہ لائق رحم ہیں، بڑا قہر یہ ہے کہ ایسے لوگ جنہوں نے جاہلوں کی نگاہ میں اپنا ظاہر درست بنایا ہے بہ نسبت خدا پرستوں کے زیادہ پوجے جاتے ہیں، ضعف اسلام کی تمہارے دلوں میں ایک یہی بڑی نشانی ہے حقیقت یہ ہے

کہ ان لوگوں سے ایک چھٹا ہوا رند ہزار درجہ بہتر ہے جو برملا بازار میں کھڑے ہو کے شراب پیئے اور کسی کے کوٹھے پر جاوے، کیونکہ اس کو اس خرابی میں بتلا دیکھ کے کوئی بھی اس کی طرف رجوع نہ ہوگا نہ اس کی تقلید کسی فعل میں کرے گا، بلکہ اسے سخت حقارت کی نظر سے دیکھے گا، اس لئے جو گناہ وہ کرتا ہے اس میں صرف اسی کی ذات کو مضرت پہنچتی ہے مگر ایسا شخص جو لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے اپنا ظاہر درست کرے، پانچ وقت کی نماز اس کی ناغہ نہ ہو، وظیفہ وظائف کا ہر دم چرچا رکھے، اور اللہ ہو کے سوا دوسرا لفظ نہ کہے، خوب سمجھ لو کہ ایسا شخص بھولے بھالے مسلمانوں کے حق میں کالا ناگ ہے، جس کا کاٹا کبھی نہیں بچ سکتا، فقط۔

مولانا شہید کا یہ وعظ تو بہت بڑا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ آگے کے ورقے اس وعظ کے جو ان کے منشی ہیرالال کے ہاتھ کے لکھے ہوتے ہیں گم ہو گئے، اور پھر کئی ورق کے بعد مطلب شروع ہوا ہے، لیکن ایسے کرم خوردہ اوراق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید فقیری اُو تصوف پر دیا تھا ایک ٹکڑا نقل کر دیا گو مجھے لفظ بلفظ نقل کرنے کا تو فخر حاصل نہیں ہوا، پھر بھی یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس بیداشت ردّی میں سے میں نے مولانا شہید کے وعظ کی عبارت اور کسی قدر جملوں اور الفاظ کا ہیر پھیر کر کے مفہوم پورا ادا کر دیا۔ الفاظ غیر مانوس ہونے کی وجہ سے بدلے گئے، ورنہ ایسا تبادلہ نہیں کیا ہے کہ جس سے مطالب میں کچھ فرق آوے اور مفہوم بدل جائے، اول تو لکھنے والا کالیستہ، دوسرے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ، تیسری جلدی میں لکھنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ ہی اُردو عبارت بلفظہا نقل کر دی جائے تو ناظرین کی کیا سمجھ میں آئے، اور مولانا شہید کا مفہوم کیونکر ادا ہو، ہاں اس کے مقابل مولوی اسماعیل صاحب کے جو نامے یا خطوط دستخطی ہمارے ہاتھ لگے ہیں وہ ہم ضرور بعینہ نقل کریں گے، اس میں ایک لفظ کا بھی تغیر و تبدل نہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے دلیوں صوفیوں اور فقیروں کو سلام ہے جو نفس کے بندے ہو گئے مال جمع کرنے کی دُھن میں لوگوں کو ٹھگتے پھرتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر مطلق قناعت نہیں کرتے، نا خدا ترسی سے ناواقفوں کا اپنے مکر کی اُلٹی چھری سے گلا کاٹتے ہیں اور اُف نہیں کرتے کبھی نبی کو خواب میں بلا لیتے ہیں، اور کبھی خدا کو اپنے میں بلوا دیتے

پانچواں باب

گورنمنٹ انگریزی کی انصاف پسندی، سرکار انگریزی کی طرف سے وعظ کی ممانعت، مولانا شہید کی رزیڈنٹ سے ملاقات اور وعظ کا حکم!

پہلے اس کے کہ ہم سنگین دشمنی کا تذکرہ کریں جو شہر دہلی کے عوام الناس نے پیارے شہید سے برتی تھی، مختصر طور پر سرکار انگریزی کی انصاف پسند کارروائی کا ذکر کر دیتے ہیں۔

لارڈ لیک نے جب ۱۸۰۳ء میں دہلی فتح کی تو شاہ اور اہل شہر کو مرہٹوں کی جابرانہ قید سے رہائی دلوائی۔ مرہٹوں کا دہلی پر قبضہ دہلی کے لئے بدفالی کا دیباچہ تھا۔ جب شاہ کی بے عزتی کی جاتی تھی تو روسائے دہلی کی کیا خاک عزت ان کی نگاہ میں ہوتی۔ عدالتیں اوندھی پڑی ہوئی تھیں، اور کوئی قانونی کارروائی مطلق نہ ہوتی. مرہٹہ اگر کسی کو بے جا ستاتا تھا تو کوئی دریافت کرنے والا نہ تھا، نہ اس کے لئے فوجداری کی عدالتیں تھیں، اور نہ کوئی داد رسی کی کورٹ تھی، چاروں طرف ظلم اور زبردستی کی حکومت تھی، یہی نہ تھا کہ مسلمان ہی ستائے جاتے ہوں بلکہ ہندو بھی سخت نالاں تھے۔

دکانیں معمولی گفت وشنید پر لوٹ لی جاتی تھیں، اور دکاندار کسی سے فریاد نہ کر سکتا تھا. حمیدالدین عراقی لکھتا ہے کہ میں چاندنی چوک میں جا رہا تھا کہ ایک مرہٹہ سوار نے ایک بزاز سے ڈھاکے کی ململ کا تھان مانگا، اس نے مفت دے دینے سے انکار کیا، فوراً اس کے انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی مشکیں باندھ لی گئیں، اور اس کی دکان میں آگ دے دی گئی، کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ شاہی خاندان کا ممبر سر بازار مرہٹہ کے ہاتھ کے کوڑے نہ کھائے۔

فاضل عراقی کے یہ واقعی چشم دید ہیں، اس سے زیادہ یہ نظارہ قابل ماتم ہوگا کہ مرہٹوں کے زمانہ میں ڈولیوں کی رسم بالکل جاتی رہی تھی، شرفا کی مستورات نے باہم ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا کیا ممکن تھا کہ کوئی شریف زادی ڈولی میں نکلے، اور بسلامتی اپنے گھر پہنچے۔ نئے نئے وزن اور سکوں کی گوناگونی نے تجارت کو بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا، گیہوں بے شک روپیہ کے دو تین من ہوگئے تھے، لیکن یہ سستا سماں اس لئے زیادہ فائدہ بخش نہ تھا کہ مفلسی نے لوگوں کو گھیر لیا تھا نوکری عنقا صفت ہوگئی تھی، اور مسلمانوں کی بربادی کی پوری تدبیریں کی جاتی تھیں جب یہ کیفیت ہوئی تو ناچار نابینا شاہ دہلی نے انگریزوں کے اپنے کو سپرد کیا اور التجا کی کہ آپ ہمیں آکے پناہ دیں۔ مرہٹوں نے ہمارا ستیاناس کر دیا ہے، درخواست پر لارڈ لیک فوج لے کے بڑھے اور معمولی جنگوں کے بعد بیدھڑک دہلی پر قابض ہوگئے یہ تاریخ عروج دہلی کی شمار کرنی چاہیئے۔ سرکار انگریزی نے شاہ کے قدیمی حقوق بحال کر دئے۔ اور جو درباری توقیر ایک خود مختار حکمراں کی طرف سے خود مختار شاہ کی کی جاتی ہے بہت فراخ دلی سے کی گئی۔

انصاف کی عدالتیں کھل گئیں، اور ملازمت کو وسعت دی گئی۔ بعد ازاں اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے، ان کی بھی ایک بیش قرار تنخواہ اور چند علاقے کوٹ قاسم وغیرہ بجا رکھے گئے، شہر میں بھی گہما گہمی ہوگئی اور قلعہ میں بھی رونق نظر آنے لگی، شاہ کی سفارش اور کہنے کا بہت کچھ پاس و لحاظ کیا جاتا تھا، تاہم شہر کا انتظام سرکار کمپنی کے سپرد تھا، اور وہ اس کے ذمہ دار بھی تھی، لائق مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہونے لگے، اور عموماً مقدمات کا فیصلہ ان ہی کی رائے پر ہوتا تھا، ہر مذہب کو آزادی تھی، وعظ خوب دھڑاکے سے کئے جاتے تھے، اور سرکار کمپنی کی طرف سے ذرا بھی مزاحمت نہ ہوتی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کوئی کارروائی ایسی نہ ہو، جس سے امن میں خلل پڑنے کا خوف ہو۔

یہی زمانہ گویا مولانا شہید کی ریفارمیشن کا آغاز تھا، اور یہی زمانہ اس تلخ تر دشمنی کا تھا جو خواہ نخواہ حاسد مولانا سے کرتے تھے، جب مختلف مضامین پر وعظ ہوئے تو لوگوں میں جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں ایک شورش سی پھیل گئی، اور چاروں طرف ایک دند مچ گیا، بھلا وہ تو

مدت سے مختلف پیروں، شہیدوں، سیتلا ماتا کے پوجنے کے عادی تھے، انہیں اکیلے خدا کی
پرستش کا ہے کو اچھی معلوم ہوتی وہ بھڑکتے بھڑکتے مولانا شہید کے تقریری کے وعظ سے
پورے بھڑک اٹھے، اور اب انہوں نے عدالت کی طرف رجوع کرنا شروع کیا، کیونکہ اکبر شاہ
کی طرف سے تو صاف جواب مل چکا تھا۔ مگر عدالت میں جانے سے پہلے انہیں ضرور ہوا کہ
وہ مولوی فضل حق صاحب سے مشورہ کر لیں کہ کیا تدبیر کرنی چاہیئے۔ مولوی منطقی صاحب رزیڈنٹ
کے بڑے منہ چڑھے اور معتبر تھے، اور وہ ان ہی کے کہنے پر زیادہ چلتا تھا، جب یہ لوگ
سرشتہ دار صاحب کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کے کہنے لگے کہ
اسمٰعیل دین محمدی کی بیخ کنی کئے بغیر نہیں رہنے کا۔ یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو
انہوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا، عوام الناس نے پھر یہ فریاد کی کہ وہ صوفیوں
کو برملا گالیاں دیتے ہیں، اور ہم سنتے ہیں کیا کریں آپ کچھ مدد کریں ورنہ سارے مسلمان
اس پر آمادہ ہیں کہ شہر سے جلا وطن ہو جائیں۔

مولوی فضل حق صاحب پہلے ہی شہید کی طرف سے خون کے گھونٹ پی رہے تھے
اور دانت پیس رہے تھے، انہیں اپنی کامیابی کی یہ فال نیک معلوم ہوئی، اور انہوں نے
فوراً اپنے منشی سے ایک عرضی عام مسلمانوں کی ناراضی کی صاحب رزیڈنٹ کو لکھوائی اور
اس پر پندرہ سو دستخط کرائے اور وہ عرضی رزیڈنٹ کو ان الفاظ میں کہہ کے دی:۔

"حضور میں کئی بار عرض کر چکا تھا، آپ نے توجہ مبذول نہیں فرمائی، دیکھئے معاملہ طول
پکڑتا جاتا ہے کیا عجب ہے کہ ذرا سی بے توجہی پر فوجی قوت کی بلوہ دفعہ کرنے کے لئے
ضرورت ہو۔ اس عرضی میں جس پر پندرہ سو مسلمانوں کے دستخط ہیں صرف مولوی اسمٰعیل کے
وعظ کو بالکل روک دینے کی التجا کی گئی ہے، اب حضور کو اختیار ہے چاہے جو کچھ اس میں
کارروائی کریں۔"

یہ سنتے ہی رزیڈنٹ کے ہوش اڑ گئے، اور اس نے اس عرضی کو کئی کئی بار بغور دیکھا اور
یہ الفاظ زبان پر لایا:۔

تعجب ہے شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا ایسا فسادی ہو، مولوی فضل حق صاحب نے دوسری

تدبیر یہ کی تھی کہ سو پچاس آدمی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور انہیں سکھا دیا تھا کہ جس وقت صاحب نیچے کی طرف دیکھیں تم واویلا و بکا کرنا اور جو کچھ تمہیں بیان کرنا ہوگا اس میں چوکنا نہیں، غرض یہی ہوا مولوی منطقی صاحب کی مراد بر آئی، اور کوتوال کے نام حکم بھیج دیا گیا کہ آئندہ سے مولوی اسمٰعیل صاحب وعظ نہ کہنے پائیں، ادھر خود مولانا شہید کے پاس بھی ایک حکم نامہ بھیج دیا کہ تمہیں سرکار کمپنی کے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی، اور تمہارے وعظ سے چونکہ امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے، اس لئے روک دیا گیا تا حکم ثانی تم عام طور پر وعظ نہیں کہہ سکتے۔

برق انداز نے یہ حکم نامہ رزیڈنٹ کی طرف سے مولانا شہید کو دیا، آپ نے خاموشی سے اس فرمان کو لے لیا، اور کچھ نہ کہا۔ آپ کے معتقدین پریشان و خستہ آپ کے پاس آنے لگے اور سخت افسوس کرنے لگے، مگر اس سے چارہ ہی کیا تھا، اور گورنمنٹ کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔

اصلی کارروائی تو یہ تھی جو لکھی گئی، لیکن شہر میں عجیب عجیب افواہیں اڑ رہی تھیں کوئی کہتا تھا کہ مولانا اسمٰعیل قید ہوگئے، کوئی کہتا تھا کہ انہیں جلاوطن کرنے کا حکم ہوا ہے، کوئی کہتا تھا انہیں پھانسی دی جائے گی، کوئی یہ ہانکتا تھا کہ ان کا گھر بار ضبط کرنے کے لئے برق انداز گئے ہیں۔ غرض دشمنوں نے خوب خوب اپنے جلے پھپھولے پھوڑے، اور سوائے زہر اگلنے اور بے بنیاد گپوں کے انہیں اور کچھ بن نہ پڑا۔ ملاّ کی دوڑ مسجد تک مثل مشہور ہے۔ فضل حق نے صرف جو کچھ ہونا تھا وہ کر چکے تھے اور شہر والوں سے جتنی مخالفت ہو سکتی تھی انہوں نے کوئی کمی نہ رکھی تھی۔

چالیس دن تک وعظ بند رہا، آپ کے دوستوں نے مختلف مشورے دئے کہ یہ کرو اور یوں رزیڈنٹ کے پاس سفارش پہنچاؤ۔ لیکن آپ نے ایک نہ سنی اور فرمایا خدا خود اپنے دین کی حفاظت کرے گا، مجھ سے زیادہ اُسے فکر ہوگی۔

بڑے بڑے رئیس جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے معتقدین میں سے تھے، خواہ شیعہ ہوں یا سنی آ آ کے سمجھانے لگے کہ آپ اپنے بھتیجے کو روکئے، یہ بڑی بدنامی کی بات ہے۔ شاہ صاحب

سب کو یہی جواب دیتے تھے جب تک اسماعیل سے خلاف شریعت امر سرزد نہ ہو میں کیوں کر اسے روک سکتا ہوں، وہ کوئی فساد انگیز تقریر نہیں کرتا کہ اس پر میں معترض ہوں، آخر کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیئے، جس سے میں اس کی کارروائی میں دست اندازی کرسکوں۔

جب اعیان شہر شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ جواب پاتے تھے تو اپنا سا منہ لے کے چلے جاتے تھے۔

سوائے وعظ تعلیم و تعلم کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا اور اسے کوئی روک نہ سکتا تھا شاہ اسمٰعیل صاحب کو اپنے وعظ کے بند ہو جانے کا اس لئے اور بھی زیادہ تلق تھا کہ مسلمان پھر اسی شرک و بدعت میں پھنس جائیں گے، جس سے انہیں کسی قدر نفرت دلائی ہے، اور دوسرے اس امر کا قلق تھا کہ میری ضد سے لوگ اور بھی شرک و بدعت کرنے لگیں گے، یہ تمام خیالات ایسے زبردست تھے جن میں ذرا بھی کلام نہیں ہو سکتا مگر مجبوری تھی خدا کو یہی منظور تھا کہ علاوہ اور ستائے جانے کے پیارا شہید اس فانی کشمکش میں پھنسے اور پلنگ پر سینکڑوں کروٹیں بے چینی کی حالت میں بدلتا رہے۔

آخر سوچتے سوچتے شاہ اسمٰعیل صاحب نے اسی وجہ پر ریذیڈنٹ کو لکھ کے بھیجی اور ثابت کیا کہ اگر میرا وعظ بند رہے گا تو یہ یہ خرابی واقع ہوگی۔ جوں ہی رزیڈنٹ نے پیارے شہید کی درخواست کو پڑھا آنکھیں کھل گئیں، اور قدرتی طور پر اس کو پیارے شہید کی تحریر کا بغیر کسی شہادت کے ایسا یقین ہو گیا کہ فوراً سررشتہ دار صاحب طلب کئے گئے جوں ہی وہ حاضر ہوئے، رزیڈنٹ نے یہ کہا بڑے افسوس کی بات ہے مولوی فضل حق صاحب کہ آپ نے چالیس دن تک شاہ اسمٰعیل صاحب کا وعظ بند رکھا، میری رائے میں یہ بالکل غلط کارروائی ہوئی ہے، اور ایسے بڑے مولوی کے ساتھ ناجائز برتاؤ کیا گیا ہے، ابھی حکم لکھ دو کہ وعظ کھولا جائے اور جو کوئی مزاحم ہوگا اُسے قانوناً سزا دی جائے گی، یہ سنتے ہی مولوی منطقی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، پیروں نیچے سے زمین نکل گئی اور ادھر اُدھر ہکا بکا تکنے لگے۔

اب یہ تو مجال تھی نہیں کہ رزیڈنٹ کی کچھ تردید کرتے اور اسے اونچ نیچ سمجھاتے بہکاتے

اب فریب دینے کا زمانہ جاتا رہا تھا، رزیڈنٹ نے بعد ازاں کوتوال کے نام دوسرا حکم جاری کیا، اور لطف یہ ہے کہ مولوی منطقی صاحب ہی نے وہ حکم لکھا۔ ایک معافی نامہ لکھ لیا تو گیا اور اُس پر دستخط بھی ہو گئے لیکن بدقسمتی سے مولوی فضل حق صاحب نے اپنے بستہ ہی میں دبا لیا اور اُسے جاری نہ کیا۔

اس فرو مایہ روح سے ناظر اس قہرناک دشمنی کا اندازہ کر سکتا ہے جو منطقی صاحب علی التواتر بے گناہ شہید سے کر رہے تھے، اور لطف یہ تھا کہ ابھی تک کوئی جواب پیارے شہید کی طرف سے نہ دیا گیا تھا، ورنہ یہ ناممکن تھا جس نے اپنی بہادری سے پشاور اور قندھار سکھوں سے چھین لیا تھا وہ منطقی صاحب کو دنداں شکن جواب نہ دے سکتا تھا مگر نہیں صبر اور تحمل اس عظیم الشان اصلاح کی کتاب کا دیباچہ تھا جسے وہ لوگوں میں سُنانا چاہتا تھا، اور اس بڑے کام کے لئے سنجیدگی متانت مخالفین کے طعنوں سے بے پروائی۔ محتاط طبیعت لازمی بلکہ فرض تھی، جیسی اخلاق کی وسعت کی ضرورت تھی، اسی قدر دشمنوں کی گالیاں سہنے کا عادی ہونا بھی لابُد تھا۔

یہ سب صفتیں مولانا شہید نے اپنے میں دیکھ لی تھیں جب اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھایا تھا، جس کی نظیر ہندوستان میں مذہب اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مولانا شہید کی تقریر اور تحریر میں فطرتی بہت اثر تھا، اور ساتھ ہی اس کے درخواست دینے پر آپ کو یقین ہی تھا کہ ضرور مجھے سرکار کمپنی کی طرف سے وعظ کہنے کا حکم ہو جائے گا مگر جب تین چار روز گزر گئے تو آپ کو بڑا تردد ہوا کہ ہاں نا کا کچھ جواب نہیں آیا، خیال بھی درست تھا اگر انکار ہوتا اور پہلا حکم بحال رکھا جاتا تو معلوم ہو جاتا، اور جو پہلا حکم منسوخ کر دیا جاتا تو یہ لازم تھا کہ فوراً ہی اطلاع دی جاتی۔ اس تردد کو مٹانے کے لئے آخر شاہ صاحب نے یہ ارادہ کیا کہ خود رزیڈنٹ سے ملیں اور اس سے گفتگو کریں تاکہ یہ تردد دور ہو۔

آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے سیدھے کوٹھی پر پہنچے، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمت گار تھا، پہلے آپ نے جا کے اطلاع کرائی،

جوں ہی رزیڈنٹ نے سُنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں فوراً باہر نکل آیا، اور باہر برانڈے سے آگے لے گیا، حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا۔

معمولی مزاج پرسی کے بعد رزیڈنٹ نے فوراً یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب ہمارے سررشتہ دار کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے نوجیہی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو غالباً آپ وعظ فرماتے ہوں گے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب نے اس حکم سے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی، اس پر وہ حیران ہوا اور اس نے تیزی سے یہ کہا، شاید آج چھٹا روز ہے کہ اس حکم ثانی کے صادر ہونے کا میں قطعی حکم دے چکا ہوں کیا وجہ ہے کہ فضل نے اس کی تعمیل نہیں کی، شاہ صاحب نے فرمایا جو دستخطی عرضی میرے خلاف گزری تھی، اس کی سچائی کا مولوی فضل حق صاحب کی اس بے نظیر عداوت سے اندازہ ہو سکتا ہے فوراً ایک برق انداز روانہ کیا گیا کہ بہت جلد فضل حق کو لائے، چنانچہ منطقی صاحب تشریف لائے، اور شاہ صاحب کی صورت دیکھتے ہی تن بدن میں رعشہ پڑ گیا اور سمجھ گئے کہ آج خیر نہیں ہے۔

ہم یہاں اس ناملائم زجر و توبیخ کو نہیں لکھتے جو رزیڈنٹ نے منطقی صاحب کی کی، صرف ناظر ہی کے اندازہ اور جانچ پر چھوڑا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ فضل حق صاحب تین مہینے کے لئے معطل کئے گئے، اور وہ دونوں احکام فوراً جاری ہو گئے۔

گو پیارے شہید کو اپنے دوست مولوی منطق کے معطل ہونے کا صدمہ تو ہوا لیکن وہ کر ہی کیا سکتے تھے، گو سفارش کا ارادہ کیا لیکن ایسی التجا کرنی اپنی شان کے خلاف جانی، اور آپ اُٹھ کے وہاں سے چلے آئے، رزیڈنٹ صاحب نے اسی عزت اور تپاک سے رخصت کیا۔ یہ موقع ہمارے منطقی صاحب کا حد سے زیادہ ذلت کا تھا، علاوہ ناکامی کے ان کا معطل ہونا ان کی پارٹی پر اور بھی غضب ہوا۔ ہر چند اُنہوں نے سفارشیں پہنچائیں اور اپنے بحال ہونے کی کوشش کی، لیکن کچھ بھی نہ ہوا، ناچار انہیں تین مہینے کے لئے شہر چھوڑنا پڑا، اور وہ سیدھے رام پور چلے گئے، ان کی پارٹی نے تو مولانا شہید رح

کے جلا وطن ہونے کی جھوٹی خبر اڑائی تھی لیکن اُن کا لیڈر سچ مچ بے چارہ شہر چھوڑ کر چلا گیا۔

یہ بھی خدا کی بہت بڑی حکمت تھی، حقیقت میں وہ ہی اپنے کاموں کے بھیدوں سے خوب واقف ہے جیسا کہ ۱۸۵۷ء کا غدر انگریزوں کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ اسی طرح مولانا شہید کا چالیس دن وعظ بند رہنا اُن کے لئے کیمیا بن گیا، شہر میں عوام الناس کی شورش بھی دھیمی پڑ گئی، اور اب اتنی مخالفت بھی نہ رہی بایں ہمہ لوگ اب بھی دانت پیستے تھے، اور رستوں میں مولانا شہید پر پھبتیاں اُڑتی تھیں، ڈھیلے پھینکے جاتے تھے، اور گالیاں دی جاتی تھیں، مگر یہ تمام باتیں محض کم ظرفی کی تھیں اور وہ ہی معمولی تھیں کہ جو ریفارمروں کے ساتھ عوام الناس کیا کرتے ہیں، ہاں ان باتوں کا سہارنا بے شک بڑا کام اور سہارنے والے کی کامیابی کا دیباچہ ہے۔

یہ واقعہ ایک ایسا تھا جس سے شہر میں تہلکہ پڑ گیا اور سب کی رنگتیں فق ہو گئیں، اب یہ اُڑنے لگا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب نے رزیڈنٹ پر جادو کر دیا ہے، کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ رائے زنی کرتا تھا، ساتھ ہی اس کے میاں فضل حق کی اس فاش شکست سے ایک یہ بھی اثر ہوا کہ لوگ کچھ ٹوٹ ٹوٹ کے ادھر آنے لگے، اور باہم ہر جگہ گفتگو ہونے لگی۔

جوں ہی مولانا صاحب گھر میں تشریف لائے سب نے آپ کو مبارک باد دی، اور مرحبا صد مرحبا کے نعرے بلند ہوئے، پھول برسائے گئے اور خوشیاں منائی گئیں۔

یہ سال ۳۲ واں مولانا شہید کو تھا، اس سن و سال کا بچہ جب اس پایہ کا ہو تو کیا خیال کیا جا سکتا ہے، سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کی اصلاح کی گارنٹی روز ازل ہی سے پیارے شہید سے ہو گئی تھی اور یہ ناممکن ہے کہ کیسا ہی فاضل شخص ہو جب بھی اتنی سی عمر میں اپنے ہم چشموں پر اثر نہیں ڈال سکتا۔

جو الزامات کہ مولانا شہید پر لگائے گئے تھے، پہلے ان کے ازالہ کی فکر کرنی تھی گو یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ محض جھوٹے اور غلط تھے ساتھ ہی اس کے مولوی اسمٰعیل صاحب

کا فرض تھا کہ وہ عام جلسوں میں ان اتہامات کو اپنے اوپر سے اٹھا دیں اور لوگوں کو بدگمانی کا رستہ نہ دیں۔

یہ زیادہ تعجب سے دیکھا جائے گا کہ آپ کے وعظوں کی اتنی دھوم مچی کہ مخالفین بھی جوق جوق آنے لگے، مجموعہ واقعات والا خود اپنے کانوں سے سنا ہوا ایک بوڑھے کا قول نقل کرتا ہے، جو دھوپ میں لکڑی ٹیکے ہوئے زور زور چلا جا رہا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا خدا کرے میں وعظ شروع ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں، ایک بچہ اس کے ساتھ تھا جو غالباً اس کا پوتا معلوم ہوتا تھا لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ اس کا بیٹا ہے، کیونکہ بوڑھے کے جلدی چلنے پر اس نے یہ کہا، ابا جان رات کو تو پڑے ہوئے دعا مانگ رہے تھے کہ خدا اسماعیل کے وعظ میں نہ لے جائے مگر اب اتنی جلدی چل رہے ہو کہتے ہو کہیں وعظ شروع نہ ہو گیا ہو، یہ کیا بات ہے، بوڑھے نے جواب دیا سعید یہ تو سچ کہتا ہے لیکن میں کیا کروں جب وعظ کا وقت ہوتا ہے تو از خود دل اچٹتا ہے، گھڑی بھر بھی صبر نہیں ہوتا پھر وہ بچہ کہنے لگا آپ تو کہتے تھے کہ وہ ہم لوگوں کو گالیاں دیتا ہے، بوڑھے نے چٹخارے بھر کے کہا یہ اُسی کی گالیوں میں تو مزا ہے کہ پیٹ ہی نہیں بھرتا اور سننے کو جی چاہتا ہے، مجموعہ واقعات والے کے اس قول سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مخالفین کی زبان پر بھی آپ کے پُرتاثیر کلمات کے چسکے موجود تھے۔ پہلا الزام جو مولانا پر قائم کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ ائمۂ دین کی عزت نہیں کرتے، خصوصاً امام ابوحنیفہ صاحب کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ اہل تصوف اور اولیاء کی مطلق پروا نہیں کرتے بلکہ اُنہیں بُرا بتاتے ہیں، تیسرا الزام یہ تھا کہ نبی کو بے حقیقت (معاذاللہ) جانتے ہیں چوتھا الزام یہ تھا کہ تقلید امام اعظم کو حرام بتاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی نکتہ چینیاں اور افتراء پردازیاں تھیں جو آپ کی پاک ذات پر عائد کی جاتی تھیں۔ سب سے پہلے مولانا شہید نے اپنا یہ فرض کہ وہ ان چاروں الزامات کو اپنے پر سے اٹھا دیں، اور عوام الناس کی شورش اور غلط فہمی کو بالکل مٹا دیں۔

ہم آئندہ بابوں میں ان معاملات پر پوری بحث کریں گے ہمیں افسوس ہے کہ وہ وعظ

جو مولانا شہید نے ان خاص مضامین پر فرمائے ہمیں بجنسہ نہیں ملے لیکن یہ ضرور ثابت ہے کہ وہ تحریر کئے گئے، کیوں کہ منشی ہیرالال کے بہت سے پراگندہ کاغذ ایسے ہیں جن سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ پھر بھی ہمیں آپ کی تصنیفات سے آپ کے خیالات اور دینی عقائد کا جو علم ہوا ہے، اس کے وسیلہ سے ہم ان مضامین پر جنہیں اب تک اکثر اصحاب نے صرف غلط فہمی اور زیادہ تر پارٹی فیلنگ کی وجہ سے تسلیم کر رکھا ہے بسیط بحث میں ادا کریں اور سمجھا دیں کہ وہ سچا دین دار تھا، اور اس پر کسی قسم کی بدگمانی کرنا دین و دنیا میں اپنا کالا منہ کرنا ہے۔

چھٹا باب

مولانا شہیدؒ کی متواتر کامیابیاں

مرتبع خلاف شرع امور میں اصلاح

یہ صحیح ہے کہ حق کو کہیں زوال نہیں ہوتا، گو چند روز کے لئے کذب چمک جاتا ہے اور کوتاہ بینوں کو یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس چمک میں صدق کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن نہیں بعد ازاں اس کی چند روزہ زندگی خود بخود اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ناحق کو فنا ہے، اور حق کو فنا نہیں اگر اسے سات پردوں میں بھی بند کر دگے جب بھی اس کا جلوہ وہیں سے دکھائی دے گا۔ لاکھ چاند پر خاک ڈالو پھر بھی کچھ نہیں ہوتا کوئی چاہے کہ خاک ڈال کے اُسے میلا کر لے یہ ناممکن ہے۔

ہزاروں ریفارمر دنیا میں ہر ملک اور قوم میں پیدا ہوئے، ان کے ساتھ ہی زیادتیاں کی گئیں جو پیارے شہیدؒ کے ساتھ دہلی میں ہوئیں مگر وہ ارادے کے پورے اپنے کام میں مستعد رہے، اور انہوں نے وہ بیج بویا جو پودہ بنا اور وہ پھلا پھولا اور اسی کا ہم آج پھل کھا رہے ہیں۔ نبی عربیؐ پر جو مظالم بُت پرستوں نے توڑے تھے، اس کی نظیر تمام دنیا کی تواریخ میں نہیں ہے، طائف میں کمینہ آدمیوں کا آپ پر سنگ باری کرنا اور آپ کا زخمی ہو کے مکہ واپس چلا آنا۔ بار بار پیارے شہیدؒ کے دل کو مخالفین کی بیجا بیجا سختیاں سہنی، اور اُف نہ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ ابن اسحٰق کا قول ہے، "اگر کوئی شخص ناکامی میں بھی کوشش کئے جائے گا اور جی نہ ہارے گا تو آخر وہ ناکامی بھی کامیابی کی صورت میں بدل جائے گی خدا نے قرآن میں خود بشارت دی ہے۔ میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں، بردباری، مسکینی، اخلاق اپنے فرض کی انجام دہی میں سرگرم رہنا ایک زبردست مقناطیسی کشش رکھتا ہے، جو مخالفین کو اپنی طرف ایک نہ ایک دن جبراً کھینچ لاتا ہے، اس میں شبہ نہیں ہو سکتا

کہ کئی برس تک پیارے شہیدؒ کے معتقدین اتنے کم رہے جن کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا تھا مگر اس ناکامی سے کسی قسم کی دل شکنی مولانا شہیدؒ کو حاصل نہ تھی، ایک دن آپ وعظ فرمانے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، بغل میں حمائل تھی اور ذرا شتابانہ قدموں سے جا رہے تھے، ایک بوڑھے شخص نے جس نے اپنی جان اسلام پر قربان کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، آبدیدہ ہو کے کہا۔ اے ہمارے نوجوان ہادی تو اس طرح راہ حق دکھانے میں کوشش کرے اور تیری کوشش یوں رائیگاں جائے، افسوس کیسے سنگدل لوگ ہیں جو تیری بات نہیں سنتے اور اگر سنتے بھی ہیں تو اس پر عمل نہیں کرتے، آپ نے مسکرا کے جواب دیا بڑے میاں ہر کام بتدریج ہوتا ہے، صدیوں کی خرابی صدیوں ہی میں رفع ہو سکتی ہے۔ یکایک کوئی سنگلاخ پر بیج ڈال نہیں سکتا اس امید سے کہ یہ بارآور ہو اور جس کا یہ خیال ہے وہ ہوا پر نقش کرنے چاہتا ہے، بوڑھے نے مُنہ اُٹھا کے یہ دعا دی، تو قطعی کامیاب ہوگا، اے نوجوان ہادی خدا تیری عمر میں کامیابی کے ساتھ برکت دے، دوسرے راہ گیر نے بہت زور سے آمین پکاری۔

یہ دعا فوراً مقبول ہوئی، اور اس کا اثر دو گھنٹے کے بعد ظاہر ہو گیا۔ جب آپ وحدانیت پر وعظ فرما رہے تھے اور ایک پر اثر اور پُر جوش لہجہ میں ربانی مطالب کو حل فرما رہے تھے تو ایک دو سو آدمیوں کے گروہ نے غل مچا کے یہ کہا، ہم نے شرک و بدعت سے توبہ کی اور آئندہ ہم عہد کرتے ہیں کہ کبھی اپنی حاجتیں سوائے خدا کے کسی کے پاس نہ لے جائیں گے قرآنی مطالب میں بے شک زبردست اثر ہے لیکن ساتھ ہی اس کے اثر کا دوسروں پر پڑتو ڈالنے کے لئے بھی زبان کی خصوصیت درکار ہے جیسا سانچہ ہوگا ویسے ہی پُرزے ڈھلیں گے جب خدا کی لازوال قوتوں پر دل سے بھروسہ ہے اور جو کچھ زبان سے کہا جا رہا ہے دل میں اس سے بھی زیادہ یقین ہے، پھر تاثیر خود بخود سامعین پر ہوگی۔

ہمیشہ بڑے بڑے فارغ التحصیل طلبہ خاص اس نظر سے آتے تھے کہ ہم فلاں مسئلہ میں مولانا شہیدؒ سے مناظرہ کریں گے، لیکن وعظ سننے کے بعد کسی میں یارا نہ رہتا تھا کہ کچھ بھی زبان سے کہہ سکے۔ ہر بات تسلیم ہی کرتے بنتی تھی، اور یہ شبہ بھی کسی کے دل میں نہ رہتا تھا

برآری کے لئے نیاز نذر دلوانا ترک کر دیا۔ اور یوں ہی جتنی بدعتیں کرتے تھے ان سب سے توبہ کی۔

یہ کامیابیاں بظاہر کچھ وقعت نہ رکھتی تھیں، لیکن ان میں ہی ایسے جوہر شامل تھے جو بعدازاں چمک کے رہے، اور ایسی تابانی دکھائی جن کی روشنی ہنوز جھلک مار رہی ہے۔

جب بدعتیوں کو پے درپے یہ فاش شکستیں ملیں تو اب اُنہوں نے مخالفت کا دوسرا پہلو بدلا اور وہ پہلو یہ تھا کہ ہر گلی کے نکڑ پہ ایک ملّا نا کھڑا کر دیا کہ وہ مولانا شہیدؒ کو کافر بنائے اور گمراہ کہے۔ غرض سوائے تبرّے کے اور کچھ نہ کہے، جب اس قسم کے وعظ ہونے لگے تو دو چار جگہ لاٹھی بھی چل گئی، کیوں کہ اب محمدیوں کا گروہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

شہر میں دو تین جگہ لاٹھی چل گئی تھی کہ گورنمنٹ کمپنی کی طرف سے اکبر شاہ کے مشورہ کے ساتھ وعظ بند کر دیئے گئے، منہ در منہ گالیاں مولوی اسمٰعیل صاحب سنتے تھے لیکن کچھ نہ کہتے تھے جس عظیم الشان فرض کا اُنہوں نے بیڑا اُٹھایا تھا اس کے انجام دینے کے لئے اس سے بھی زیادہ اور کہیں زیادہ طعن وتشنیع سُننا اور اذیت اُٹھانا ضرور تھا۔

کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ آپ کے وعظ میں دس پانچ ہندو اور درجنوں بدعتی مسلمان نہ ہوتے ہوں بلکہ یہاں تک جو اپنے مذہب شرک وبدعت میں پختہ تھے وہ جان کے نہ آتے تھے مبادا ہم پر کوئی اثر مولوی کے وعظ کا پڑے۔

دہلی میں تو مخالفت کی آگ بھڑک ہی رہی تھی مگر پنجاب میں جو بدعت خیز خطہ ہے کچھ کم مخالفت مولانا شہید رح کی طرف سے ان کی طبائع میں نہ تھی، تمام پنجاب انت پیستا تھا کہ جس طرح ہو کوئی جاکے مولوی اسمٰعیل کو قتل کر آئے، یہ حد سے زیادہ مسلمانوں کی بدبختی کا زمانہ تھا کہ وہ سکھوں کی سلطنت کے قابل رحم مظالم میں بٹے جاتے تھے، ان کا تو کچھ ہو ہی نہ سکتا تھا، ایسے موقع پر کر رنجیت سنگھ نے اذان پکار کے کہنا منع کر دیا تھا، کوئی مذہبی رکن کھلم کھلا ادا نہ ہو سکتا تھا، رمضان میں سکھ زبردستی مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کے کھانا کھلاتے تھے، اور اُن کے روزے تڑوا ڈالتے تھے، مولویوں کی سکھوں کے راج میں

وہ گت بنی تھی کہ توبہ، سور کے گوشت کی بوٹیاں معمولی جرائم میں جبراً اُن کے منہ میں ٹھوسی جاتیں، اور انہیں مجبور کیا جاتا کہ تم اُسے کھاؤ کھایا تو جانبر ہو گئے نہ کھایا تو تلوار سے سر قلم کر دیا گیا۔

ایسے ظالمانہ اور حد سے زیادہ جابرانہ سلطنت سکھ میں تو کبھی پنجاب کے مسلمانوں کو یہ خیال نہ ہوا کہ ہم اپنے کو اس بلائے بیدرماں سے نجات دیں، اور ایسے اظلم حکمرانوں کو تہ تیغ کریں، بہادری نے بھی جوش مارا تو ایک بیچارے شہیدؔ کی جان پر جو تنہا تلوار حمائل کئے ہوئے جنگل قبرستان میں پھرا کرتا تھا یہ کچھ ضرور نہ تھا کہ ہر وقت تلوار ہی پاس ہو، نہیں بعض وقت لکڑی بھی نہ ہوتی تھی اور آپ صرف اللہ کے بھروسہ پر قانع ہو کے آزاد ادھر اُدھر پڑے پھرتے تھے۔

لاہور میں ایک رنگریز رہتا تھا جو رنجیت سنگھ سے تعلق پیدا کر کے بڑا امیر کبیر ہو گیا تھا، اس کی بیٹی سے رنجیت سنگھ نے شادی کر لی تھی، اور اُسے ایک جاگیر بھی دے دی تھی۔ وہ لڑکی تو رنجیت سنگھ کے محل میں بھی مسلمان ہی رہتی تھی، اُس کا حسن ہی صرف خونخوار سکھوں سے اس کی جان کا محافظ تھا، ورنہ رنجیت سنگھ کی تیغ براں کی وہ کبھی کی شکار بن جاتی، مگر یہ رنگریز خوشامد میں آکے کچھ سکھ سا بن گیا تھا، اور پیشوایانِ دینِ اسلام کو محض سکھوں کے خوش کرنے کے لئے گالیاں دیا کرتا تھا، بایں ہمہ وہ بدعتی بہت بڑا تھا، اس نے گاؤں میں تین قبریں تھیں جن کی پرستش خود بھی کرتا تھا، اور دوسروں کو بھی کرنے پر مجبور کرتا تھا وہ رسول مقبول کی شان میں بے ادبانہ الفاظ کہہ دینے کوئی گناہ نہ سمجھتا تھا، لیکن ان اہل قبور کے خیالی ناموں کا بڑا پاس لحاظ رکھتا تھا۔ اس شخص کا پہلے نام غلام رسول تھا، اور بعد ازاں اُس نے صرف اسلام کی ضد میں اپنا نام بندۂ رنجیت سنگھ رکھ لیا تھا، دہلی کے بدعتیوں سے بھی اس کی خط کتابت تھی اور بعضوں کا اس نے وظیفہ بھی کر رکھا تھا جب ان کی یہاں سرد بازاری ہونے لگی اور لوگ اسلام اور اس کے روشن اصول سے واقف ہونے لگے تو اُنہوں نے بندۂ رنجیت سنگھ سے جا کے شکایت کی کہ ہماری قبروں پر چڑھاوا بھی بہت کم چڑھتا ہے اور لوگ کچھ غیر معتقد سے ہوئے جاتے ہیں جو اس کے معتقدین میں سے نہیں ہیں، وہ

تھے۔

غرض وہ دہلی پہنچے، کئی دن تک تو اہل بدعت نے انہیں چھپائے رکھا، پھر بھی یہ افواہ اڑ گئی کہ شاہ اسمٰعیل کے قتل کے لئے پنجابی بلائے گئے ہیں، یہ سُن کے پیارا شہیدؒ بھی چوکنا ہوا، کیونکہ جان بچانی فرض تھی۔ اور ادھر اُدھر مخبری کے لئے آدمی چھوڑ دئے کہ اس کی تحقیق کرکے لاؤ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ اہل بدعت نے بڑی چالاکی کی تھی کہ دہلی کی گلیاں اور راستہ دکھانے کے لئے انہیں ڈولیوں میں پھراتے تھے، مہینہ ڈیڑھ مہینے تک وہ ڈولیوں میں پھرتے رہے، بعدازاں یہ غل بھی مچا کہ وہ لوگ ڈولیوں میں پھرتے ہیں تاکہ شاہ صاحبؒ پوشیدگی اور بے خبری میں حملہ کریں۔

جب یہ ڈولیوں کی خبر اُڑ گئی تو انہوں نے دوپہر اور شب کو مختلف اوقات میں انہیں نکالن شروع کیا اس زمانہ میں عموماً ہتھیار تو سب ہی باندھتے تھے، اور کچھ ممانعت نہ تھی، پھر بھی نوجوان پیش قبض چھپا چھپا کے نکلتے تھے، پیارے شہیدؒ کی صورت بخوبی پہچنوا دی گئی تھی، اور اب وہ گھات میں لگے پھرتے تھے۔

ایک دوپہر کا وقت تھا، آفتاب کی روشن کرنیں گرم گرم اور تیز تیز زمین پر پڑ رہی تھیں، در و دیوار اور آسمان و زمین جھلستے تھے، وہ قہرناک وقت تھا کہ دور دور سڑک پر کوئی متنفس بھی نظر نہ آتا تھا۔ بس چیل انڈا چھوڑتی تھی، اہل بدعت کو خبر لگی کہ مولوی اسمٰعیل تنہا فتحپوری کے حوض پر ٹہل رہے ہیں، شاید وہ کسی خاص خیال میں مبتلا ہیں، کیونکہ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس سے بہتر موقع اہل بدعت کو کہاں مل سکتا تھا، انہوں نے ایک نوجوان کو روانہ کیا کہ وہ جاکے اسمٰعیل کا سر لے آئے۔ وہ جوان سیدھا فتحپوری میں آیا، کل حجروں کے کواڑ بند پائے، اور ادھر اُدھر مسجد میں ایک شخص بھی چلتا پھرتا نہ دیکھا۔ در و دیوار تنور بن رہے تھے، جس طرح بھاڑ میں چنے بھُن جاتے ہیں، اس طرح حوض کی پتھریلی زمین ہو رہی تھی کہ اگر کوئی چاہے تو بآسانی چنے بھون لے۔ شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نیچی نگاہ کئے ہوئے بے تکان گشت لگا رہے تھے۔ جوان نے پہلے اپنا پیش قبض سنبھالا جوتیاں چپکے سے اتار کے ایک طرف بیٹھ اور برہنہ پا نیچے کی طرف جانے لگا، جوں ہی اُس نے زمین پر قدم رکھا پیر کے تلوے

بھرنا ہو گئے اور اُسے اس قدر تکلیف ہوئی کہ جلدی سے پھر جوتی پہن لی، اور اب یکایک اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مولوی اسمٰعیل تو کوئی پہنچا ہوا ولی ہے۔ آہستہ آہستہ اس جلتے ہوئے پتھر پر ٹہل رہا ہے، اور اسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی، یہ خیال ایسا قوی ہوا کہ آخر کار عقیدہ کی صورت میں بدل گیا، اور اب اُس نے اپنا خنجر نکال کے مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کے سامنے رکھ دیا اور جو کچھ کیفیت تھی ساری بیان کر دی، مولانا شہیدؒ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا خدا کی تجھ پر رحمت نازل ہوئی، وہ سب کا سچا ہادی ہے تو اپنا خنجر اٹھا لے جا خدا تجھے ہدایت کرے۔

نوجوان نے ہاتھ باندھ کے کہا میں کہاں جاؤں، جدھر میں گیا پریشانی دست و گریبان رہی، لیکن آپ کی صورت اور گفتگو سے گونا اطمینان ہوا ہے، اب مجھے اپنا غلام تصور کیجے اور راہ حق سکھائیے۔

شاہ صاحب کے مزاج میں مذاق بہت تھا، لیکن وہ مذاق جس کی رسول مقبولؐ نے اجازت دی ہے اور بعض[1] وقت آپ بھی کیا کرتے تھے، یعنے جس میں جھوٹ نہ ہو، اور دوسرے

---

[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، لوگوں نے ایک دن نبی اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا، آپ کبھی ہم سے مزاح بھی کرتے ہیں فرمایا البتہ اگر کبھی مزاح کرتا ہوں تو سچ بات کے سوا کچھ نہیں کہتا (ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے)۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم کبھی کبھی ازواج مطہرات سے مزاح فرمایا کرتے تھے اور حضرت ام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک بڑھیا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ نے اس سے فرمایا کہ جنت میں کبھی کوئی بڑھیا نہ جائے گی وہ رونے لگی آپ نے فرمایا تو اُس وقت بڑھیا نہ رہے گی کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ انا انشاناھن انشاءً فجعلناھن ابکارا۔ یعنے ہم نے وہ عورتیں اٹھائیں ایک اٹھان پر اور پھر کیا اُنہیں کواریاں (ترمذی در شمائل مرسلاً)۔ اور زید بن اسلم سے روایت ہے کہ ایک عورت ام ایمنؓ نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ آپ کو میرا شوہر بلاتا ہے آپ نے فرمایا تیرا شوہر وہی ہے نا جس کی آنکھ میں سفیدی ہے اس نے عرض کیا دگھبرا کے) اُس کی آنکھیں تو اچھی ہیں ان میں سفیدی نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ بیشک ہے اس نے بجسم کہا کہ نہیں پھر آپ نے ارشاد کیا کہ کوئی ایسا شخص نہیں جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہو یعنے حدقہ چشم ہر انسان کا سفیدی اور سیاہی دونوں رکھتا ہے (زبیر بن بکار و ابن الدنیا بروایت عبداللہ بن اسہم فہری) ایک دن (باقی بر صفحہ ۱۱۸)

شخص کی غیبت نہ ہوتی ہو، آپ نے اسی معمولی مذاق سے یہ فرمایا بھائی تم پنجابی ہو، عموماً پنجابی پیر پرست اور گور پرست ہوتے ہیں میں نہ پیر ہوں نہ میرے ہاں کوئی قبر ایسی ہے جس پر اٹھوں ُان کا میلا ہو اور چڑھتا ہو میں ایک اکیلے خدا کی پرستش کرتا ہوں، اور اُسی کی قرآن و حدیث کے مطابق حتی الوسع تعلیم دیتا ہوں اگر تمہیں خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم لینی ہو جو ٹھیٹ اسلام ہے تو میرے ساتھ مزدوری کر کے حلال کی روزی سے پیٹ بھرو اور اگر بچ رہے تو حقیقی محتاج کو دو، اور ہمیشہ خدا پر بھروسہ رکھو بس یہی میری تعلیم اور یہی میرا مذہب ہے، اگر تمہیں دین اسلام کے یہ اصول اچھے معلوم ہوں تو میرے ساتھ بھی رہنے کی کچھ ضرورت نہیں جہاں جی چاہے رہو، اور اسی پر بھروسہ کرو، اور اپنے مغفرت کی پانچوں وقت کی نماز میں صرف خدا ہی سے دعا کرتے رہو، یہ تقریر سن کے وہ جوان کچھ وجد میں آگیا اور خداوند حقیقی کا سچا نور اس کے جملہ دل میں ایسا چمکا کہ اُس نے جوتی اُتار کے جو وہ سیڑھیوں تک پہنچ آیا تھا پیارے شہید رح کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور کہا، یہ غلام تو اگر دھکے بھی دیجے گا جب بھی نہیں ٹلے گا۔ آخر وہ پیارے شہید رح کے ساتھ تا زیست رہا، اور جب قندہار کی سرحد میں منافقین کے مقابلہ میں شہید ہؤا تو اس کا سر پیارے شہید کے زانو پر تھا۔ لہو اُس کی پیشانی سے پوچھتے جاتے تھے، اور وہ اپنی اسی مسکراتی ہوئی صورت میں جیسی صحت کی حالت میں اس کی تھی

(بقیہ صہ ۱۱۷) ایک اور عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا مجھے ایک اونٹ سواری کو ملے، آپ نے فرمایا میں تیری سواری کے لئے اونٹ کا بچہ دوں گا وہ حیران ہوئی اور اُس نے عرض کیا، بچہ لے کے میں کیا کروں گی وہ مجھے کیسے اٹھائے گا، آپ نے فرمایا جو اونٹ ہوتا ہے وہ اونٹ ہی کا بچہ ہوتا ہے (ابوداؤد و ترمذی بروایت انس رض) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے لڑکے نے ایک لال پالا تھا اور وہ اس سے کھیلا کرتا تھا، جب آپ ان کے گھر جاتے تو اس لڑکے سے فرماتے "یا ابا عمیر ما فعل النغیر" یعنے اے ابو عمیر تیرا لال کیا ہوا (بخاری و مسلم) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جنگ بدر میں میں رسول اللہ ص کے ساتھ تھی، آپ نے فرمایا آؤ ہم تم دوڑیں دیکھیں کون آگے نکل جاتا ہے میں نے اپنا دوپٹہ مضبوط باندھ لیا اور ایک نشان کھینچ کر اس پر کھڑی ہوئی اور دوڑی مگر آنحضرت آگے نکل گئے اور فرمایا کہ یہ ذی المجاز کا بدلہ ہے، ذی المجاز ایک [illegible] حضرت عائشہ رض چھوٹی تھیں حضرت ابوبکر صدیق رض نے (باقی بر صہ ۱۱۹)

مسجد تک آنے کے لئے بھی بند کئے گئے۔ یہ ایک بڑی اصلاح تھی جس کو خاص وعام نے پسند کیا، اپنے دوسرے وعظ میں آپ نے اس قبیح رسم کو رد کیا جو شرفا کے خاندان میں پھیلی ہوئی تھی یعنی نکاحوں میں اہل ہنود کی رسمیں ہوتیں اور انہیں اسلامی اصول سمجھنا عورتوں کے خیالات ایسے سخت اور شدید ہوتے ہیں کہ جو بات ان کے ذہن میں جم جاتی ہے اس کا نکلنا مشکل پڑ جاتا ہے۔ مگر مولانا شہیدؒ کے متواتر وعظوں نے ان کی مت بھی پلٹی اور اُنہوں نے بھی آئندہ سے توبہ کرلی۔

اگر خیال کیا جائے تو یہ اصلاح سب سے بڑی تھی کہ یکایک صدیوں کے خیالات عورتوں کے بدل دیئے۔

سیتلا کی پرستش

بت پرستی کا چونکہ گھر گھر رواج تھا، اور عموماً مسلمان اسے عیب بھی نہ سمجھتے تھے، اور طرح طرح کی بدعتوں میں گرفتار تھے، اس لئے ان کی مستورات بھی ان سے اس شرک و بدعت میں کئی قدم آگے تھیں، وہ بالکل ہندوؤں کی طرح ماتا مائی کی پرستش کرتی تھیں اور یہ سمجھتی تھیں اگر ہم ماتا مائی کو نہ پوجیں گے اور ان کے استان پر چڑھاوا نہ چڑھائیں گے تو ہمارے بچے ضائع ہو جائیں گے، الحمد للہ کہ مولانا شہیدؒ بڑی کوشش کے بعد اس میں بھی کامیاب ہوئے، اور قطعاً ہر گھر سے سیتلا یا چیچک کی پرستش کی رسم مٹا دی۔

تعزیہ داری اور ماتم کرنا!

دہلی میں کوئی خاندان شریفوں کا ایسا نہ تھا کہ جس کے ممبر شیعہ سنی دونوں نہ ہوں، کسی کی

سلہ آج کل یہ تو غنیمت ہے کہ سودے والے مسجد میں آکے فروخت نہیں کرتے لیکن باہر ان کا مجمع لگا رہتا ہے اور کوئی جامع مسجد کا ممبر قلیل نفع کے لئے ان سے ہوں بھی نہیں کرتا۔ یہ تو سب کچھ تھا بڑا غضب یہ کر رکھا ہے کہ الوداع کے دن جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بت پرستی ہوتی ہے یعنے کھلونے بکتے ہیں، مسلمان مسجد کے پاس مندر بننے پر تو اہل ہنود سے سر پھٹول کرتے ہیں لیکن خدا کے گھر میں جو بت پرستی ہوتی ہے، اس کا بسہولیت تدارک ان سے نہیں ہو سکتا۔

ننھیال شیعہ تھی تو کسی کی ددیال شیعہ تھی، چنانچہ خود شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے نانا شیعہ تھے جو بعد میں سنی ہو گئے تھے یہ تعجب کی بات نہیں ہے جس ملک میں کہ دونوں معزز گروہ رہتے ہوں، اور پھر مسلمان ہوں وہاں باہمی تعلق کا نہ ہونا حیرت انگیز ہے خدا کو دونوں قومیں واحد جانتی ہیں رسول مقبولؐ کو برحق سمجھتی ہیں، خلافت کا جُزوی جھگڑا ہے جسے جہلا نے زیادہ خوفناک بنا دیا ورنہ کوئی عاقل اور مہذب شیعہ کبھی تبرّا بھیجنا اچھا نہیں سمجھ سکتا۔

اس تعلق نے سنی مستورات پر یہ قابل شرم اثر ڈالا تھا کہ وہ محرم میں اپنے بچوں کو حضرت امام حسین کے نام کا سقہ بنا کے تعزیوں کے نیچے سے نکلنے کو بھیجتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ اس بچہ کی زندگی اور ترقی مال و دولت اسی کام کے انجام دینے پر موقوف ہے، محرم کی یکم تاریخ سے دہم تک چوڑیاں پہننی، مہندی لگانی، نفیس کپڑے پہننے، تیل اور عطر کا استعمال کرنا، پان کھانا، شادی بیاہ کرنا حرام خیال کرتی تھیں، وہ نویں تاریخ سر کھول کے بھوسا اڑاتی تھیں اور بشدت ماتم کرتی تھیں اور وہ اپنی ان باتوں کو اسلام سمجھتی تھیں اور ان کا عام مقولہ یہ تھا کہ جس نے برسویں دن حضرت امام حسین شہید کربلا کی شہادت پر ایک بھی آنسو بہایا اس کے لئے ایک موتی کا محل جنت میں تیار ہوگا۔

مولانا شہیدؒ نے ان ہی شنیع افعال پر متواتر وعظ فرمانے شروع کئے، آخر رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ ان کے مرد خود انہیں ایسے بدنما کام کرنے پر روکنے لگے، اور بعدازاں سنیوں کی مستورات میں سے یہ رسم بالکل جاتی رہی۔

قبر پر چلے باندھنا!

شرفار کی خواتین میں گور پرستی کی بھی انتہا ہو گئی تھی، اور اس پردہ میں بدوضع لوگوں کی بن آئی تھی، اور وہ اپنی ناواجب خواہش حاصل کرنے کے لئے شریف زادیوں پر تاک جھانک کیا کرتے تھے۔ ہر سال بڑی بڑی قبروں پر شرفار کی بہو بیٹیوں کے ہجوم رہتے تھے، اور کوئی روکنے والا نہ تھا۔ پردہ کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جاتی تھی، مولانا شہیدؒ نے ان کے مردوں کو غیرت

---

[1] مجموعہ واقعات صفحہ ۱۵۶۔

صوفیوں کو بُرا بتاتا ہے اور بزرگان دین کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔

جب اس کی شورش زیادہ مچی تو آپ نے ایک ضخیم کتاب[1] اصل تصوف اور بڑے بڑے جلیل القدر صوفیوں کے بیان میں تصنیف فرمائی، اور اس کے اکثر نسخے نقل کرا کے مختلف لوگوں کے پاس بھیج دیئے، جس سے بہت کچھ عوام الناس کے خیالات کی اصلاح ہوئی اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اسمٰعیل بڑا جیّد صوفی ہے۔

ہمارے ہاں یہ عام عیب پھیلا ہوا ہے، اور اس میں تقریباً سب ہی مبتلا ہیں کہ جس کی نسبت جو کچھ سُن لیا بلا تحقیق اور تفتیش کے اسے یقین کر لیا، اس سے غرض نہیں کہ وہ صحیح ہو یا غلط اسی طبیعت نے ایک عام ناراضی مسلمانوں میں مولانا شہید کے خلاف پھیلا دی، اور اب تک مسلمانوں کا بڑا گروہ پیارے شہیدؒ کو ملزم گردانتا ہے حالانکہ جو الزامات اس ذات والا پر قائم کئے ہیں کبھی کسی کو یہ نصیب نہیں ہوا کہ ان کی پوست کندہ کیفیت دریافت کرتا، اور حق میں ناحق میں تمیز کرتا، بمبئی میں عموماً مولانا اسمٰعیل کے نام سے لوگ جلتے ہیں لیکن جلنے کی وجہ صرف دو سنی سنائی باتیں ہیں جن کی کچھ بھی بنیاد نہیں ہے اور وہ محض بے اصل ہیں، جمعہ کو جب میں بمبئی کی جامع مسجد میں گیا تو نماز پڑھنے کے بعد مجھے میرے ایک دوست نے ٹھہرا لیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا کئی شخص اور بھی میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے، ان کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا تھا یہ لکھے پڑھے ہیں وہ باہم مولوی اسمٰعیل صاحب کا ذکر تحقیر آمیز الفاظ میں کر رہے تھے، اور ایسی ایسی بے بنیاد باتیں قائم کر رہے تھے جو میرے کانوں میں جہاں تک مجھے یاد ہیں کبھی نہ پڑی تھیں ایک شخص تو یہ کہہ رہا تھا کہ تقویۃ الایمان میں سوائے کفر کے کچھ نہیں ہے، نبی اور آپ کے صحابہ کو برملا گالیاں دی گئی ہیں، دوسرا شخص بولا کہ صوفیوں کو تو ایسا سخت لکھا ہے کہ ہندو

---

[1] اس کتاب کا نام حقیقت تصوف ہے غدر میں اس کے بہت سے نسخے ضائع ہو گئے ہیں، شاید ہندوستان میں کسی کے پاس موجود ہوگی، کشمیر میں میرے ایک دوست نے مجھے دکھائی تھی، میں نے سرسری طور پر دیکھ کے واپس دے دی، اس میں شک نہیں کہ جو کچھ مولانا شہید نے اس میں کمال کیا ہے اور سچے صوفیوں کی تعریف میں رطب اللسانی کی ہے اس سے مولانا کی انصاف پسندی معلوم ہوتی ہے، اور تمام ان غلط الزامات کی تردید ہوتی ہے جو خواہ مخواہ اب تک آپ پر محض نفسانیت سے عاید کئے جاتے ہیں۔

عیسائی بھی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں یہ ناواجب باتیں سن کے مجھ سے رہا نہ گیا۔ ہرچند میں چاہتا تھا کہ ان کے خیالات میں خلل اندازی نہ کروں لیکن جب قرآن کا یہ ارشاد ذہن میں آیا کہ حق کی بات چھپانی نہیں چاہیئے میں اپنی جگہ سے اٹھ کے ان کے پاس جا بیٹھا، اور میں نے نہایت ادب سے ان کی خدمت میں یہ عرض کیا، آپ نے تقویۃ الایمان دیکھی ہے، انہوں نے نہایت سادگی سے بے پروایانہ لہجہ میں یہ جواب دیا نہیں ہم نے نہیں دیکھی نہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے نہایت عاجزی سے ان کی خدمت میں عرض کیا بڑے ظلم کی بات ہے آپ نے ایک چیز ملاحظہ نہیں کی اور اس کی بابت اس مضبوطی سے رائے قائم کی جاتی ہے۔ میری اس بات سے وہ ناراض ہوئے اور انہوں نے میری طرف حقارت کی نظر سے دیکھا پھر میں نے یہی التماس کیا میرے خیال میں زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ آپ اسے ملاحظہ فرما کے اس پر رائے قائم کریں، بڑی ردوکد کے بعد انہوں نے میری بات مان لی، میں نے انہیں تقویۃ الایمان بھجوادی، آٹھویں دن جب وہ مجھ سے ملے تو ان کے خیالات ہی بدلے ہوئے تھے اور وہ سچے مسلمان تھے۔

اس بیان کرنے سے میری غرض صرف یہ ہے کہ ہماری عادت میں داخل ہوگیا ہے، جہاں ہم نے کسی کی نسبت کوئی بری افواہ سنی اور اس کی استواری سے شہرت دینے لگے اور ایسا یقین کرلیا گویا ہم اپنے خیال میں اسے تحقیق کرچکے ہیں، یہ غلط فہمی پہلے سے چلی آتی ہے اور بدخواہوں نے محض اپنی نفسانیت سے جو الزامات مولانا شہیدؒ پر قائم کئے ان کی اس دھوم دھام سے عوام الناس میں اشاعت ہوئی کہ شاید کسی حق بات کی بھی اتنی جلدی نہ ہوتی، جو کتابیں آپ نے تصنیف کی ہیں موجود ہیں جن تواریخ میں آپ کا ذکر خیر ہے وہ مٹ نہیں گئیں، انہیں تو کوئی دیکھتا نہیں اور جو کچھ اس کے ذہن میں آتا ہے کہہ گزرتا ہے۔

جو وعظ پے در پے مولانا نے شرک[1] اور مروجہ تصوف پر فرمائے انہیں لوگوں نے بڑی بڑی

---

[1] شرک کی چار قسمیں ہیں (۱) شرک فی العلم (۲) شرک فی التصرف (۳) شرک فی العبادۃ (۴) شرک فی العادۃ۔ شرک فی العلم سے یہ غرض ہے کہ کوئی نبی اور ولی چھپی ہوئی باتوں کو نہیں جانتا تھا جب تک خود خداوند تعالیٰ بعض باتوں سے نہ آگاہ کرے، اس عقیدے کے خلاف سمجھنا شرک فی العلم ہے گویا خدا کی غیب دانی کے علم کے ساتھ دوسرے (باقی برصفحہ ۱۳۴)

مبالغہ آمیز رنگ آمیزیوں سے شہرت دیا اور ایسے ایسے حاشیے ان پر چڑھا دیئے جن کا وعظ میں معاذاللہ اشارہ تک بھی نہ تھا۔ مگر پھر بھی حق کی ہمیشہ فتح ہوئی ہے، حق چمک ہی کر رہا اور پیارے شہید ؒ نے اسلام کی جو کچھ خدمت کی ہزاروں، لاکھوں مسلمان اس بے نظیر احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہوں گے۔ مسلمانوں سے گزر کے یورپین مصنفوں نے بھی قبول کر لیا ہے کہ اسمٰعیل نے دین میں بہت بڑی اصلاح کی ہے۔

جب متواتر وعظوں کی بھرمار ہوئی تو دہلی کے عمائد کو آپ کے وعظ سننے کا اس قدر چسکا لگا کہ پہلے ہی سے مفتی صدرالدین وغیرہ کہلا بھیجتے تھے، آپ قرآن شریف کی فلاں آیت پر وعظ فرمایئے گا اور پھر وہ اس آیت کی تفسیر اپنے اپنے گھر میں دیکھ دیکھ کے جاتے تھے یہ اندازہ کرنے کے لئے دیکھیں کس تفسیر کا مضمون مولانا شہید سناتے ہیں مگر جب وہ وعظ سنتے تھے

(بقیہ صفحہ ۱۳۳) کو شریک کرنا، خود ہمارے آخرالزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غیب کی بات معلوم نہ ہوتی تھی مثلاً جب چند نافہموں نے حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے دامن تقدس پر دھبہ لگانے کی کوشش کی ہے اور نبی کے ذہن میں شبہ ڈالا ہے، آپ کو اصلی واقعہ کی صداقت وغیر صداقت کا علم نہ ہوا، یہاں تک کہ خدا نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی بے گناہی اور پاکی بتائی۔ یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی نجومی کوئی رمّال کوئی پیر شہید پوشیدہ باتیں بیان کرتا ہے۔ شرک فی العلم کے دائرہ میں داخل ہونا ہے یہ بھی شرک فی العلم ہے کہ مدد کے وقت سوائے خدا کے کسی کو پکارنا یا اس کا نام دشمن پر حملہ کرتے وقت لینا مثلاً بعض جہلاء کا قاعدہ ہے کہ وہ یا علی مدد کہتے ہیں یا یا علی کہہ کے دشمن پر حملہ کرتے ہیں۔

(دوم) شرک فی التصرف یہ خیال کرنا کہ خدا کی قوت کے ساتھ دوسرا شخص بھی قوت رکھنے میں شریک ہے، جو کسی پیر شہید وغیرہ کو خدا کے درمیان واسطہ ٹھہراتا ہے شرک فی التصرف میں مبتلا ہے مثلاً بعض لوگ یوں کہتے ہیں ہم ان پیروں یا اولیاء کی نیاز نذر اس نظر سے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک پہنچا دیتے ہیں۔ اس طرح سے دوسروں کو شفیع گرداننے یا خدا کے درمیان ایک واسطہ بنانے کی تین قسمیں ہیں، مثلاً ایک مقدمہ شاہ کی خدمت میں پیش ہے وزیر نے ملزم کی شفاعت چاہی، شاہ نے وزیر کے رتبہ کا لحاظ کر کے اس مجرم کی خطا کو بخش دیا، اسے شفاعت وجاہت کہتے ہیں، لیکن یہ خیال کرنا کہ اسی طرح خدا بھی اپنے کسی مقرب یا وزیر کا پاس ولحاظ کر کے کسی مجرم کا گناہ بخش دے گا صریح شرک ہے۔ دوسری قسم کی شفاعت یہ ہے کہ بادشاہ، بیگم یا شہزادے شاہ سے سفارش کریں (باقی برصفحہ ۱۳۵)

تو انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولانا صاحب نے بیان فرمایا ہے بالکل نئی نئی باتیں ہیں جو اُن کے کانوں میں کبھی نہیں پڑیں۔

یہ خداداد ذہانت اور ربانی انکشاف تھا جو خصوصیت سے اس ذات والا کو بخشا گیا تھا۔ یہ وہ چوکھٹ ہے کہ مخالف بھی آکے اپنی پیشانیاں ٹکاتے تھے، اور انہیں دم زدن کا یارا نہ تھا۔

جن چند اصلاحوں کو ہم نے بیان کیا ہے بظاہر ناظر کو ان کی کچھ بہت بڑی شان نہ معلوم ہو لیکن جب وہ دہلی اور اہل دہلی کی حالت اور تعصب کو دیکھے گا اس وقت اسے اندازہ ہوگا کہ پیارے شہیدؒ نے جو کچھ کیا بے نظیر کیا۔

اسی کے ضمن میں مَیں ایک نادر الوجود واقعہ کا ذکر کرتا ہوں جو نہایت ہی دلچسپ اور لذیذ

(بقیہ صـ ۱۳۴) اور کسی مجرم کی خلاصی چاہیں، شاہ صرف ان کی محبت سے اس مجرم کو بخش دے اسے شفاعت محبت کہتے ہیں لیکن یہ خیال کرنا کہ خدا بھی کسی سے ایسی محبت رکھتا ہے جیسے شاہ کو بادشاہ بیگم اور بچوں سے تھی، اور اس محبت سے وہ مجرم کا گناہ بخش دے گا سخت شرک ہے۔ خدا کی عدالت میں کسی فرد بشر میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنی محبت کے دباؤ ڈالنے میں خدا پر تکیہ کرتا ہو۔ یہ اس کی بے انتہا مہربانیاں اور مخلوق خدا کے ساتھ احسان ہیں کہ اس نے لفظ حبیب اور لفظ خلیل سے یاد کیا ہے وغیرہ لیکن پھر بھی بندہ بندہ ہی ہے کسی میں یہ یارا نہیں کہ عبودیت کی حدود کے باہر اپنے قدم بڑھا سکے یا بندہ کے مرتبہ سے وہ اپنا سر اونچا کر سکے۔ تیسری قسم کی شفاعت یہ ہے کہ خود شاہ کی مرضی ہے شفاعت کرنے یا کسی مجرم کی خطا معاف کرنے کی لیکن اسے خوف ہے کہ قانونی جبروت اور جلال کو اس سے کچھ نقصان نہ پہنچے، وزیر نے شاہ کی خواہش اور مرضی پہچان لی اور اس نظر سے مجرم کی شفاعت چاہی یہ شفاعت قانونی ہے، اسے شفاعت باذن کہتے ہیں۔ اسی قسم کی شفاعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن کریں گے لیکن یہ خیال کرنا کہ نبی میں اس کے علاوہ بھی شفاعت کی قوت ہے شرک فی التصرف میں داخل ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید میں موجود ہے کون ہے جو ان کی شفاعت اللہ کے آگے کر سکتا ہے مگر جسے اللہ چاہے قرآن وحدیث میں جہاں کسی نبی اور پیغمبر کی شفاعت کے متعلق تذکرہ ہے، اس سے مطلب اسی تیسری قسم کی شفاعت سے ہے۔

(سوم) شرک فی العبادت ہے۔ کسی مخلوق کے آگے پرستش کی نظر سے جھکنا شرک فی العبادت ہے۔ نہایت تعظیم سے

ہے مجھے امید ہے کہ ناظر اس واقعہ کو سن کے دلچسپی کے ساتھ ایک نیا سبق حاصل کرے گا۔

چند روایتیں بڑے شدومد سے بیان کی جاتی ہیں جو مشہور انام ہیں اور شاید محمدیؐ گروہ کے لوگ سوائے اہل تصوف کے اس کے یقین کرنے میں کچھ پس و پیش بھی کریں لیکن میں اپنے تجربہ سے کہتا ہوں وہ ساری باتیں صحیح ہیں ہاں کلام اس میں ہے کہ ان کی نوعیت کیا ہے۔

عموماً یہ مشہور ہے کہ فلاں صوفیوں کے جلسہ میں ایک بے ادب معترض بھی آگیا تھا، اس نے صوفیوں کے حال اور تھرکنے پر ہرزہ سرائی کی فوراً ایک رقص کناں صوفی کی نظر اس پر پڑی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) خم ہونا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے سینہ پر کھڑا ہونا۔ کسی شخص کے نام پر روپیہ خرچ کرنا اس کی یادگاری میں روزہ رکھنا اور کسی ولی، شہیدؒ، پیر کی قبر کے لئے فقط زیارت و تقرب کی نظر سے سفر کرنا اور اسے پکارنا قبر پر چادر سے پوشش کرنی۔ اور کسی مقبرہ میں قبر پر نماز پڑھنی قبر کے پتھر پر بوسہ دینا، مقبرہ کی دیواروں سے اپنا منہ اور پشت ملنی یہ ساری باتیں شرک فی العادۃ میں داخل ہیں، مومن کی شان ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان خرافات باتوں میں اپنے کو مبتلا کر کے شان مومنیت میں تنقیص پیدا کرے یہ سخت شرم کی بات ہے کہ جو فرائض حج بیت اللہ میں جا کے ہم انجام دیتے ہیں ان ہی کو عام قبور پر ادا کریں، یہ باتیں نہ صرف دین ہی میں خرابی پیدا کرتی ہیں بلکہ انسانی اخلاق سوسائٹی پر اس کا خوفناک اثر پیدا ہوتا ہے، ان خیالات پر انسان کبھی زندگی کے مرتفع مدارج حاصل نہیں کر سکتا۔ اور عین انسانیت کے سچے جلال کی تابانی کبھی اسے نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔

(چہارم) شرک فی العادۃ ہے مثلاً فوق الفطرۃ رسومات کو اپنے ساتھ جاری رکھنا اور ان پر عقیدہ رکھنا کہ یہ غیب کی باتوں کی طرف ہماری رہنمائی کریں گے مثلاً استخارہ وغیرہ سے خدا کی مرضی اور اس کی چھپی ہوئی باتوں کی تلاش کرنا شرک فی العادۃ کے دائرہ میں گرفتار ہوتا ہے، نیک اور بدشگونوں پر اعتماد اور اعتقاد رکھنا اور دنوں کو خوش قسمت اور بدقسمت اور عبدالنبی جیسے نام رکھنا سب شرک فی العادۃ میں داخل ہیں، نبیؐ کی قسم کھانا یا علیؑ اماموں اور پیروں کی قسم کھانا گویا ان میں وہ پرجلال جبروت تسلیم کرتی ہے، جو خدا کے ساتھ شامل ہے یہ بات اشراک فی الادب میں داخل ہے ۱۲ +

اور وہ بھی ان کے ساتھ پٹخنیاں کھانے لگا۔ اجمیر میں میں نے عرس کے دنوں میں خود اس قسم کا واقعہ ایسے اشخاص کی زبانی سنا جن کے اقوال کا مجھے ہر طرح اعتبار ہو سکتا تھا، ایک شخص نے مجھ سے آکے بیان کیا آج بڑا ہی غضب نازل ہوا، ایک صوفی پور پور چھلے پہنے ہوئے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی لمبی لمبی عطر بیز زلفیں حال کی سرخوشانہ حالت میں کھڑا ہوا گتیں بھر رہا تھا، اتنے میں ایک شخص نے اس کی یہ صورت شکل دیکھ کے کہا، تھرکنا بھی ایسی ہی زنانی صورت کو زیبا ہے، یہ سنتے ہی نوجوان صوفی نے تیز نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا اور وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا، اور اس نے اس قدر سر پٹکا کہ اگر شاہ صاحب کی خدمت میں بشدت التجا نہ کی جاتی ضرور اس کی جان جاتی رہتی، اس کا عام مجمع پر بہت بڑا اثر ہوا، اب ہر طرف آدمی اس فقیر کے پاس دوڑے ہوئے چلے جاتے ہیں روپیہ الگ برس رہا ہے اور لوگ مرید جدا ہو رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی میں نے اپنے ذہن میں اس واقعہ کی صداقت کی گو ہمارے چند ہمدردوں کو اس کا یقین نہ آیا، ایسے ہی چند صوفی دہلی میں بھی شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کو مات دینے اور بیہوش کرنے کے لئے بلائے گئے تھے۔

ماہ ربیع الاول کی گیارہ اور بارہ تاریخ قدم شریف میں جو فراش خانہ کی کھڑکی کے باہر واقع ہے بہت بڑا عظیم الشان عرس ہوتا تھا، مولانا شہیدؒ نے اپنا یہ التزام کر لیا تھا کہ ایسے

یہ عرس کیا تھا گویا ایک نمائش تھی، تقریباً کل ہندوستان سے فقرا اور تاجر آتے تھے، لاکھوں روپیہ کا لین دین ہوتا تھا اور نہ صرف بارہ ہی دن بلکہ مہینہ دو مہینے تک عجیب کیفیت رہتی تھی، اس میلے کے تنزل کے اسباب بہت سے بیان ہوئے، لیکن ہمارے مورخ نے جو خاص سبب لکھا ہے وہ یہ ہے کہ چند فقیروں نے ایک حنت کا ہیب کام کیا، مسلمانوں کی طرف سے تو پہلو تہی ہوئی، اور انہیں معاف کر دیا گیا، لیکن فریق ثانی اہل ہنود تھے انہوں نے ریذیڈنٹ سے مدد چاہی اور ان فقیروں کو گرفتار کرا دیا، انہیں معمولی سزائیں مل گئیں مگر بعد از اں وہ بڑی بڑی خانقاہوں سے چھٹ گئے، اس دن سے عوام الناس کی طرف سے فقیروں کی اتنی سی خاطر و مدارات نہ ہوتی تھی جس قدر پہلے کی جاتی تھی اور وہ کم ہو گیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی چند بے اعتدالیاں فقیروں نے کیں جس سال جہاں ان کی کمی ہونے لگی، یہ میلہ ایسا گھٹا کہ اب صرف نام باقی ہے ...ہیں آثار دیر دہلی صفحہ ۹۹ (ہ م)۔

مجمعوں میں جانا اور وعظ فرمانا۔ چنانچہ آپ کو خبر لگی کہ ایسے صوفی بھی یہاں تشریف لائے ہیں جو چشم زدن میں کبوتر کی طرح اُڑا دیتے ہیں، اور جب تک ان ہی کی عنایت نہیں ہوتی جانبری کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔

آپ نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کیا کہ ایسے زبردست کشش رکھنے والے فقیروں سے میں ملوں گا اور ان کی اصل حالت دریافت کروں گا، آیا جو کچھ کہا جاتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔

چونکہ آپ کو عموماً دہلی کے لوگ خوب پہچانتے تھے، اس لئے آپ نے سپاہیانہ لباس پہنا اور چھٹی تاریخ دس بجے شب معتقدانہ صورت میں وہاں پہنچے دربار ہو رہا تھا اور سو دو سو آدمی نہایت ادب سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے معزز مؤرخ نے اس دربار سوئیہ کا جس میں پیارا شہیدؒ بھی موجود تھا چشم دید نقشہ کھینچا ہے۔

(وھوہذا) اس عظیم الشان میلہ میں جو بارہ دن تک قدم شریف میں رہتا تھا اور جس میں ہر قسم کے فقیر اور تاجر آ آ کے شامل ہوتے تھے، جلال شاہ صاحب کے آنے کی دھوم دھام اور داخل ہونے پر خاطر و مدارات میں جو کچھ لطف آتا تھا وہ قابل بیان ہے۔ شہر میں داخل ہونے پر ان کی پیشوائی کی جاتی تھی اور بڑے بڑے شہزادے اور امرا انہیں ہاتھوں ہاتھ اس بڑے خیمے میں پہنچا دیتے تھے جو خاص شاہ کی طرف سے ان کے لئے ایستادہ کیا جاتا تھا، جلال شاہ کے ساتھ ہمیشہ دو سو تین سو مرید آیا کرتے تھے۔ یہ فقیر امیرانہ سامان رکھتا تھا، بڑے بڑے ایرانی غالیچے اور جواہرات کا بکثرت سامان اس کے ساتھ ہوتا تھا، اور یہ قابل تعریف بات

لے سیر دہلی صفحہ ۹۴ تذکرہ مشاہیر دہلی صفحہ ۹۴، ۹۵ تواریخ علمائے دہلی صفحہ ۱۱۱ ۲ سیر دہلی صفحہ ۱۰۵۱، اس دربار کے حالات نوٹ کرنے والے مورخوں نے بھی تذکرہ کیا ہے لیکن وہ بہت اختصار کے ساتھ اس واقعہ کو لکھتے ہیں عموماً مشرقی مورخوں سے (وہ بعض ہیں اکثر نہیں ہیں) یہ بات ضرور رہ جاتی ہے کہ بعض اوقات لائق بیان واقعات کا ذکر نہیں کرتے۔ اس لئے ان واقعات سے دلچسپی نہیں ہوتی اور جس واقعہ سے دلچسپی ہو خواہ ناظر پسند کرے یا نہ کرے اسے بڑی رنگینی سے بیان کیا جائے گا لیکن ہم سیر دہلی والے کے حد سے زیادہ ممنون ہیں کہ اس نے ہمیں قابل بیان واقعات کو معرض تحریر میں لا کے بے انتہا دلچسپی دی ہے۔

تھی کہ اس کے ہاں سے خیرات بہت ہوتی تھی۔ علاوہ اور صفات کے جن سے فقیر موصوف ہوتے ہیں یہ صفت بہت بڑی تھی کہ وہ صورت دیکھتے ہی یا آنکھیں ملاتے ہی آن کی آن میں ہر شخص کو بیہوش کر دیتا تھا۔ اس کے معتقد تمام شہزادے اور امیرزادے تھے، اس کی وضع خود امیرانی تھی، اس لئے غریبوں کو ذرا دخل بہت کم ملتا تھا، بایں ہمہ یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ غربا پر گوناگوں نوازشات کیا کرتا تھا اس کی موجودگی میں یہ کسی کا یارا نہ ہوتا تھا جو ایک دوسرے کی طرف اشارہ بھی کرے بات کرنا تو کجا عموماً شب کا دربار ہوا کرتا تھا، کئی کوڑی قیمتی فانوس روشن ہوتے تھے، حاضرین کو شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور عطر ملا جاتا تھا جو شخص جاتا خواہ وہ کیسا ہی غریب کیوں نہ ہوتا اس کی یکساں خاطرداری ہوتی تھی۔ جلال شاہ کی عمر ۲۸ برس سے زیادہ نہ تھی، نہایت چھریرے جسم کا خوبصورت نوجوان تھا، غریبوں سے بخندہ پیشانی پیش آتا، اور امرا سے کسی قدر تبختر انہ وضع میں ملتا تھا، بات بہت کم کرتا تھا اور ایسا بہت کم اتفاق ہوا ہے جو وہ کبھی کھل کھلا کے ہنسا ہو۔ ہاں بعض وقت مسکرا دیتا تھا جب مولانا شہید پہنچے ہیں اور بائیں میں بیٹھنے لگے ہیں جلال شاہ نے دیکھتے ہی آپ کو اپنے پاس بلایا اور باصرار اپنے ہی پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا، آپ سادگی سے وہاں بیٹھ گئے، اب تک جتنی باتیں دربار میں ہوئیں سب مولانا شہید کو پسند آئیں، لیکن جب اس کے پاس تبرک شریف لائے گئے وہ سرتاپا کھڑا ہو گیا اس کے ساتھ سارا مجمع بھی کھڑا ہوا، مگر مولانا شہید آہستہ آہستہ سے پیچھے سرک کے ہو بیٹھے، اس رستخیز میں کسی کی نظر مولانا پر نہ پڑی لیکن جلال شاہ نے دیکھ لیا کہ یہ اجنبی شخص نہیں اٹھا، اُس نے ذرا بھی اشارہ نہیں کیا اور نہ رنگت پر کچھ غصہ نمودار ہوا جب زیارت ہو چکی اور خدام تبرکات کو انعام وغیرہ دے دیا گیا پھر وہ ہی سکوت جلال شاہ کے دربار میں حکمرانی کرنے لگا، اور ویسی ہی سلطانی جبروت معلوم ہونے لگی یہ ایک غیر معمولی بات ضرور ہوئی، جلال شاہ نے مولانا شہید کو اپنے پاس بُلا کے بٹھایا یعنے اپنی گدّی پر اور کن آنکھوں سے مولانا کی صورت کو تکتا رہا، مولانا ان نظروں کو جو غیر معمولی وضع کا جامہ پہن کے آپ پر پڑ رہی تھیں خوب اندازہ کر رہے تھے، مگر ابھی تک خاموشی تھی نہ جلال شاہ نے کوئی بات کی تھی نہ مولانا شہیدؒ ہی نے اس کو مخاطب بنانے کی کوشش کی تھی، تھوڑی دیر کے

بعد آخر جلال شاہ کی مہر سکوت ٹوٹی اور وہ بآہستہ (مگر ممکن السمع لہجہ میں) یوں گویا ہوا۔ آپ دہلی کے رہنے والے ہیں، شاہ صاحب نے جواب دیا ہاں، پھر وہ یہ کہنے لگا برسوں دن آپ ہی لوگوں کی وجہ سے ہم یہاں آجاتے ہیں۔ آپ جیسے اصحاب کی زیارت ہو جاتی ہے ورنہ ہمارے کہاں نصیب کہ ہم دہلی اور اہل دہلی کی خوش صحبت سے فیضیاب ہوں، اس کے جواب میں مولانا شہیدؒ نے ایسی رطب اللسانی کی کہ اس کے دل پر نقش ہو گیا، اور اسے آپ کی باتوں میں کچھ ایسا مزا آیا اُس نے فوراً دربار برخاست کیا، اور اپنے مریدوں کو ذکر[1] کرنے کے لئے اجازت دی

---

[1] ذکر مختلف ممالک میں مختلف طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی خاص قاعدہ ایسا مقرر نہیں ہے جس کی عام ذاکر پابندی کریں ذکر کی دو قسمیں ہیں، ذکر جلی اور ذکر خفی۔ ذکر جلی سے مطلب بآواز بلند خدا کی حمد کرنے یا خدا کے پکارنے کو کہتے ہیں، اور ذکر خفی خاموشی سے دل ہی دل میں مناجات پڑھنے کو کہتے ہیں، نقشبندیہ ذکر خفی کیا کرتے ہیں اور قادریہ ذکر جلی۔ مختلف صورتیں ہیں لیکن ان کا خال وخط قریب یکساں ہے۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے اپنی بیش بہا کتاب قول الجمیل میں ذکر جلی کی بابت یہ گوہر افشانی کی ہے ذاکر معمولی نشست سے بیٹھ جاتا ہے اور زور سے بائیں طرف مُنہ پھیر کے اللہ کی آواز حلق سے نکالتا ہے اور پھر گردن کو جھٹکی دے کے سیدھا ہو جاتا ہے۔

نماز کی نشست بیٹھ کے وہ اللہ کی آواز میں کہتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی آواز بلند ہوتی جاتی ہے وہ آواز پہلے دائیں جانب کی طرف رُخ کرکے نکالتا ہے اور پھر بائیں جانب سے، پھر اپنی ٹانگوں کو سمٹ کے اسی طرح بائیں جانب سے اللہ کا لفظ پکارتا ہے۔ اس کے بائیں سے دایاں رُخ ہو جاتا ہے، اس کے بعد اسی حالت میں اپنے بائیں گھٹنے کی طرف منہ کرکے پکارتا ہے "اللہ" اس کے بعد پھر دائیں جانب سے پھر بائیں پھر سامنے سے اللہ کا نعرہ مارتا ہے اور یہ بہت تیزی میں ہوتا ہے۔ نماز کی نشست میں اپنا مُنہ مکہ کی طرف کرکے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور کہتا ہے لا اس آواز سے اس کی ناف سے بائیں کندھے تک جنبش معلوم ہوتی ہے پھر وہ کہتا ہے "الٰہ" الٰہ کی آواز سے یہ معلوم ہوتا ہے گویا اس نے دماغ سے نکالی ہے اور پھر وہ الا اللہ ھو کہتا ہے اور بڑے جوش سے بائیں طرف سے اس جملہ کو دہراتا ہے۔

ذکر کی ہر اسٹیج (نوبت) ضرب کہلاتی ہے۔ یہ البتہ صدہا بار ایسی ضربیں لگائی جاتی ہیں اور جو اختلافات بیان کئے ہیں وہ صرف آوازوں کے پست اور بلند ہونے اور جسم کو دائیں بائیں حرکت دینے پر موقوف ہیں۔ بلاشبہ

سب سب اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے تمبوؤں یا مسجدوں میں چلے گئے، اور اب مولانا شہید یا نوجوان جلال شاہ تنہا رہ گئے۔ جلال شاہ نے کہا معلوم ہوتا ہے آپ شاہ اسمٰعیل صاحب ہیں، یہ سنتے ہی مولانا شہیدؒ کسی قدر حیران ہوئے اور دل میں کہا اسے کیونکر معلوم ہوگیا، آخر آپ سے نہ رہا گیا اور آپ نے جلال شاہ سے دریافت کیا اس نے مسکرا کے جواب دیا پہلے آپ یہ تو فرمایئے کہ آپ اسمٰعیل ہیں بھی یا نہیں۔ مولانا شہید نے اقرار کیا پھر اس پاکباز نوجوان نے ساری کیفیت بیان کی کہ میرے پاس کئی بار آپ کی تصویریں اور حُلیے لکھ لکھ کے لوگوں نے بھیجے، اور استدعا کی کوئی تدبیر

(بقیہ صفحہ ۱۴۰) جو زیادہ تر مشرقی سیاحوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ذکر جلی اور ذکر خفی کرتے ہوئے دیکھا ہے، مفصلہ ذیل ذکر خفی ہے اپنی آنکھیں اور لب بند کر کے دل کی زبان سے ذاکر یہ کہتا ہے اللہُ سامعٌ یعنی خدا سنتا ہے اللہ باصرٌ اللہ دیکھتا ہے اللہ عالمٌ اللہ جانتا ہے، یہ تینوں جملے نمبروار ترقی اور تنزل کرتے ہیں یعنی پہلا جملہ توصرف ناف سے سینہ تک کھینچا جاتا ہے، اور دوسرا سینہ سے دماغ تک اور تیسرا دماغ سے آسمانوں کے پرے تک نکل جاتا ہے اور پھر اسی طرح یہ جملے دہرائے جاتے ہیں اور نوبت بنوبت بڑھتے اور گھٹتے رہتے ہیں پہلے وہ نہایت پست آواز سے کہتا ہے اللہ اور داہنے گھٹنے سے بائیں زانو کی طرف پھر جاتا ہے اور اپنے سانس کی ہر تصعید میں وہ لا الہ کہتا ہے اور دوبارہ دم چڑھاتے وقت وہ اِلَّا اللہ کہتا ہے۔

تیسری ضرب سب سے زیادہ ہے جو صدہا بلکہ ہزاروں بار لگائی جاتی ہے اسی لئے اس تیسری ضرب کا لگانا قابل تحسین خیال کیا جاتا ہے۔

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی حبیب اللہ جو ضلع گاووں قصبہ کھس نری حدود پشاور میں رہتا تھا اس ضرب کے لگانے میں بہت مشہور تھا، ظہر کی نماز پڑھ کے ذکر کے پہلے حصہ لا الہ صعود دم کے وقت ضرب لگاتا تھا اور پھر ذکر کے دوسرے حصہ اِلَّا اللہ کی ضرب عصر کی نماز پڑھنے کے وقت دم چڑھانے میں لگاتا تھا گویا تین ساڑھے تین گھنٹے حبس دم کئے ہوئے بیٹھا رہتا۔

ذکر کا دوسرا ساتھی مراقبہ ہے جو مفصلہ ذیل ہے اللہ حاضری، اللہ شاھدی، اللہ معی۔ ان الفاظ کو دل میں یا آواز سے دہرا کے ذاکر پھر قرآنی آیتوں کی طرف رجوع ہوتا ہے جس کا بیان مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے کیا ہے (مگر یہ بیان خاندان قادریہ تک محدود ہے) جو آیتیں وہ قرآن کی پڑھتے ہیں ان سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ وحدت پرستی میں یہ لوگ کیسے ڈوبے ہوئے ہیں وہ آیتیں یہ ہیں "وہ ہی اول ہے، وہ ہی آخر (باقی برصفحہ ۱۴۲)

ساتواں باب

سکھ مذہب اور اُس کا بانی، سکھوں اور مسلمانوں کا اخلاقی اور ملکی برتاؤ، مولانا شہیدؒ کا سفرِ پنجاب

تھوڑی دیر کے لئے ہم مولانا شہیدؒ کو دہلی میں وعظ فرماتے اور سکھوں کے قابل رحم مظالم کی وقتاً فوقتاً افواہیں سنتے اور ان پر غور کرتا ہوا چھوڑتے ہیں، اور پہلے سکھوں اور مسلمانوں کے ابتدائی وسطی اور موجودہ آخری انیسویں صدی کے برتاؤ کا کچھ تذکرہ کرتے ہیں کیونکہ آئندہ ہمیں محمدیوں اور سکھوں کے باہمی مجادلہ اور مقاتلہ کی نسبت جس کا سب سے زیادہ پارٹ میدان کارزار میں ایکٹ کرنے کو مولانا شہیدؒ نے پسند فرمایا تھا اور آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ سکھوں سے دو دو ہاتھ کرنے میں صرف کر دیا تھا بہت کچھ لکھنا ہے۔ ناظران خونی اور فانی واقعات سے ہرگز دلچسپی نہیں لے سکتا جب تک اسے سکھوں اور مسلمانوں کے اس باہمی تعلق اور برتاؤ کا حال پورا نہ معلوم ہو جو دونوں گروہ ایک دوسرے کا کرتے تھے، اسی نظر سے ہم نے اپنے باب کا ایک بڑا جزو اسی پر قربان کر دیا ہے یہ بیان گویا ایک دروازہ ہو گا جس سے ہم بآسانی محمدیوں اور سکھوں کے جدال و قتال کے میدان میں داخل ہو کے فوراً رائے قائم کر سکیں گے کہ حق پر اور مظلوم کون اور کس کی طرف سے محبت اور کس کی جانب سے عداوت کی بھرمار رہی۔ سکھ مذہب جس نے خدا پرستی اور فقیری سے پیرایانہ وضع میں اس وقت اپنا جلوہ دکھایا ہے، ابتدائے پیدائش میں ایک بے گناہ مت تھا۔ اس کا معزز بانی نانک ہوا ہے جو قصبہ تلونڈی میں (جسے اب ننکانہ کہتے ہیں) دریائے راوی کے کناروں پر لاہور کے قریب ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ آدی گرنتھ میں جو سکھوں کے ہاں

انہیں قتل کرنے میں اپنی زندگی بسر کرے مفسد اور متمرد راج کے بعد گرو گووند سنگھ کا ایک پٹھان نے پیٹ میں چھری گھنگول کے فیصلہ کر دیا۔ اس نے مرتے وقت اپنا جانشین نامزد کرنے سے انکار کیا، اور اپنے پیروان سے کہا آئندہ تمہارا کوئی گرو نہ ہوگا صرف گرنتھ صاحب یعنے کتاب کالارڈ تمہاری حالت اور سورت میں رہنمائی کرے گا۔

مذہب سکھ اس کے بانی اور سکھوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی یہ مختصر کیفیت ہے جس کا خلاصہ زیادہ تر سکھوں کی مستند مذہبی کتابوں سے کیا گیا ہے۔ ہم اس پر کچھ رائے زنی نہیں کرنا چاہتے صرف اسی قدر لکھنا کافی ہوگا ناظر جب غور سے پڑھے گا خود اندازہ کرلے گا کہ ابتدا سے مسلمانوں نے سکھوں کے گرو کے ساتھ کیا کیا نیک سلوک کئے اور سکھوں نے اس کے مقابل میں مسلمانوں کے ساتھ کیسی نازیبا کارروائیاں کیں، یہ انصاف ہر مذہب کے ناظر پر چھوڑا جاتا ہے۔ اب ہم پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور مولانا شہیدؒ کے سفر پنجاب کے متعلق کچھ تازہ حالات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں مولانا شہیدؒ دہلی میں بدعت و شرک کی اصلاح کر رہے تھے، اور آپ نے ایک تازہ روح مسلمانوں کے مُردہ تنوں میں پھونکنے کا بیڑا اٹھایا تھا، پنجاب میں رنجیت سنگھ حکومت کرتا تھا، اس کی سلطنت میں مسلمانوں کی جو کچھ ناگفتہ بہ کیفیت تھی وہ قابل ماتم ہے جس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، بعض پنجابی چونکہ مولانا شہیدؒ کے بہت معتقد ہو گئے تھے، اس لئے آپ کو سکھوں کے قابل رحم اور مذہب اسلام میں دست اندازی کی خبریں پے درپے آرہی تھیں جب آپ سنتے سنتے دق ہو گئے تو آپ نے مصمم ارادہ کیا کہ پہلے بذات خود اس امر کی تحقیق کرنی چاہیئے اور پھر اس کا تدارک کرنا زیبا ہے۔

مولانا شہیدؒ نے اپنے خاص معتمد شاگردوں سے اپنے سفر کا ذکر کیا، انہوں نے ہمراہ چلنے کی اجازت طلب کی لیکن آپ نے منظور نہ کیا اور فرمایا میں تنہا ہی جاؤں گا میں ایک نفس کو بھی ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ صرف تمہیں اطلاع دینے سے یہ غرض ہے کہ تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا، اور اگر تم سے کوئی دریافت کرے تو یہ کہہ دینا اپنے کسی کام کے لئے

لہ سکھاں دی راج ویدی نی آصفو ۷۹۔

از آزاد کئے ہوئے ہیں، اس میں تمہیں جھوٹ بھی بولنا نہ پڑے گا اور سائل کی تسکین بھی ہو جائے گی۔

ہمیں صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے آپ پیاپیا نہ بھیس بدل کے عازم پنجاب ہوئے پہلے آپ انبالہ پہنچے یہاں اپنی مطلب برآری زیادہ نہ دیکھی۔ پھر آپ سیدھے امرتسر روانہ ہوئے ہاں یہاں کے مسلمانوں کی فلاکت زدہ حالت کا قہرناک نظارہ قابل دید تھا۔ علاوہ ان تشدد اور سختیوں کے جو اسلام اور مسلمانوں سے برتی جاتی تھیں، مسلمانوں کا کامل بت پرست بنا تھا یہاں تک کہ پیروں اور شہیدوں کی نماز ہونے لگی تھی، پیر غیب کے نام پر بہت زور شور سے روزے رکھے جاتے تھے۔ کہیں شیخ فرید گو مشکل کشا یا خدا یا نبی (معاذاللہ) اور خبر نہیں کیا کیا تسلیم کیا جاتا تھا۔ کہیں سید احمد کبیر کو اپنا نجات دہندہ مانا جاتا تھا۔ ایک عجیب طوفان بے تمیزی برپا تھا۔ کوئی گھر ایسا مشکل سے ہوگا جس میں کسی پیر شہید کی کوئی قبر نہ ہو اور اس پر کھلم کھلا سجدے نہ ہوتے ہوں، قرآن نہ کوئی پڑھتا تھا اور نہ اس کے معنے سمجھنے کا کسی کو علم تھا نہ ملا نہ واعظ نہ قاضی نہ مفتی غرض سوائے گنڈے تعویذ والوں کے دور دور کوئی نظر نہ آتا تھا، خدا اور نبی کو سچ مچ سب نے بھلا دیا تھا اور ان کے مقابل میں فرضی پیروں کو اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیا گیا تھا، بچہ بچہ اپنے کو صوفی کہنا اپنا فخر جانتا تھا اور جتنے گروہ صوفیوں[1] کے دنیا

---

[1] یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ صوفیوں کے متعلق اصول قرآن اور احادیث کے روشن اصول سے کہاں تک مطابق ہیں اگر باہم متضاد ہیں تو کن مسائل میں اختلاف ہے۔ میں اس پر بحث کرنے کی تکلیف برداشت نہ کروں گا صرف بزرگ ترین صوفیوں کے اصول اور ان کے مختلف گروہوں کا تذکرہ کرکے ناظر کے انصاف پر اس کا فیصلہ چھوڑتا ہوں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی میں اس مذہب کی بنیاد پڑ چکی تھی اور اس مذہب کے بانی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہوئے ہیں مگر کوئی اسلامی تواریخ مثلاً ابن اسحٰق، ابن ہشام، مدائنی، واقدی، طبری وغیرہ جو ابتدائے زمانہ کی تاریخیں ہیں اس امر کی شہادت نہیں دیتیں کہ ہم کس بات سے حضرت علی کو صوفی گردانیں، لیکن محققوں کی تحقیقات کے بموجب اس قدر معلوم ہوا ہے کہ تصوف ہندوؤں کے ویدانت اور کسی قدر دیسی اصول سے لیا گیا ہے یونانی حکماء کی قدیم کتابوں میں بھی اس مذہب کا پتہ لگتا ہے۔ سر ولیم جانسن نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ افلاطون نے [illegible] یونان کے حکماء سے علم تصوف سیکھا ہے۔ بایں ہمہ اس مذہب میں اسلام کی زبردست شان معلوم ہوتی ہے۔ [illegible]

میں گھس آنا اور متبرک کتابوں کو جلا دینا یہ ایک معمولی بات تھی۔ بعض خاندان اپنا وطن چھوڑ کے انگریزی پُرامن سلطنت میں چلے گئے تھے، اتنی بات بے شک قابل تعریف تھی کہ رنجیت سنگھ جہاں تک مولانا شہیدؒ نے تحقیق کیا بذات خود اتنا جابر اور ظالم نہ تھا، ساتھ ہی اس کے مسلمانوں کی طرف سے ہم اسے محتاط بھی نہیں کہہ سکتے یہ نظارہ تعجب سے دیکھا جائے گا۔ اس کے ناص محل میں کئی مسلمان عورتیں تھیں جن میں کوئی رنگریزاں اور کوئی ککڑ والی تھی پھر بھی اس کی پالیسی

(بقیہ صفحہ ۱۶۳ والے کے ہیں) جو کوئی مذہب صوفیہ کرام کی روحانی تعلیمات پر اپنے کو وقف کرتا ہے وہ گویا سفر پر روانہ ہوتا ہے اور سالک ہو جاتا ہے اس کی تمام زندگی میں جو اس کا کام ہوتا ہے وہ ریاضت نفس اور تسلیم و رضا ہے یہاں تک کہ اُسے ذات باری کے پورے علم سے کامل واقفیت ہو جائے۔

(۱) یہاں اسے خدا کی خدمت کرنے کا اوپدیش (نصیحت) دی جاتی ہے اور وہ اوپدیش یہ ہے کہ اپنا پہلا قدم خدا کے بسیط علم کے حاصل کرنے کی طرف بڑھائے۔ یہ گویا اس کے سفر کی پہلی منزل ہے، اور اُس کا نام عبودیت ہے۔

(۲) حالت عبادت میں ربانی اثر اور مقناطیسی کشش خدا کی محبت میں اسے مستغرق کر دیتی ہے اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منزل عشق تک جا پہنچا۔

(۳) یہ ربانی عشق تمام دنیاوی خواہشات کو جو اب تک اس کے دل پر محیط ہو رہی تھیں بالکل مٹا دیتا ہے اور اس کی دوسری منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس منزل کا نام منزل زہد ہے۔

(۴) اس منزل سے جب وہ آگے قدم بڑھائے گا فطرۃ کے بعید الفہم یا مغلق اصول کی تفتیش اور تفحص میں مراقبہ کرے گا اور ہمہ تن فکر ہو کے تفحص کا پتلا بن جائے گا اور خدا کے کاموں کی کنہ تک پہنچنے کے لئے اپنی پوری قوت سے کام لے گا پھر اسے درجہ معرفت حاصل ہو گا بشرطیکہ وہ اپنی جستجو میں کامیابی حاصل کرے

(۵) فطرۃ کے مغلق اصول کا یوں مصروفیت سے مراقبہ کرنا صوفی کے ضمیر کو پوری کشش کرنے کا باعث ہوتا ہے اور پھر اس کے ضمیری جوش کے بھڑکانے کے لئے بھی کافی ثابت ہوتا ہے۔ یہ بیخودانہ حالت گویا اس امر کی علامت ہے کہ اس کا دل ربانی جلووں سے منور ہو گا اور پھر اس منزل پر پہنچے گا جسے منزل وجد کہتے ہیں۔

(۶) اس منزل کے درمیان اُسے خود بخود خدا کی ذات کے علم کا القا ہو گا اور یہاں سے وہ اس منزل پر پہنچیگا جسے منزل حقیقت کہتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۱۶۵)

ایک دن مولانا شہیدؒ ایک سکھ حلوائی کی دکان پر دودھ لینے گئے ، ناواقفیت سے آپ اس کی دکان کے ذرا قریب پہنچ کے دودھ کے لئے پیسے دینے لگے حالانکہ ابھی آپ نے بڑھنے کا اور بھی ذرا آگے ارادہ تھا ، کیونکہ دکاندار بہت دور تھا اس تک ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا اس نے اتنے ہی دور سے غل مچانا شروع کیا اس موسلے نے میرا دودھ کا کڑاہاؤ ناپاک کر دیا ، اس وقت خیر ہی ہوئی ایک شخص مسلمان اس طرف آنکلا اور اُس نے چپکے سے دو چار روپے دے کے فیصلہ کر دیا

(بقیہ صفحہ ۱۸۰) کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کوئی صوفی بشرطیکہ اصل تصوف پر پورا عمل درآمد کرتا ہو قبر پرستی یا چرس یا بے ریش بروت اور خوش الحان قوالوں کی آوازوں پر گتیں بھری ہوں ۔ ہمارے مولانا شہیدؒ نے اپنے سفر پنجاب میں صرف برائے نام صوفیوں یا پہنچے ہوئے فقیروں کا جو کچھ شیوہ دیکھا وہ یہ تھا کہ وہ رنگین کپڑے پہن کے اور بڑی بڑی زلفیں بڑھا کے گور پرستی کریں اور گنواروں کو زبردستی قبروں کے آگے سجدہ کرنے پر مجبور کریں تصوف جس کا دوسرا نام شریعت محمدی ہے گو بعض اجزا نہایت مغلق اور بعید الفہم اس میں آمیز ہو گئے ہیں پھر بھی ایک چیز ہے بظاہر دونوں میں بعض بعض حالتوں میں تباین پایا جاتا ہے لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں ان دونوں کی نوعیت ایک ہی ہے ۔ جیسا نفس اسلام کل مذہبوں کا عطر ہے ، اسی طرح تصوف تمام مذہبوں مثلاً ہندوؤں کے ویدانت اور مسیحی انکسارانہ مذہبی اصول کے عطر کا مغز ہے ۔

علاوہ ان صوفیوں کے مشرقی اسلامی دنیا میں فقرا بھی قسم قسم کے موجود ہیں اور وہ بھی قریب قریب صوفیوں کے یا بالکل ویسے ہی ہیں (گو خفیف طور پر صوفیوں سے بعض باتوں میں نہ ملتے ہوں) ان کی باہم یہاں تک مناسبت ہے کہ جس شخص پر صوفی کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے اسی پر لفظ فقیر بھی عائد ہو سکتا ہے میں چاہتا ہوں ان فقرا کی مختصر کیفیت سے ناظر کو آگاہ کروں جو مولانا شہیدؒ نے پنجاب میں زیادہ تر ملاحظہ کئے اور اس وقت وہ اسلامی دنیا میں بکثرت پائے جاتے ہیں اس سے یہ معلوم ہو جائے گا فقیروں کے اصول کیا ہیں ، ان کے فرقے کتنے ہیں ، اور ان کے معز بانی کس سنہ میں اور کہاں کہاں پیدا ہوئے چونکہ ہمارے پیارے شہیدؒ نے فقیروں کی حالت کی بھی بہت کچھ اصلاح کی تھی ، اور زیادہ تر ہر ملک کا مسلمان کچھ ہندوستان پر ہی موقوف نہیں ہے کم و بیش فقیروں ہی کا معتقد ہے ، اس لئے ہمارے مشرقی ناظر کے لئے یہ نہایت ہی مناسب مقام ہو گا جہاں وہ ہر فرقہ کے فقیر کا تذکرہ اس کے معز بانی کے ساتھ ملاحظہ کرے گا یہ وہ بیان ہو گا جو عینی شہادت پر مبنی ہے ۔ (باقی بر صفحہ ۱۸۱)

ورنہ خبر نہیں کیا ناگہانی آفت مولانا شہیدؒ پر نازل ہوتی ۔ اس کی تصدیق ان ریاستوں میں جہاں سکھوں کا اثر اب تک موجود ہے، بخوبی ہو سکتی ہے، جموں وغیرہ میں دیکھ لیا جائے چنے والا تک روادار نہیں ہے کہ مسلمان اس کی دکان کے قریب آئے اور چنے خریدے بلکہ جب کوئی مسلمان لینے جاتا ہے دور سے پیسہ دکھاتا ہے اور زبانی کہتا ہے اتنے کے چنے لوں گا فوراً اس نے چنے تولے اور دونے ہیں (اس لئے کہ یہاں ہر چیز حتی تیل تک دونے میں آتی ہے)

(بقیہ صفحہ ۱۷۹) فقیر معلوں نے اس امر کو بہت دھوم دھام سے ثابت کیا ہے کہ فقیری حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت علیؓ سے نکلی ہے یہ تو محض ناممکن ہے کہ فقیروں کے بیشمار قواعد اور ان کی لاانتہا مذہبی تقریبات اور اصول سے کوئی آگاہ ہو سکے کیونکہ ان میں باہم اکثر اسلامی ممالک میں ایسی پوشیدہ اور رازدارانہ انجمنیں ہوتی ہیں جہاں کوئی دوسرا شخص کبھی جا نہیں سکتا اور ان کی کیفیت بالکل فرامیشن (فری میسن) والوں سے ملتی ہے پھر بھی جو کچھ اپنا ذاتی تجربہ اور مغربی سیاحوں کے سفرنامہ سے ملا ہے اپنے معزز ناظر کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سنہ[1] ہجری میں ۴۵ اہل مدینہ نے اور مدینہ والوں کی طرح اپنے کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کیا، انہوں نے وفاداری اور صداقت کی قسم کھائی کہ ہم نبی اکرم کے اصول پر ثابت قدم رہیں گے، پھر انہوں نے ایک جتھے کے پنتھ کی بنیاد ڈالی اور شب و روز مذہبی فرائض کے انصرام اور زہد و ریاضت نفس کشی میں اپنے کو موکر دیا، اپنے کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز کرنے کے لئے انہوں نے اپنا نام صوفی رکھا۔ یہ نام آخری زمانہ میں نہایت پرجوش مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ لیا جانے لگا۔ اور اب تک اس مقدس نام کا اطلاق اسی مسلمان پر ہو سکتا ہے جو دنیا کی نمود کو صاف [illegible] ترک کر دے اور اپنے کو نہایت محنت اور مشقت سے خدا کی یاد میں محو کر دے [illegible]۔ صوفیوں نے اپنے نام کے ساتھ فقیر کا لفظ بھی اور ملا لیا کیونکہ ان کے [illegible] یہ تھا جو اس شعر میں ادا ہوا ہے۔ شعر

آنچہ در دنیاست بر آزادگان آمد حرام ۔۔۔ خاطر جمع است در زیر فلک سامانِ ما

خدا کی بندگی میں تمام عالم کو بھول جانا صوفیوں کے مذہب کا اصل الاصول ہے۔ وہ نبی اکرم کی اس حدیث پر مٹے ہوئے تھے "الفقر فخری" یعنے فقیری میرا فخر ہے۔ نبی اکرم کے وصل سے پہلے (یعنی زمانہ حیات ہی میں) حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ذکر کے طریق علیحدہ علیحدہ بتلائے دیا از رسالت

[1] مصنف نے یہاں سنہ کا عدد نہیں لکھا (مترجم)۔

جب مولانا شہیدؒ علی الصبح کسی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو ایسا اتفاق بارہا ہوا کہ آپ نے سکھوں کو مسجد میں سوتا ہوا اور ناپاک کرتا ہوا ملاحظہ کیا، بعض خوب صورت مسجدیں ٹوٹ کر سکھوں کا گھر بن گئی تھیں اور اکثروں میں جیساکہ اوپر لکھا گیا سُور، کتّے، گھوڑے، بیل وغیرہ باندھے جاتے تھے، علانیہ طور پر اجازت نہ تھی کہ کوئی فرد بشر قرآن گلے میں لے کے نکل سکے اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا، قید خانہ بھیج دیا گیا اور اس کا قرآن زبردستی آگ میں ڈال

نمبر شمار	طبقہ نقراء	بانی	وطن بانی	سنہ ھ	سنہ ء
۶	رفیعیہ	سید احمد رفیع	بغداد	سنہ ۵۷۲	سنہ ۱۱۸۲
۷	سہروردیہ	شہاب الدین	بغداد	سنہ ۶۰۲	سنہ ۱۲۰۵
۸	کبرویہ	نجم الدین	خوارزم	سنہ ۶۱۷	سنہ ۱۲۲۰
۹	شرنبلیہ	ابوالحسن	مکہ	سنہ ۶۵۶	سنہ ۱۲۵۸
۱۰	مولویہ	جلال الدین رومی	کنواح	سنہ ۶۷۲	سنہ ۱۲۷۳
۱۱	بداویہ	ابوالفطن احمد	تانتا (مصر میں)	سنہ ۶۷۵	سنہ ۱۲۷۶
۱۲	نقشبندیہ	پیر محمد	قصر عرفا	سنہ ۷۱۹	سنہ ۱۳۱۹
۱۳	سعدیہ	سعدالدین	دمشق	سنہ ۷۳۶	سنہ ۱۳۳۵
۱۴	بختشیہ	حاجی بختش	کبرسہر	سنہ ۷۳۶	سنہ ۱۳۳۵
۱۵	خلواتیہ	عمر خلواتی	قیصریہ	سنہ ۸۰۰	سنہ ۱۳۹۷
۱۶	زینیہ	زین الدین	کوفہ	سنہ ۸۳۸	سنہ ۱۴۳۸
۱۷	بابیہ	عبدالغنی	ایڈریا نوپل	سنہ ۸۴۰	سنہ ۱۴۳۸
۱۸	بیرامیہ	حاجی بیرامی	انگورا	سنہ ۸۴۶	سنہ ۱۴۴۱
۱۹	اشرفیہ	اشرف رومی	چین ازنگ	سنہ ۸۹۹	سنہ ۱۴۹۳
۲۰	بکریہ	ابوبکر رافعی	الیپو	سنہ ۹۰۲	سنہ ۱۴۹۶
۲۱	سنبلیہ	سنبل یوسف بلوی	قسطنطنیہ	سنہ ۹۳۶	سنہ ۱۵۲۹
۲۲	گلشنیہ	ابراہیم گلشنی	قاہرہ	سنہ ۹۴۰	سنہ ۱۵۳۳

تک وہ اسی سرگرمی سے توہین اسلام کئے جاتے ہیں ۔ بے محابا سکھ ہر مسلمان کے مکان میں چلے آتے ہیں ۔ انہیں اختیار ہے چاہے جو کچھ چیز اُٹھا لیں اگر کھانا پکتا ہوا ہو تو اس پر سُور کی ہڈی ڈال کے پاک کر دیتے ہیں، اور خود وہیں بیٹھ کے نبیڑ جاتے ہیں ۔ ہر طرح سے ان میں دم کر رکھا ہے، کوئی دریافت کرنے والا نہیں ہے ۔ اگر آپ میرے ساتھ پشاور چلیں تو میں آپ کو یہ ساری کیفیت دکھاؤں ۔ مولانا شہیدؒ کو اس بوڑھے ولایتی کی معیت اچھی معلوم ہوئی اور آپ امرت سر سے پوشیدہ اس کے ساتھ لاہور پہنچے، کیونکہ امرت سر میں سکھوں کے مختلف حلقوں میں مولانا کے خلاف سرگوشیاں ہونے لگیں تھیں، جن کی آواز ہنوز حکام کے کان تک نہ پہنچی تھی ۔ مولانا شہید کا ظاہری لباس ایسا تھا کہ ان پر کسی قسم کا جرم بھی عاید نہ ہو سکتا تھا مگر یہ باتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں قانون کی حکمرانی ہو ۔ سکھوں کی عملداری میں بڑا جرم مسلمان ہونا تھا مجسٹریٹ کے سامنے جب کوئی جرم کسی مسلمان پر ثابت نہ ہوتا تھا تو اس سے سکھ ہو جانے کی درخواست کی جاتی تھی اور جب وہ انکار کرتا تھا تو اس پر یہ عظیم الشان جُرم قائم کر کے سزائے موت دی جاتی تھی ۔ چند کوتاہ قلموں نے سکھوں کے ان قابل رحم مظالم کو لوگوں کے دلوں سے نسیاً منسیا کرنے کے لئے مسلمان شہنشاہوں کے سر پر جابرانہ ظلم چھپکے ہیں، اور اپنی بے معنی تواریخ میں من گھڑت قصے گھڑ گھڑ کے انہیں بدنام کرنا چاہا ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ خاک ڈالے سے نہ مہتاب چھپ سکتا ہے ۔ نہ روشن آفتاب کی کرنیں ہاتھ لگاتے سے میلی ہو سکتی ہیں ۔ ایسی تاریخوں سے ہندوؤں کے بچے ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں، اور چھکے بے تکے ایسی کتابوں کو پڑھتے ہیں مگر مبصر کی نگاہوں میں وہ ساری باتیں بیہودہ اور لغو ہیں، غرض

بقیہ صفحہ (۱۹۱) ہو گر گوبند جی کئی کئی سال پہلے کی خبریں اس طرح بیان کر دیتے ہیں گویا اُن کی آنکھوں کے آگے ہو رہی ہیں ۔ دراصل وہ بے چارے سادے سیدھے بے لکھے پڑھے مسجد کے ملانے تھے ۔ اُن کے جانشین نے ان کے بعد انہیں خدا بنا دیا (معاذاللہ) اسی قسم کے اشد کفریات بکنے والے کی مولانا شہیدؒ مخالفت کرتے تھے ور (اصلی تصوف کے آپ بڑے حامی تھے ۔ اور خود بھی بہت بڑے صوفی تھے، میری اس توضیح سے ان بدگمانیوں کو کامل شکست ہے۔ جو مولانا شہیدؒ کی مقدس ذات پر لاعلمی یا تعصب سے قائم کی جاتی ہیں ۔ اور آپ کی والا صفات کا سچا مرتبہ معلوم ہوگا ۱۲

مولانا شہیدؒ امرتسر سے لاہور پہنچے، اور ایک سرائے میں جا کے قیام کیا۔ آپ نے ریاست کا رنگ دیکھ کے ولایتی کو علیحدہ کر دیا اور تاکید کر دی دن کو مجھ سے نہ ملے نہ کبھی بات کرے کیونکہ رنجیت سنگھ کا یہ حکم تھا اگر پشاور یا قندھار کا باشندہ کسی پردیسی سے بات چیت کرتا ہوا دیکھا جائے تو اسے اسی جگہ پر فوراً بغیر پوچھے گچھے سزائے موت دی جائے۔ صدہا بے گناہوں کی جانیں اسی طرح ضائع ہو چکی تھیں مگر ان کا انتقام لینے والا کوئی نہ تھا۔

سکھوں کا دستور ہے کہ وہ ہولے کر کے کھاتے ہیں، دہلی میں ہولے سوکھے بوٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں معہ شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں، مگر سکھوں میں انہیں ہولے نہیں کہتے، وہ ایک بڑے فولادی پنجرہ میں چیل، کوّے، کبوتر، تیتر، بینائیں، طوطے غرض مختلف قسم کے جانور بند کر کے پنجرہ کو کسی درخت سے لٹکا دیتے ہیں، اور پھر نیچے سے آگ دے دیتے ہیں، وہ زندہ پرند پھڑپھڑا کے بھن کے کوئلہ ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں صاف کر کے یہ ناخدا ترس کھاتے ہیں۔ اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے بھی ہولے کئے جاتے تھے اور یوں تڑپا کے انہیں مارا جاتا تھا۔ ہم ان شرمناک کارروائیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو سر بازار سکھ کرتے تھے۔ ہماری محمدی تہذیب اور قانون انگلشیہ ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان میں سے ایک بات کا بھی تذکرہ کریں، صرف اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ سکھوں کی قدرت میں جو کچھ تھا اور اُن کی بونگی عقل جتنے مظالم ایجاد کر سکتی تھی وہ انہوں نے بے گناہ مسلمانوں پر توڑے جنہوں نے اُف تک نہیں کی۔ ہم اپنے قول کی سند کے لئے ایک معتبر کتاب سے جو ایک ہندو صاحب ایکسٹرا اسینٹ کی تصنیف سے ہے، چند جملے سکھوں کے مظالم کی بابت نقل کرتے ہیں، جو انہوں نے غالباً کیا قطعی اسی زمانہ کا ذکر کیا ہے، جب مولانا شہیدؒ زندہ پنجاب میں تھے، چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

ابتدا میں سکھوں کا طریق غارت گری اور لٹیرے پنے کا تھا جو ہاتھ آتا تھا لوٹ کر اپنی جماعت سے تقسیم کر لیا کرتے تھے، اور بسبب ان کے لوٹ کے اور علاقے والوں و ریاست والوں نے ان کو نذرانہ دینا منظور کیا کہ وہ راکھی کہلاتے تھے۔

مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی، اذان یعنے بانگ بآواز بلند نہیں ہونے دیتے تھے، مسجدوں کو اپنے تحت میں لے کے گرنتھ پڑھنا اس میں شروع کرتے، اور اس کا نام ست گڑھ رکھتے تھے اور بچ کریا مانند اور ہندوؤں کے ان کو مطلق نہیں۔ شکاری اور شراب خوار ہوتے ہیں، اور گھوڑے پر چڑھے ہوئے روٹی کھاتے چلے جاتے ہیں، اور دیکھنے والے کہتے ہیں جہاں وہ پہنچتے تھے جو برتن مٹی استعمال کسی مذہب والے کا (خصوصاً مسلمان کا) پڑا ہوا ان کو ہاتھ آجاتا تھا پانچ چھتر اس پر مار کر اس میں کھانا پکا لیتے تھے یعنی پانچ جوتے اس پر مارنا اس کو پاک ہو جانا سمجھتے تھے۔

ناظر سوانح اندازہ کر سکتا ہے کہ ہندو مصنف نے جب یہ واقعہ بیان کیا ہے اور مجبوراً اس کے قلم سے بھی سرزد ہو گیا، پھر کون شبہ کر سکتا ہے کہ ہمارا محمدی رپورٹر غلط بیان کرے اوپر والے جملوں کے ہر ہر لفظ سے ٹپکتا ہے کہ ہندو مصنف سکھوں کے مظالم کا حال لکھنا نہیں چاہتا۔ مگر واقعات کا اظہار اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ دبی زبان ہی سے سہی ضرور قلمبند کرے، ہر ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مصنف قلم سے نکالنا نہیں چاہتا، اور وہ نکلے جاتے ہیں جیسے ایک شخص ایک قدم اٹھانا نہیں چاہتا، اور زبردستی اسے دھکیل کر کوئی شخص کہیں لے جانا چاہے۔

مولانا شہید نے القصہ لاہور میں پہنچ کر امرت سر سے بھی زیادہ سکھوں کے جابرانہ مظالم کا اور ہی چڑھا ہوا رنگ دیکھا، جہانگیر کے مقبرہ میں سے قیمتی پتھر اکھیڑ لئے گئے تھے اور گرنتھ پڑھنے کا مقام اسے بنا لیا گیا تھا، جس کا نام ست گڑھ رکھا تھا، سینکڑوں نام اور مسلمانوں کی قبریں اکھڑوا کے پھینکوا دی تھیں۔ فیصدی دس مسجدیں بمشکل مسلمانوں کے قبضہ میں تھیں اور نہیں سب پر سکھ ہی اپنا تسلط رکھتے تھے۔ کہیں گھوڑے بندھے ہوئے ہیں تو کہیں خود رہتے ہیں۔ کہیں گرنتھ پڑھنے کی جگہ ہے، تو کہیں بداعمالی کرنے کا مقام ہے۔

یہاں کے مسلمانوں کی حالت دو صورتوں سے قابل رحم تھی۔ پہلی صورت تو یہ تھی کہ انہوں نے قرآن و حدیث کے روشن احکام کو بھلا دیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایمان کے

ذکر اذکار میں قرآن و حدیث کو تو بالکل ہی اڑا دیا تھا۔ صرف کسی فرضی پیر شہید کے اقوال یاد رہ گئے تھے، جنہیں وہ کلام ربانی سے بہتر اور مستند گردانتے تھے یہ پہلا خونی نظارہ تھا جس سے پیارے شہیدؒ کے آنسو ٹپک پڑے اور وہ بے اختیار ہو گیا، نمازوں میں بجائے اللہ اکبر کے یا غوث اعظم لوگوں نے کہنا فرض سمجھ لیا تھا، اس سے زیادہ قہر خدا مسلمانوں پر اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ بداعمالی سے بالکل گمراہ کر دئے گئے خدا کی گوناگوں رحمتوں کا پرتو ان پر سے بالکیہ اٹھ گیا تھا بعینہ یہ کیفیت تھی اگر کسی کے آگے قرآن کی آیتیں پڑھو وہ منہ پھاڑے ہوئے دیکھتا تھا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے اور کس ملک کی بولی ہے ہاں پیروں، شہیدوں، ولیوں کی جھوٹی کرامتوں کی قلمی کتابیں اکثر ان کے ہاتھوں میں دکھائی دیتی تھیں، جو حد سے زیادہ کفر و الحاد کی طرف ان کو لے جانے میں کوتاہی نہ کرتی تھیں ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ کسی نہ کسی کا مرید ہو جانا جنت کو خرید لینا ہے، پھر گویا جنت ان کے باپ دادا کی ہو گئی۔ یہی کیفیت پیروں کی تھی، اور یہی حالت مریدوں کی تھی دونوں ایک ہی تھیلی کے بٹے تھے، یہ پہلا خونی اور فنا کر دینے والا نظارہ تھا جس نے مولانا شہیدؒ کو خون کے آنسو رلوایا، اور بعد ازاں اس سے دوسرے درجہ کا سکھوں کی دین اسلام کے ساتھ بے ادبی اور مسلمانوں پر ناقابل بیان مظالم تھے جو ہر عدالت ہر شاہراہ ہر محل اور سکھوں کے ہر مکان میں ہوا کرتے تھے یہ لکھنا فضول ہے کہ سکھوں نے کون کون سے ظلم مسلمانوں پر کئے بلکہ یہ لکھنا چاہیئے کہ کونسا ظلم دنیا میں ایسا باقی رہ گیا جو انہوں نے نہ کیا ہو۔ پنجاب میں ہمیشہ سے مسلمانوں کی آبادی تگنی ہے مگر یہ افسوس سے دیکھا جائیگا کہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں فیصدی ۷۵ مسلمان جلاوطن ہو کے انگریزی عمل داری میں چلے آئے تھے، اب سمجھ لیا جائے کہ سکھ مسلمانوں سے کیسا وحشیانہ برتاؤ کرتے تھے جس کی نظیر سوائے اندلس اور بیت المقدس کے تیسری جگہ نہ ملے گی، یہ مظالم نظر غور سے مولانا شہیدؒ نے دیکھے، اور آپ کی طبیعت پر ان افسوس ناک منظروں نے مہیب اثر کیا، آپ کا قطعی ارادہ ہو گیا کہ ان سکھوں سے حتی الوسع انتقام لینے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور جس تدبیر سے ممکن ہو مسلمانوں کو ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلوانی ضرور ہے کئی موقعوں پر آپ نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھے، اپنی نڈر طبیعت اور خطرناک بہادری سے کئی بار سکھوں کے مقابلہ میں

آٹھواں باب

سفر سے مراجعت، بے بنیاد افواہیں!

سید احمد صاحب سے ملاقت

جب مولانا شہیدؒ نے اپنے دلی مقاصد حاصل کرلئے تو آپ دہلی تشریف فرما ہوئے، فی الحال آپ نے اپنے ارادہ کی اطلاع کسی کو بھی نہیں کی نہ یہ بیان کیا میں کیوں گیا تھا کہاں کہاں کا دورہ کرکے آیا ہوں۔ یہ باریک اور رازدار باتیں اسی حد تک کام دے سکتی ہیں جب تک وہ عالم بطون میں رہیں، اور جہاں اُن کا انشا ہوگیا پھر ان میں فائدہ پہنچانے کا زیادہ مادہ نہیں رہتا۔ آپ نے اپنے داخلہ کے وقت سے کسی کو بھی اطلاع نہیں دی، آپ کا ارادہ جیسا رازدارانہ تھا اسی طرح آپ کا سفر بھی خاموشانہ تھا، سکھوں کی بے انتظامی کی وجہ سے پنجاب کے رستے بہت خراب تھے اکثر جاٹ اور قزاقی پیشہ زمیندار اکے دُکے پر حملہ کرتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ تنہا یا دو چار آدمیوں کے ساتھ بھی سفر کرسکے۔ اور علاوہ رہزنوں کے بھیڑیوں، بگھیروں تیندووں اور بعض اوقات شیروں کا بھی ڈر ہوتا تھا جو سالانہ صدہا آدمیوں کا صفایا کردیا کرتے تھے، مگر آپ کی حالت اس قابل نہ تھی کہ آپ قافلہ کے پابند رہتے، اور اسی کے ساتھ منزل بمنزل طے کرتے۔

سفر پنجاب میں بعض موقعے ایسے بھی پڑ گئے تھے کہ آپ کو چوبیس گھنٹے برابر چلتا رہنا پڑا، اور گھنٹہ بھر بھی آرام لینے کا موقع نہ ہوتا تھا، آپ کا مقصد عظیم، کام خطرناک اور حالت نازک تھی، کہیں ممکن ہوسکتا ہے کہ ان صورتوں میں آپ قافلہ کے ساتھ معیت کرسکتے؟

یہ صحیح ہے جس کا عظیم الشان بھروسہ دل سے خدا کی مدد پر ہو نہ اُسے کوئی چیز اذیت پہنچا سکتی ہے نہ اُس بہادر پر کبھی خوف طاری ہوسکتا ہے، وہ سو شیروں کا ایک شیر ہے، اور سو

اثنائے گفتگو میں یہ بھی تذکرہ کیا کہ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ شیر اور شیرنی بیٹھے ہیں، اور میں اپنے خیال میں محو ان کے آگے سے چلا گیا، نہ شیر نے مجھے دیکھ کے میری طرف جست کی نہ میں نے یہ دیکھ کے خوف کھایا کہ یہ شیر ہے مجھے کھا جائے گا۔

اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے کہ انسان کی آنکھ میں وہ کشش ہے اگر کسی جانور سے دو تین منٹ بھی مل رہیں تو وہ جانور کیا تو اپنی جگہ ہی پر بیٹھا رہے گا یا زمین پر گر پڑے گا یا بدحواس ہو جائے گا، جب تجربہ سے آنکھ میں اس درجہ کی مقناطیسی کشش ثابت ہوگئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دل میں جو گزرگاہ جلیل اکبر ہے اس سے ہزار چند زیادہ کشش نہ ہو اور وہ جس پر توجہ کرے اُسے پار نہ لنگھاوے، اس لحاظ سے ہمیں اس کو تسلیم کرنے میں کوئی بات مانع نہیں آتی کہ مولانا شہیدؒ کا دل پورا انسانی جوہروں سے اس طرح آراستہ تھا جس طرح کہ ربانی جلووں سے منور ہو رہا تھا، پھر بھلا یہ کیا تعجب کی بات ہے کہ شیروں نے آپ پر حملہ نہ کیا، اور آپ بھیڑیوں کے غول میں سے نکل گئے، انہوں نے کان بھی نہ ہلایا جب ایک بصیرانہ نظر انسانی جبروت میں ڈالی جائے گی، اور اس کی ماہیت پر دل کی آنکھوں سے دیکھا جائے گا تو اس بات کا ثبوت پورا مل جائے گا کہ انسان کائنات کے سر پر کھڑا ہوا ہے، اور اس کی ذاتی شرافت نے اسے تمام کائنات پر فضیلت بخشی ہے۔

مولانا شہیدؒ کا سفر میں جن جن حوادث سے واسطہ پڑا تھا اگر وہ مفصل بیان کئے جائیں، اور ان کی ماہیت سے ناظر کو آگاہ کیا جائے تو گویا میں نے ناظر کو دھوکا دیا، اور اسے دیرینہ کراتوں کے فسانہ کی بھول بھلیوں میں ٹپے ٹپے ٹوئیاں مارتا ہوا چھوڑ دیا۔ جہاں سے وہ فطرت کی گوناگوں قوتوں کی حالت اور نوعیت کو نہ سمجھ کے سخت پریشانی اور بے اطمینانی میں پڑ جائیگا اس لئے میں ان واقعات کا ذکر نہ کروں گا کیونکہ اُنہیں حل کرنے اور عام فہم بنانے میں جس قدر مجھے دقت پڑے گی اس سے کہیں ناظر کو سمجھنے میں طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لئے ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ بیٹھے بٹھائے ناظر کو خلجان میں ڈالوں بہتر ہے کہ دوسرے روشن اور صاف مطالب کی طرف اپنے قلم کو پھیروں۔

یہ بات بھی بیان کرنے کے قابل ہے کہ دہلی میں مولانا شہیدؒ کے بعد کیا کیا افواہیں

مخالفین نے بے پر کی اڑائیں، اور اپنے شامت زدہ خیالات سے آپ کی والا ذات پر کیا کیا اتہامات عائد کئے۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں پیارے شہیدؒ کا یہ سفر جس قدر ریخ کا اور ذاتی تھا اسی قدر خاموش تھا وقت کی مصلحت ہرگز اس کی مقتضی نہ تھی کہ آپ اپنے سفر پنجاب کا منشا کسی پر ظاہر کرتے یا یہ بھی بیان کرتے کہ میں سفر پنجاب پر روانہ ہوتا ہوں۔ جب محمدی گروہ میں سے یکایک مولانا شہیدؒ غائب ہو گئے اور مخالفوں کو جستجو کے بعد بھی نہ ملے تو ان کی طبائع میں خلجان پیدا ہوا اور وہ اس راز سربستہ کی جستجو میں اپنی عقلیں لڑانے لگے، بہت سے مخبر خاص اس کام کی انجام دہی کے لئے مقرر کئے گئے کہ مولانا شہیدؒ کے شاگردوں سے جہاں تک ہو سکے ان کا پتہ لگائیں یا وہ کہیں جمنا میں ڈوب گئے یا خودکشی کر کے راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ وہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں مولانا شہیدؒ کے ہمدرد بن کے حاضر ہوئے اور انہوں نے متعجبانہ لہجہ میں یہ دریافت کیا حضرت کئی دن سے ہم نے شاہ اسمٰعیل صاحبؒ کو نہیں دیکھا اور یہ بھی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں تعجب ہے کہ وہ کہاں تشریف لے گئے۔ اور یکایک ہمیں بے پناہ چھوڑ کے کہاں چلے گئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ خود متفکر تھے، اور انہیں اپنے پیارے بھتیجے کے یوں یکایک چلے جانے کا صدمہ سخت ہوا تھا گو وہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ اسمٰعیلؒ کا یوں چلا جانا ضرور معنے رکھتا ہے، اور اس میں اعلیٰ مقاصد کا مادہ مضمر ہے، پھر بھی آپ کو خصوصیت سے محبت تھی، آپ نے محض اپنی لاعلمی ظاہر کی اور کہا تم پتہ لگاؤ اگر تمہیں معلوم ہو جائے مجھے بھی اس کی اطلاع کر دینا۔

جن ناعاقبت اندیشوں نے اپنی خبیث طبائع کی بدولت یہ خیال کیا شاہ صاحب جھوٹ بولتے ہیں انہیں ضرور معلوم ہوگا وہ کوتاہ بین یہ نہ سمجھے شاہ صاحب کبھی جھوٹ نہ بولیں گے اسی خیال سے جاتے وقت مولوی اسمٰعیلؒ صاحب نے اپنے چچا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور اپنے خاندان کے ہر ممبر سے اپنا ارادہ ظاہر نہ کیا کیونکہ وہ جھوٹ بولنے کے نہیں اور جو شخص دریافت کرے گا انہیں کہنا پڑے گا اور اگر وہ یہ کہیں گے مجھے معلوم ہے بتانا نہیں تو نئے نئے شبہ

ہوگی اور سخت تنگ نہ کر دیا گیا ہوگا۔

دنیا بیگ وغیرہ کی آرزو یہ تھی کسی طرح ہمیں صحیح خبر اسمٰعیل کی موت کی مل جائے تاکہ ہم بھی کھلیں اور پھر نئی نئی من گھڑت باتوں کے خیال کرنے کا موقع ملے مگر وہاں پتہ ہی نہ چلتا تھا وہ بیچارے پنج بیچ کے بیٹھ رہے اور یہی پتہ نہ لگا کہ مولانا شہیدؒ کو زمین کھا گئی یا آسمان۔ بہرحال اس تذبذب آمیز خوشی میں بھی وہ کسی قدر مطمئن تھے کہ اسمٰعیل خواہ زندہ ہوں یا وفات پا گئے ہیں، غرض دہلی سے تو چلے گئے یہی ہمارا مدعا تھا اور یہی ہمیں حاصل ہوگیا کبھی نہ کبھی تو ہمیں خبر لگ ہی جائے گی۔ مخالفین کی یہ اطمینانی دل و دماغ کو تسلی بخش نہ تھی، نہ ان کی روحانی اضطراب کو دفع کر سکتی تھی گو وہ اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ اب ہم یقینی اس امر کو سمجھ لیں کہ اسمٰعیل ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے۔

سب سے زیادہ ایک لطیف بات جو یقیناً ناظر سوانح کی دلچسپی کا باعث ہوگی بیان کرنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک صوفی نے دنیا بیگ سے اپنا خواب[1] آکے اس وقت بیان کیا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب اس کی تھوڑی دیر کے بعد داخل دہلی ہوں گے۔ وہ خواب بڑا ہی مذاق کا ہے یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ صوفی نے درحقیقت خواب دیکھا تھا یا کچھ اینٹھنے کے لئے بطور خود تصنیف کر لیا تھا مگر بظن غالب یہ معلوم ہوتا ہے کہ صوفی نے وہ خواب ضرور ہی دیکھا ہوگا اور جیسے ہم اس کے خیالات دل کا پرتو اور مولانا شہیدؒ کے حق میں خوش آئندہ پیش گوئی خیال کر سکتے ہیں، خواب کا اختصار مفصلہ ذیل ہے۔

(صوفی دنیا بیگ سے بیان کر رہا ہے)

میں تہجد کی نماز پڑھ کے سو رہا میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جامع مسجد کے حجرہ میں بیٹھا ہوا ہوں، اور شاہ عبدالقادر جیلانی کا حجرہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ حجرہ کی وسعت آنکھوں میں نہیں سماتی۔ ہزاروں آدمی دست بستہ حاضر ہیں، اور جائے صدر پر شاہ عبدالقادر جیلانی جلوہ فرما ہیں، ربانی جلوہ کی حجرہ میں ایسی کثرت ہے گویا کئی آفتاب آکے بند ہوگئے ہیں اس روشنی پر بھی کسی کی آنکھوں میں چکا چوند نہیں ہوتی۔ آفتاب کی سی تیزی اس روشنی میں نہیں ہے

---

[1] تذکرہ عزیزی صفحہ ۱۹۵، ۲۹۵-۱۱

بلکہ چاندی سی خنکی پائی جاتی ہے، میں شاہ عبدالقادر جیلانی رح کے بہت ہی قریب ہوں۔ ہم سب فرحاں و شاداں ہیں، ایک کیفیت آ رہی ہے جس کے لطف کو میں تا زیست نہ بھولوں گا۔ ہر قسم کا ذکر ہو رہا ہے مگر لطف یہ ہے ایک شخص بولتا ہے اور معہ پیر دست گیر سب توجہ اور شوق سے سنتے ہیں، اثنائے گفتگو میں ایک شخص نے جو میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اسماعیل کا ذکر ہتک آمیز الفاظ میں کرنا شروع کیا، قاعدہ کے موافق سب سنتے رہے جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا شاہ عبدالقادر جیلانی رح نے فرمایا ہم نہیں چاہتے کہ ہماری مجلس میں ایسے شخص کا ذکر ہو جو دین خدا کا دشمن ہے اور اس نے اسلام کے مٹانے میں کمر باندھ لی ہے۔ یہ سن کر ذاکر نے عرض کیا اس نظر سے میں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ ہماری اس خوش صحبت میں دلچسپی بڑھے، بلکہ یہ موقع غنیمت جان کے عرض پرداز ہوں کہ ایسے سرکش دشمن ایمان کو حضور کے دربار سے سزا ملنی چاہیئے۔ اس نے دین خدا میں رخنہ ڈال رکھا ہے اور آپ جیسوں کی نسبت کلمات توہین آمیز کہتا ہے یہ کہہ کے وہ چپکا ہو رہا، پھر شاہ عبدالقادر جیلانی رح نے اس سے کہا تو نہیں جانتا ہم نے اس کے قدموں کو دہلی کی سرزمین سے کاٹ دیا ہے بلکہ وہ کبھی کا دنیا سے بھی رخصت ہو چکا ہے واقعی مجھے گوارا نہ تھا کہ ایسا رخنہ انداز اسلام زندہ بچے، ابھی شاہ عبدالقادر جیلانی رح یہ فرمانے بھی نہ پائے تھے کہ یکایک ایک خوفناک صدا سنائی دی اور حجرہ کی چھت ہم سب پر آ پڑی، اس صدمہ سے میں نے ایسا غل مچایا کہ میری آنکھ کھل گئی اور کل گھر والے میرے ساتھ اٹھ بیٹھے۔ یہ سنتے ہی دنیا بیگ بہت خوش ہوئے۔ پیر دست گیر کی بشارت اور پھر چھت کا گرنا، انہوں نے اپنی عقل کے مطابق پیارے شہید رح کے ناپید ہو جانے کا ثبوت سمجھا لیکن یہ خیال نہ کیا ایسے بے ادبوں پر خدا کی طرف سے چھت گرائی گئی جو بیچے حامی دین متین اور نبی اکرم ؐ کے پیارے کو رخنہ انداز کہیں۔ بہر حال صوفی کے خواب کے نکتے سیدھے ہو گئے، اور اس کے قول پر اعتبار کر کے دنیا بیگ نے کچھ زر نقد عنایت کیا۔

اس معاندانہ روح کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس پر یہ حالت گو پوری نہ سہی مگر کسی قدر گذر چکی ہے وہ جان سکتا ہے کہ انسانی فطرت کی مایوسی جب چاروں طرف اسے مخالف دکھائی دیتے ہیں کس درجہ تک بڑھ جاتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جس دن مولانا شہید داخل شہر دہلی ہوتے

ہیں، افواہوں کا یہ طوفان بے تمیزی برپا تھا جس کی نظیر ہندوستان کی تواریخ میں اور کہیں ملنی مشکل ہے۔

پیارے شہیدؒ کے داخل شہر ہوتے ہی مخالفوں نے ایسی چپ کھینچی گویا انہیں سانپ سونگھ گیا، اب وہ حیران تھے کہ یہ بھید کیا ہے، خبریں تو ایسی گرم گرم اڑ رہی تھیں اور یہ یکایک زندہ آ کہاں سے پہنچے

غرض علاوہ وعظ و تعلیم کے مولانا شہیدؒ نے سکھوں سے انتقام لینے کی بھی پوشیدہ ہی پوشیدہ تدبیر کرنی شروع کی۔ خیال کرتے کرتے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ سید احمد صاحبؒ سے بھی جو آج کل شہر دہلی میں تشریف رکھتے ہیں مشورہ کرنا چاہیئے۔

مولانا شہیدؒ کی طبیعت میں سکھوں سے انتقام لینے اور مسلمانوں میں توحید پھیلانے کا شعلہ بھڑک رہا تھا، آپ اپنے ہم خیال کی تلاش میں لگے ہوئے تھے کہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ اس کام میں سرگرم ملے تو میں اس کا مطیع بن کے ان سخت تر فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہوں یہ ظاہر تھا کہ ایک غیر معمولی پر جوش شخص جیسا مطیع بن کے محتاط بن سکتا ہے اور قابل تحسین کام کر سکتا ہے بطور خود حکمران ہو کے ہرگز نہیں کر سکتا۔ کہیں اسے اپنے عہدہ کا خیال ہوتا ہے اور کہیں اُسے مختلف دقتوں کی پیچیدگی میں پڑ کے ان سے نکلنے کا تصور بندھا رہتا ہے۔ کہیں اپنی کامیابی کے لئے نئی نئی صورتیں نکالنی پڑتی ہیں۔ کہیں عظیم الشان مشکلوں کو جو اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اٹھانا پڑتا ہے یہ سارے خیالات یہ سارے منصوبے یہ ساری تدبیریں اسی وقت تک عمل میں آسکتی ہیں کہ جب وہ افسری کے گراں تر بار سے سبکدوش ہو اور کسی لائق شخص کی ماتحتی میں ہو کے کام کرے، پیارا شہید خوب سمجھتا تھا کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جم سکتی، اور یہ کام جب تک کہ اس میں مدت مدید نہ صرف کی جائے کبھی نہیں نکل سکتا۔ یہ مانا کہ آپ کی بے آرام روح اور غیر معمولی اصلاح اور انتقام کا اشتیاق لمحہ بلمحہ طبیعت کو گدگداتا تھا مگر دور اندیش عقل اور سنجیدہ فکر اس کی بے چینی کو حد اعتدال سے نہ گزرنے دیتا تھا۔ آپ کے سب سے زیادہ مشیر اور آپ کی سرگرمی میں جان ڈالنے والے مولانا عبدالحی صاحبؒ خویش شاہ عبدالعزیز صاحب تھے، روز مرہ مشورہ ہوتا تھا، اور نئی نئی باتیں اپنی کامیابی کی سوچی جاتی تھیں۔

ایک دن مولانا عبدالحی صاحبؒ سید احمد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو شاہ

عبدالقادر صاحبؒ کی مسجد میں مقیم تھے۔

آپ ۱۸۱۶ء کے اختتام پر اول ہی بار دہلی میں تشریف لائے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے قرآن و تفسیر و حدیث کی تعلیم پائی تھی۔ عموماً لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے گو آپ کو ظاہری علم سے بہت کم حصہ ملا تھا مگر آپ کا دل ربانی جلووں سے منور ہو رہا تھا اور آپ کے دل میں بھی سکھوں سے انتقام لینے اور توحید پھیلانے کا از حد شوق تھا۔ آپ کا اتقا اور صفائی قلب اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے علماء آپ کے معتقد بن گئے۔ جب سید احمد صاحبؒ نے مولانا عبدالحی صاحبؒ کو دیکھا اپنی بے مثال قوت قلب سے آپ کے دل پر اثر ڈالا اور وہ صرف یہ تھا کہ اپنے خیالات جو بالکل نکھرے ہوئے اور پاکیزہ تھے مولانا موصوف پر ظاہر کئے اور بہت سی باتیں ان ہی منصوبوں کے متعلق بھی بیان کیں یہ سنتے ہی مولانا موصوف سید احمد صاحبؒ پر فریفتہ ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا جس رہنما کی ہمیں تلاش تھی وہ مل گیا اس سے بہتر اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈھیں گے تو نہ ملے گا، طبیعت کا بے لوث پن اور پاکیزگی عموماً ایسے نقوش بہت جلد قبول کر لیتی ہے جو اس کے خیالات کے مطابق ہوں خواہ وہ ایک معمولی انسان کی زبان سے کیوں نہ سرزد ہوتے ہوں برخلاف اس کے سید احمد صاحبؒ غیر معمولی ذکاوت اور لاثانی لیاقت کے شخص تھے آپ کی دور اندیش طبیعت کی ایک متعصب[1] مورخ بھی تعریف کرتا ہے پھر بھلا اس سے کیونکر تعجب ہو سکتا ہے کہ سید احمد صاحبؒ نے مولانا عبدالحی صاحبؒ کو اتنی جلدی اپنا شیدا بنایا جتنی جلدی سنگ مقناطیس سوئی کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے، جب مولانا موصوف دل سے سید احمد صاحبؒ کے والہ و شیدا بن گئے تو آپ نے پیارے شہیدؒ کو جا کے یہ سارا ماجرا بیان کیا، اس عرصہ میں مولانا شہید یوں تو کئی بار سید احمد صاحبؒ سے مل چکے تھے، لیکن خاص استفادہ کے ارادہ سے کبھی نہ حاضر خدمت ہوئے تھے۔ آپ نے یہ سنتے ہی فرمایا مجھے اس عظیم الشان فرض کی انجام دہی میں سید احمد صاحبؒ کی متابعت لازم ہے اور ہمارے مقاصد کا بر آنا اور ہماری امیدوں کی کامیابیاں صرف سید احمد صاحبؒ کو اپنا مرشد بنانے میں حاصل ہوں گی۔

نادیدہ جمال او دہرش بدلم سرزد   ناکاشتہ میر و یدہ دانا نہ چنیں باید

---

[1] دی انڈین مسلمان مصنفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ ۱۲۔

دوسرے دن مولانا عبدالحی صاحبؒ اپنے ساتھ پیارے شہیدؒ کو لائے اور بہت سی رازدارانہ باتوں کی بابت مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے سید احمد صاحبؒ کی خاص باتوں میں اطاعت قبول کی اور سنت نبویؐ کے مطابق بیعت کی، اس بیعت کی نسبت ایک متعصب انگریز مورخ یہ لکھتا ہے:۔

"سید احمد صاحبؒ کے پہلے دو مرید وہ شخص تھے کہ جو اپنی لاثانی ضمیری جوہروں اور علمی قابلیتوں میں اپنے وقت کے فرد اکمل تھے۔ یہ دو فرد اکمل دہلی کے سب سے بڑے ڈاکٹر (حکیم) یا فاضل اجل کے کنبہ سے تعلق رکھتے تھے، جس نے انہیں بطور خود اپنی ہی نگرانی میں مذہبی تعلیم دی تھی۔ یہ دونوں مذہبی رنگ سے رنگے ہوئے تھے اور ان کے اصلاح پھیلانے کے جوش اور توحید کی اشاعت کے جذبے نے انہیں سید احمد صاحبؒ کا مرید بنا دیا۔"[1]

اس احترام اور اعتصام نے جوان فضلائے دہر اور حکمائے عصر نے اپنے ناخواندہ پیر کا غیر معمولی ادب سے کیا، اور بھی سید احمد صاحبؒ کی شان کو بڑھا دیا اور آئندہ ان کے ارادوں میں جان ڈال دی۔ ان کی عربی کے علم ادب اور علوم مختلفہ سے عظیم الشان واقفیت نے عام طور پر انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے پیر کے مہدیت کے لقب کی جس کو انہوں نے خود قبول کر لیا تھا، بہت زور شور سے تائید کریں اور لوگوں میں منوائیں، اس عقیدہ کے مطابق کہ خدا وقتاً فوقتاً اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے امام اور مجدد یا رہنما یا مصلح بھیجتا رہتا ہے تاکہ اس کی مخلوق کا ایمان ضعیف نہ ہونے دیں اور انہیں ایک حد تک قائم رکھیں، انہوں نے یہ ثابت کیا کہ سید احمد صاحبؒ میں یہ تمام صفتیں اور نشانیاں پائی جاتی ہیں اور وہ خدا کی طرف سے توحید پھیلانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اوّل بڑی بات یہ تھی کہ سید احمد صاحبؒ سید تھے، آپ کے مذہبی وجدان کے انبساطی جوہروں سے جس زمانہ میں کہ آپ نے خدا اور نبی کی زیارت کی تھی اور بلحاظ گہری پناہ دینی اور عجیب وضع اور طرز و انداز میں ان دو ڈاکٹروں نے اپنے پیر کو نبی اکرمؐ سے مشابہت دی۔ ان بارہ اماموں میں سے جو دنیا میں تجدید توحید کریں گے اور دنیا کو راہ راست پر لائیں گے۔ ہندی بعض مسلمانوں کے عقائد کے مطابق چھ امام آئے اور چلے گئے چار امام اور آئیں گے، اور یوں ہی اصلاح کریں گے۔ اس پاک سلسلہ میں سید احمد صاحب کا دوسرا نمبر شمار ہوا ہے۔ خواب میں آپ نے دیکھا تھا کہ نبی اکرمؐ کی چہیتی بیٹی فاطمۃ الزہراؓ

[1] دی انڈین مسلمان مصنفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ص ۱۱ ۔ [2] دی انڈین مسلمان مصنفہ ہنٹر ص ۵۲،۵۳

(حیات طیبہ ص ۱۰۹)

اور آپ کے معزز سرتاج حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ مجھ سے ملاقی ہوئے ہیں جو آپ کے معزز آباؤ اجداد تھے۔ بیٹے کے موافق انہوں نے سید احمدؒ پر نوازش کی اور خوشبوؤں سے آپ کو غسل دیا اور شاہانہ پر جلال پوشاک پہنائی۔

بہر حال یہ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں جو انسان بھیجا گیا ہے خواہ ادنٰے بنا کے یا اعلیٰ بنا کے اسے ضرور قوانین قدرت کی متابعت کرنی پڑتی ہے۔ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم آخر الزمان نبی تھے اور یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے اگر آپ کی خواہش ہوتی تو بلا زحمت اٹھائے بھی خدا میں یہ قدرت تھی کہ کفار کے دلوں کو آپ کی طرف پھیر سکتا تھا مگر منشائے الٰہی اس سے ساقط ہوتا تھا، اس نے نبی اور سب سے پیارے نبی کو بھی مجبور کیا کہ قوانین قدرت کی پیروی کرے اور اُن پر اسی طرح پابند ہو جیسے عام آدمی ہوتے ہیں یہ ایک بڑی حکمت تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو دنیا کا انتظامی ڈھانچا کبھی کا توڑ مروڑ کر پھک جاتا، اسی طرح سید احمد صاحبؒ کی زیادہ کامیابی صرف پیارے شہیدؒ اور دوسرے درجہ پر مولانا عبدالحی صاحبؒ کے معتقد بننے سے ظہور پذیر ہوئی والا حسبی اور اعلیٰ نسبی اور اس پر شرافت علمی نے پیارے شہیدؒ کو سید احمد صاحبؒ کا جان نثار معتقد بنا دیا، سید احمد صاحبؒ اگرچہ ناخواندہ تھے پھر بھی آپ کے دل پر القائے ربانی کا پرتو پورے طور سے پڑا ہوا تھا اور آپ کی انتظامی حالت میں جان ڈالنے کے لیے شاہ اسمٰعیلؒ اور مولانا عبدالحی حکمائے عصر کی ضرورت تھی، جن کی دھواں دار اسپیچوں نے ایک تہلکہ ہندوستانی سرحدوں میں ڈال دیا تھا۔ اور جن کے زبردست اثر نے نیا رنگ سید احمد صاحبؒ کی کامیابی پر چڑھا دیا تھا۔

غرض جب پیارے شہیدؒ کا اطمینان ہوگیا، اور آپ نے اپنی تدبیروں اور نتھرے ہوئے خیالات کا بازگشت پالیا تو اب دوسری تدابیریں سید احمد صاحبؒ کے مشورہ سے مصروف ہوئے، آپ کی غامض نظریں اور عمیق خیالات ان رازدارانہ مصلحت کا مادہ مضمر رکھتے تھے۔ جنہیں سوائے سید احمد صاحبؒ اور پیارے شہیدؒ کے یا مولانا عبدالحی صاحبؒ کے اور کوئی نہیں جانتا تھا، پولیٹکل معاملات کی پیچیدگیوں کا ہار جس کی گردن پر پبلک لائف میں قدم رکھتے ہی رکھا گیا وہ اسمٰعیل تھا جس نے تحمل سے اس بار کو سہائے رکھا، اور جبتک اس کے بناوٹی معتقدوں نے بے اعتدالی نہ کی، اور جبتک اس کی جان میں جان باقی رہی اس وزنی بوجھ کو اپنی گردن پر سے ماندہ ہو کے نہ اُتارا۔

نواں باب

جہاد کی تدبیریں، بعض واقعات کا ذکر

ہم پہلے بابوں میں لکھ آئے ہیں کہ مولانا شہیدؒ نے لوگوں کے دلوں پر نادر الوجود فتوحات علی التواتر حاصل کی تھیں، اور آپ کا اثر نہ صرف عوام الناس تک محدود رہا تھا بلکہ بڑے بڑے شہزادے اور امرا بھی آپ کی بابرکت ذات کو مسلمانوں کے حق میں اکسیر جانتے تھے اور ان کا اعتقاد یہاں تک بڑھا تھا کہ انہوں نے آخر کار یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اگر مولانا اسمٰعیل کا ظہور نہ ہوتا تو دہلی میں سے تو خصوصاً شرک و بدعت نہیں مٹتی، اس قابل تحسین کامیابی نے آپ کے رازدارانہ ارادہ میں جان ڈال دی، اور جس دن شہر دہلی میں یہ خبر ہوئی کہ مولانا اسمٰعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ دونوں نے سید احمد صاحبؒ سے بیعت کی ہے پھر کیا تھا ہزاروں آدمی آنے لگے اور صدق دلی سے آپ کی بیعت سے مشرف ہونے لگے، نہ ہزار کی گنتی تھی اور نہ دو ہزار کی ہر وقت مکان میں ایک مجمع لگا رہتا تھا اور معتقدین کے جوق جوق سرگرمانہ اعتقاد سے اپنے استاد کے پیر کی خدمت میں حاضر ہونا اپنی نجات آخرت سمجھنے لگے تھے، جب دہلی میں زیادہ کامیابی ہوئی تو سید احمد صاحبؒ قرب و جوار میں روانہ ہوئے، مولانا شہیدؒ ہمرکاب تھے، آپ کے پراثر زبردست وعظ سامعین کے کلیجوں کو ہلا ہلا دیتے تھے اور انہیں مجبور کرتے تھے کہ وہ سید احمد صاحبؒ کے مرید ہوں، اس وقت کئی سو آدمی ایسے بھی منتخب کئے گئے جو جوان اور مردمیدان تھے اور جن کی ذات پر میدان جنگ میں بھروسہ ہو سکتا تھا۔ یہ ایک پوشیدہ اور چھپی ہوئی کارروائی تھی جس کا حال کسی پر روشن نہ ہو سکتا تھا، ابھی تک نہ علانیہ طور پر کسی کو یہ علم تھا کہ سید احمد صاحبؒ اور آپ کے دوست یا مرید اسمٰعیل صاحبؒ کا ارادہ کیا ہے اور کیا کرنا چاہتے ہیں، ساتھ ہی اس کے جس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کے لئے جتنی صاب

رائے اور جرأت وشجاعت کی ضرورت تھی، اسی قدر کثیر التعداد آدمیوں اور بے انتہا سامان کی حاجت تھی اور یہ ضرور تھا کہ اس ارادہ سے عام ہندوستان کے مسلمان ہمدردی کریں اور ہر متنفس اپنی حیثیت کے موافق سکھوں سے انتقام لینے میں مسلمانوں کی مدد کرے۔

سید احمد صاحبؒ گو اعلیٰ درجہ کے روشن دماغ اور مدبر تھے لیکن حقیقت میں آپ کی ہمت میں جان ڈالنے والے اور آپ کی تدابیر میں نئی بات پیدا کرنے والے اسمٰعیلؒ و عبدالحئی تھے، سید احمد صاحبؒ کے خلق اور اتقار نے ان دو فضلائے دہر کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور یہ اس طرح سے سید احمد صاحبؒ کی خدمت کرتے تھے گویا ان کے حلقہ بگوش میں یا زرخرید غلام ہیں باہم مشورہ ہونے کے بعد طے پایا کہ مختلف شہروں میں مختلف آدمی روانہ کئے جائیں تاکہ وہ سید صاحبؒ کے ارادہ سے مسلمانوں کو آگاہ کریں اور جو کچھ اُن سے وصول ہو وہ سید صاحب کی خدمت میں روانہ کردیں جب یہ کام تمام ہوچکا تو سوا سو آدمیوں کے ساتھ سید احمد صاحبؒ نے خود بھی سفر کیا اور آپ انگریزی عملداری میں ہوتے ہوئے شیعوں کے دارالخلافہ میں پہنچے، قصبہ نصیر آباد میں جہاں محترم سید اپنے بھائی اسحٰق کی وفات پر تشریف لے گئے تھے شیعوں کے مجتہد سے خفیف سی رنجش ہوگئی تھی، گو بعض سوانح نویسوں نے اسے شاعرانہ مبالغہ سے بیان کیا ہے مگر وہ کوئی بڑی بات نہ تھی، صرف دیرینہ مذہبی کدورت کی ایک قابل شرم وجہ تھی، جس نے سلطنت لکھنؤ کو خواہ مخواہ تہلکہ میں ڈال دیا۔ سید صاحبؒ کے پاس گو نصیر آباد میں گنتی کے آدمی تھے مگر ان کے مریدوں کی کثیر تعداد بریلی میں بڑھی ہوئی تھی۔ تبرا جس کی مذہبی بنیاد شیعہ مذہب میں کہیں سے ثابت نہیں ہوتی، شیعوں کی حکومت میں برملا کہا جاتا تھا اور کوئی منع نہ کرتا تھا۔ محرم کے دنوں میں سید احمد صاحبؒ اپنے وطن مالوفہ میں پہنچے تھے اور یہی دن طوفان بے تمیزی کے برپا ہوتے اور بزرگوں کو گالیاں دینے کے بہت مشہور ہیں۔ وہ لوگ سالہا سال سے عادی تھے کہ سربازار تبرا کریں اور سنیوں کو کھجا دیں۔ مولوی حیدر علی صاحب جو مجتہد اعظم مولوی دلدار علی صاحب کے سالے تھے اس قصبہ میں چند ماہ سے مقیم تھے، انہوں نے پانچویں تاریخ محرم الحرام سید صاحب کو دوستانہ رقعہ لکھ کے اطلاع دی کہ کیا تو آپ اپنے بھائی سنیوں کو لے کے چار پانچ روز کے لئے باہر شہر سے تشریف

ے جائیں یا اگر آپ کو یہیں رہنا ہو تو اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے ہو بیٹھو، ورنہ باہمی کشش سے نتیجہ اچھا نہ ہوگا مومنین (یعنے شیعہ) اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے کے لئے آزاد ہیں، ان کا اس دینی کام میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ جوں ہی اس مضمون کا رقعہ مولوی حیدر علی صاحب کا محترم سید کو پہنچا۔ آپ نے مولوی اسمٰعیلؒ کے آگے رکھ دیا اس کا کیا جواب ہے۔ یہ لوگ اپنی حکومت پر غرہ کرتے ہیں پیارے شہیدؒ نے دور اندیشانہ یہ جواب دیا ہمیں شیعوں کی کمزوری اور بزدلی کا بخوبی علم ہے یہ رقعہ صرف گیدڑ بھبکی ہے۔ یہاں اُن کا اتنا زور بھی نہیں ہمیں اس کی کچھ پروا نہیں کہ دین کے لئے ہم کوئی چشم زخم اٹھائیں، اُنہیں لکھ دیا جائے کہ کیا تو ہم سے عام مجمع میں آپ مناظرہ کرنے پر راضی ہوں اور نہیں ہم آپ کو اطلاع دیتے ہیں اگر بازاروں یا سربستہ کوچوں میں ذرہ بھی ہرزہ سرائی کی۔ اور بزرگان دین کی شان میں گستاخی کی پھر ہم سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ رقعہ کا یہ گرم جواب دیکھتے ہی مولوی حیدر علی صاحب تو جان کے خوف سے اسی دن شب کو لکھنؤ بھاگ گئے اور اپنے مریدوں یا معتقدوں کو خبر نہ کی کہ سید احمد صاحبؒ یوں آمادہ ہیں انہوں نے حسب معمول تبرا بازاروں میں کہنا چاہا تھا مگر سُنیوں کی آمادگی سے وہ رُک گئے اور اب کے اُنہوں نے نہ کوئی مجلس کی، نہ تعزیہ داری کی اور آخر کار ایک ڈپوٹیشن لکھنؤ غازی الدین حیدر کی خدمت میں روانہ ہوا۔

سید صاحبؒ اور پیارے شہیدؒ کو شیعوں سے کچھ ذاتی پرخاش تو تھی ہی نہیں کہ خواہ مخواہ انہیں ستاتے اور اُن پر حملے کرتے، پیارے شہیدؒ اور واجب الاحترام شہیدؒ کے بزرگ چچا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ تو اکثر اپنے وعظ میں شیعوں اور شیعی مذہب کا ادب سے ذکر کرتے رہتے تھے اور یہی بہت بڑی تہذیب ہے کہ مخالف کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے۔ ہاں اس کے مقابل میں شیعوں کی تلخ تر عداوت کی کوئی بھی انتہا نہ تھی، وہ سُنیوں کو ایذا دینا اور انہیں خدا واسطے ستانا اپنے دین میں سکھوں کی طرح افضل اور اعلیٰ تر خیال کرتے تھے۔

اس عرصہ میں سید صاحبؒ تو مع اپنے معتقدوں کے بریلی چلے آئے، اور شیعوں کا ڈپوٹیشن روتا پیٹتا لکھنؤ پہنچا۔ یہاں مولانا مولوی دلدار علی صاحب جو شیعوں کے قبلہ و کعبہ اور مجتہد وقت تھے تشریف رکھتے تھے۔ وہ اپنے معتقدوں سے بھی زیادہ سُنیوں کے خون کے

نائب کی ایک لڑکی زینب نامی مجتہد کی شاگردن بھی تھی اور معشوقہ بھی تھی، مجتہد نے اس سے افشائے راز کے بعد جب وہ فطرتی وزن سے گرانبار پائی گئی متعہ کرنا چاہا۔ نائب نے آبدیدہ ہو کے کہا ظالم خاندان تک کی تو تو نے جڑ سے کاٹ دی اور اب بھی متعہ کرنا چاہتا ہے۔ غرض بڑی جھک جھک کے بعد اپنی بدنامی کے خوف سے مجتہد صاحب راضی ہوئے اور نکاح کر دیا گیا۔ مجتہد کی اور بھی کئی بیویاں تھیں۔ انہوں نے چشم نمائی کی کر کیا تو اسے نکالو نہیں ہم گھر سے نکل جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ پیدا ہونے پر اسے زہر دے کے پار اُتارا، اور نائب السلطنت کو ہاتھ سے ہاتھ ملتا ہوا چھوڑا۔

نائب ایک بڑا کائیاں اور ہوشیار شخص تھا، اس نے اس خونی راز کے ظاہر کرنے میں کچھ فائدہ نہ دیکھا، اور خاموشی سے انتقام لینے کی فکر میں لگا رہا۔

اس گفتگو اور سوال و جواب کے بعد معتمد الدولہ غازی الدین حیدر کے پاس گیا اور عرض کیا اگر حضور اجازت دیں تو میں سید صاحبؒ کو بلالوں تاکہ آپ فاضل اسمٰعیل کا وعظ جس کا بارہا حضور نے شوق ظاہر فرمایا ہے سن لیں، اور ساتھ ہی اس کے حضور ظل اللہ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جن پر مجتہد وقت نے یہ الزامات قائم کئے ہیں وہ کیسے مہذب اور شائستہ ہیں۔

یہ سن کے شاہ نے حکم دیا تم ضرور بلاؤ میں حکمران ہوں میری ایک آنکھ سُنی اور دوسری شیعہ ہے۔ اگر ان میں کوئی جھگڑا ہوگا تو آئندہ میں بے رو رعایت فیصلہ کیا کروں گا۔

معتمد الدولہ نائب السلطنت نے بریلی میں سید صاحبؒ کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور لکھا حضور اپنے مبارک قدموں سے لکھنؤ کو بدنصیب اور محروم نہ رکھیں گے اور اپنے مریدوں کے سحر آمیز وعظوں اور صداقت سے بھری ہوئی تقریروں سے ہمیں بھی شرف بخشیں گے، شاہ چشم براہ ہے اور حضور سے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق رکھتا ہے۔

جوں ہی یہ عریضہ پہنچا سید صاحبؒ متفکر ہوئے کہ چلیں کیونکہ وہ سُن چکے تھے، مولوی سید علی صاحب بھاگ کے چلے گئے تھے اور ڈپوٹیشن بھی کبھی کا پہنچ چکا ہوگا، ایسا نہ ہو ہمارے ساتھ دھوکا برتا جائے اور ہمیں غفلت میں ہلاک ہونا پڑے۔ سید صاحبؒ کا

خیال حقیقت میں نہایت ہی محتاط اور دور اندیشانہ تھا۔ پیارے شہیدؒ اور مولوی عبدالحی صاحبؒ نے اس پر بہت غور کیا، پھر آئندہ شہیدؒ نے یہ کہا کچھ خوف کی بات نہیں ہے۔ ضرور چلنا چاہیئے شاہ خلاف معاہدہ نہیں کر سکتا جو سرکار انگلشیہ سے ہوگیا دوسرے وہاں سُنی بھی بہت ہیں تیسرے فوج کا بہت بڑا حصہ سُنی المذہب ہے۔ ہمیں وہاں چلنے سے فائدہ بہت ہوگا۔ یہ باتیں سید صاحبؒ کی سمجھ میں بھی آگئیں اور اب آپ نے بریلی سے لکھنؤ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا زیادہ آدمی ہمراہ لے جانے خلاف مصلحت دیکھے۔ مبادا شاہ لکھنؤ کو بدگمانی ہو۔ دوسرے اتنے آدمی وہاں لے جانے مناسب بھی نہ تھے، کیونکہ جہاں سید صاحبؒ تشریف لے گئے اور مولوی اسمٰعیلؒ اور مولوی عبدالحی صاحبؒ نے وعظ فرمایا بس ہزاروں آدمی آ کے مسلمان ہونے لگے، پھر کیا ضرورت پڑی تھی کہ بھیڑ بھڑنگے کے ساتھ جا کے اپنے کو انگشت نما بنائیں۔

آپ نے اپنے روانہ ہونے کی اطلاع معتمد الدولہ بہادر کو کر دی، لکھنؤ میں ایک ہلکم مچ گئی کہ اسمٰعیل آتا ہے یہ تعجب سے دیکھا جائے گا کہ پیارے شہید کی جس قدر دھوم شہر بشہر مچ رہی تھی نہ سید احمد صاحب کی اتنی شہرت تھی نہ عبدالحی صاحب وغیرہ کی بچپن ہی کے زمانہ میں شہر در شہر لوگ آپ کی ذہانت اور علمیت کا چرچا کرنے لگے تھے، اور جب آپ نے وعظ کہنا شروع کیا ہے تو دو تین ہی برس کے عرصہ میں چار پانچ کروڑ مسلمانوں میں قریب قریب آپ کی شہرت یا ناموری ہوگئی تھی، سید احمد صاحبؒ آپ کے پیر تھے مگر ان کو خواص کے سوا عوام بہت ہی کم جانتے تھے۔ لکھنؤ کے گلی کوچہ میں یہ دھوم ہوگئی، اسمٰعیل مناظرہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ مجتہد وقت مولانا دلدار علی صاحب تھے، ان ہی کا گھر مرجع خلائق ہوگیا تھا، اور ہر شخص مناظرہ کے لئے مجتہد صاحب کو آمادہ کرتا تھا، مجتہد تو سناٹے میں تھے کہ کیا بندوبست کرنا چاہیئے، اور معمولی لیاقت کے طلبہ جامے کے باہر ہوئے جاتے تھے اور کہتے تھے ہم اسمٰعیل کو صرف باغ فدک کا سوال کر کے بند کر دیں گے۔ کہیں لکھنؤ کے خاندانوں میں اسمٰعیل کی آمد آمد کی خبریں نئے نئے لباس میں اُڑتی تھیں، اور پھر وہاں سے انوکھے رنگ میں رنگین ہو کے شہر میں پھیلتی تھیں۔ ساتھ ہی اس کے یہ سخت حیرت انگیز مقام ہے کہ ہر خبر میں پیارے شہیدؒ کی وقعت اور جلال علمی مخالفین کے دلوں کو تھرا تا تھا سب

سے بڑا خوفناک اثر مجتہد دلدار علی صاحب کے مقدس قلب پر ہو رہا تھا۔ مجتہد صاحب نے مولانا اسمٰعیل کی بے نظیر لیاقت اور بے مثال حاضر جوابی کی نسبت بہت کچھ سُنا تھا اور اُنہیں یقین تھا کہ اگر میں نے اس سے بحث کی اور آخر میں اس پر فتح بھی حاصل کی پھر بھی وہ ناک چنے چبوا دے گا۔ اگر میں نے اس پر فتح پائی تو کوئی بڑی بات نہیں وہ ایک پردیسی آدمی ہے۔ دو چار دن یہاں سے چلا جائے گا، تین دن چرچا کر کے لوگ بیٹھ رہیں گے، اگر خدانخواستہ میں کسی مسئلہ میں بند ہو گیا تو میرا لکھنؤ میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ان خونی خیالات پر بھی مجتہد صاحب خوب جانتے تھے کہ میں اسمٰعیلؒ کے مناظرہ سے پہلو تہی نہیں کر سکتا، میں خود کوئی بہانہ کرونگا شاہ مجھے مجبور کرے گا۔

اس فانی کشمکش میں ہمارے شیعوں کے قبلہ و کعبہ پھنسے رہے، اور ایک دن مولانا اسمٰعیل صاحبؒ اپنے مرشد سید احمد صاحبؒ کی ہمرکابی میں داخل شہر لکھنؤ ہوئے۔

شاہ کی طرف سے استقبال کیا گیا، جلوس معتمد الدولہ لے کے پہنچا، اور نہایت توقیر سے آپ رونق افروز لکھنؤ ہوئے۔

شاہ پیر محمد عرف مینا شاہ کی درگاہ کے قریب خیمہ زن ہوئے۔ بڑے بڑے تمبو نصب کر دئے گئے تھے، کیونکہ جب تک کوئی اعلےٰ درجہ کا مکان ایسا نہ تھا جہاں ایسے معزز مہمان فروکش ہوتے۔

لکھنؤ میں جو لہریں شیعی مذہب کے سمندر میں اُٹھ رہی تھیں وہ اب خوفناک طوفان سے بدل گئیں، اور ہر شخص پیارے شہیدؒ اور اُن کے پیر کی زیارت کرنے اور شکل دیکھنے کے لئے آنے لگا۔

مجتہد صاحب بجائے اس کے سید اور اسمٰعیل کی ابراہیمی یا حسینی طریقہ سے مہمان نوازی کرتے، انہوں نے صدہا جانباز شیعہ نوجوانوں کو آمادہ کیا کہ شب کو چھاپہ مارا جائے اور اسمٰعیل کا سر اُتار لیا جائے۔

یہ افسوس ناک خبر افسر فوج شاہی کو جو سُنی المذہب تھا پہنچ گئی، وہ دوڑا ہوا مجتہد کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُس نے علیٰحدہ لے جا کے لجاجتانہ لہجہ میں یہ کہا برائے خدا جادی

موافق ۲۱۱ آدمی تھے، جن میں سب پڑھے لکھے شریف اور مرد میدان اور قوی تھے۔ دوسرے دن سید احمد صاحبؒ دس آدمیوں کے ساتھ جن میں مولانا شہیدؒ اور مولوی عبدالحی صاحبؒ دائیں بائیں چلتے تھے، ہاتھیوں پر بیٹھ کے دربار میں تشریف لائے۔ محل کے دروازہ پر خود غازی الدین حیدر استقبال کے لئے موجود تھے۔ نہایت تپاک سے بخندہ پیشانی سید صاحب نے شاہ اودھ سے ہاتھ ملایا، پھر مولانا شہیدؒ اور مولوی عبدالحی صاحب نے مصافحہ کیا، اس کے بعد ہمراہیوں سے ایک ایک کرکے شاہ ملا۔ یہ ملاقات پرائیوٹ تھی، سوائے معتمدالدولہ اور مجتہد کے بادشاہی خاندان کے دو تین ممبروں کے اور کوئی نہیں تھا، پہلے بادشاہ نے سید احمد صاحب کی ممنونی ظاہر کی کہ آپ سفر کی تکلیف گوارا فرما کے یہاں تک تشریف لائے۔ اس وقت وہی معمولی جواب وسوال ہوئے، جو ہوا کرتے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک جب معمولی گفتگو ہوتی رہی تو غازی الدین حیدر نے دوسرا پہلو بدلا اور کہا میں چاہتا ہوں مولوی اسمٰعیل صاحب وعظ فرمائیں آپ کی خوش بیانی اور روانی تقریر کے آوازے تو بہت دنوں سے سنتا رہا ہوں مگر یہ اتفاق نہیں پڑا کہ اپنے کان سے آپ کے لاثانی وعظ کو گوش گزار کروں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میرے ہی شہر میں آپ قدم رنجہ فرمادیں، اور میں بغیر اٹھائے تکلیف سفر اور دوسری جگہ جائے بغیر آپ کے وعظ کو بآسانی گوش گزار کروں۔

سید صاحبؒ کی اجازت سے مولانا شہیدؒ نے وعظ کہنا منظور فرمایا، اور دوسرے دن جمعہ وعظ کے لئے قرار ہوا، پہلا وعظ جامع مسجد میں ہوا۔ مجتہد کے حواس باختہ تھے اور وہ کوشش کرتا تھا کہ غازی الدین حیدر وعظ میں نہ جائیں یہ محض ناممکن تھا، آخر وقت مقررہ پر معتمدالدولہ نائب السلطنت اور مجتہد کو ہمراہ لے کے غازی الدین حیدر آموجود ہوئے۔

سید صاحب اور مولوی عبدالحی صاحب کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ پہلے مولانا شہید ہی وعظ فرمادیں اور شیعہ مذہب پر بیان کیا جائے۔ معتمدالدولہ گو شیعہ تھا مگر مجتہد سے اسے کامل نفرت تھی اور اسی وجہ سے وہ مذہب شیعی کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا تھا، اور یہ کوشش کرتا تھا اگر غازی الدین حیدر مسلمان ہو جائے تو میں بھی ایمان لے آؤں۔

اب یہ بیان کرنا فضول ہوگا کہ مولانا شہیدؒ نے ایسا وعظ دیا اور ایسی زبردست تقریر کی

صرف اسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ مولانا شہیدؒ نے پوری آمادگی اور قابلیت سے وعظ فرمایا۔ مجتہد تو سناٹے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ اسمٰعیل بول رہا ہے یا خود خداوند تعالیٰ گفتگو کر رہا ہے غازی الدین حیدر آمادہ تھا کہ سُنی ہو جاؤں اگر ایک خیال جہانداری اور اپنی دلربا مہتاب بیگم کی محبت کا نہ آتا تو وہ ضرور عین جلسہ ہی میں بول اُٹھتا۔ عوام اور خواص میں سے سات سو آدمی مسلمان ہوئے، اور سب نے اپنے گزشتہ شنیعہ افعال سے توبہ کی، اور سید صاحبؒ کی بیعت سے مشرف ہو کے حلقہ غلامی میں آئے۔

کئی گھنٹے تک یہی وعظ رہا۔ چاروں طرف سکوت حکومت کرتا تھا اور سب کے سر ہلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، مخالف مخالف نہ رہا تھا اور ہر شخص تعریف کرتا تھا کہ ایسا بے ساختہ بیان مسلسل ہم نے کسی کا نہیں سنا۔ حافظہ اس بلا کا کہ بیسیوں کتابوں کا حوالہ اور ان کی عبارت کا نوک زبان پڑھنا یہ اور بھی سمجھ دار سامعین کی دلچسپی کا باعث تھا۔

جب آپ وعظ فرما چکے تو غازی الدین حیدر مصافحہ کر کے اور حد سے زیادہ تعریف کر کے روانہ ہوئے۔ معتمد الدولہ کہہ گئے ہیں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب رئیس علاوہ مجتہد صاحب کے جمع ہوئے، اور انہوں نے دوسرے دن کے لئے بھی عرض کیا، اور اپنی خواہش اسی مضمون کے سننے کی ظاہر کی۔ پیارے شہیدؒ نے قبول کر لیا مگر ساتھ اس کے یہ اعلان بھی دیا گیا کہ صبح کی نماز پڑھ کے تو مولوی عبدالحی صاحب وعظ فرما دیں گے، اور ظہر کے بعد اسمٰعیل کل کا بقیہ مضمون بیان کرے گا۔

مولوی عبدالحی صاحبؒ کے علم وفضل کی بھی کامل شہرت تھی، اور بڑے بڑے علماء آپ کی علمی لیاقت کے قائل تھے۔

دوسرے دن اندھیرے سے لوگ جمع ہونے شروع ہوئے، جامع مسجد میں خلقت کا ہجوم بہت تھا، کندھے سے کندھا چھلتا تھا، اور چلنے میں شانہ سے شانہ رگڑ کھاتا تھا۔ ایک کے اوپر ایک گرا پڑا تھا۔ شیعہ سُنی دونوں ہی گروہ کے لوگ بہت تھے، کوئی تمیز نہ ہو سکتی تھی کہ شیعہ کون ہے اور سُنی کون ہے، ڈاڑھی منڈوانے کی رسم ایسی عام تھی کہ کوئی بھی اسے عیب نہ خیال کرتا تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کے غرض مولوی عبدالحی صاحب کھڑے ہوئے اور ہمارے معتبر سوانح نویس

[illegible] صفحہ ۴۳۔

کے قول کے مطابق آپ نے "وذالنون اذذھب الآیۃ" تک قرآن کی آیت پڑھ کے وعظ کہنا شروع کیا، وعظ کا ایسا اثر ہوا کہ سامعین سکتہ کی حالت میں ہوگئے، اور ہرایک کے منہ سے واہ واہ کی آواز آرہی تھی۔ یہ بیان اس فصاحت و بلاغت سے ہوا کہ علمار فریقین (یعنے سُنی و شیعہ) جو موجود تھے وہ مولانا کے سحرانگیز تسلسل مضامین طلاقت لسانی قوت بیانیہ قرآن و حدیث سے واقفیت تامہ رکھنے میں قائل ہوگئے۔ اور یک زبان ہو کے یہ کہا حیف ہے ہماری ساری عمر جہل و نادانی میں بسر ہوئی مگر وادی کا ہنوز پتہ نہ ملا اور ہم نے منطق اور فلسفہ کے پیچھے پڑکے اپنی تمام عمر ضائع کردی"

پیارے شہیدؒ کی تقریر میں بڑا کمال یہ تھا کہ جہلا جس آسانی سے اُسے سمجھ کے دلچسپی لے سکتے تھے اور اس سے مستفید ہو سکتے تھے، اسی طرح فاضل اجل بھی دلچسپی کے ساتھ فائدہ حاصل کرسکتا تھا۔ مولوی عبدالحی صاحبؒ کا بینظیر قیمتی وعظ خصوصیت سے علما اور سمجھ دار دل ہی کو مزا دیتا۔ بعض اوقات جہلا مُنہ تکتے کے تکتے رہ جاتے تھے۔

حق یہ ہے مولانا شہیدؒ کو فطرۃ سے جن خاص صفتوں کا حصّہ ملا تھا وہ سب ممتاز تھیں۔ اور اُن میں خصوصیت کا رنگ ایسا تھا کہ دوسری جگہ کہیں بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مولانا شہیدؒ کے وعظ نے شیعی سرحدوں میں زلزلہ ڈال دیا تھا اور شیعی عمارت کی بنیادیں متزلزل ہوگئی تھیں۔ سخت متوحش نظروں سے مجتہد صاحب اور فضلا دیکھتے تھے کہ یہ آفت بیٹھے بٹھائے ہم پر کہاں سے نازل ہوئی، جس طرح محمود نے سومنات پر حملہ کیا تھا اور برہمن مندر میں بیٹھے یہ کہہ رہے تھے ہم آرام سے سنکھ بجاتے اور سومنات جی کے آگے ڈھوک (سجدہ) دیتے تھے، یہ آفت ناک بلا ہم پر کہاں سے آپڑی، یہی کیفیت علمائے اثنا عشریہ کی بھی تھی وہ باہم مشورہ کرتے تھے اگر اسمٰعیل سے مناظرہ نہ کیا تو لوگ کہیں گے ڈرگئے اور اگر مناظرہ کیا اور ہار گئے تو پھر جلا وطن ہونا پڑے گا۔ صلاح کرتے کرتے یہ بات قرار پائی کہ فرنگی محل کے سُنی علمار کو بھکاؤ اور اُن کو اسمٰعیل کے مقابلہ میں کھڑا کردو۔ جب ان سے بحث شروع ہوجائے گی بس پھر ہمیں سہل نجات مل جائے گی۔ اس وقت مولوی محمد اشرف صاحب علمائے فرنگی محل کے سرتاج تھے، مجتہد کے وہ دماغ تھے کہ شاہ کے پاس بھی کئی بار بلوانے سے جایا کرتے تھے، بھلا اور کسی شخص کے پاس

بلا کے سمجھایا تم جاؤ اور سید احمد صاحب سے چند سوال مذہبی اور چند ادب میں کرو، اور اگر وہ جواب دینے میں پس و پیش کریں تو اسمٰعیل سے لپٹ پڑنا، وہ بھی اگر بند ہو جائے تو عبدالحی کو نہ چھوڑنا غرض جتنے مولوی سید احمد کے ساتھ ہیں سب کے ناطقے بند کر کے آنا۔

مولوی ولایت علی صاحب عظیم آبادی خود بہت بڑے لائق شخص تھے، آپ فارغ التحصیل تو ہو گئے تھے مگر تبرکاً مولوی محمد اشرف صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، اور زبانی شبہ کے موقع پر دریافت کر لیا کرتے تھے، اور یہ بات تعریف کے قابل تھی کہ حق بات کو سمجھنے کی صلاحیت برخلاف عام ملانوں کے آپ میں موجود تھی، اور ساتھ ہی انصاف پسندی بھی اور ملانوں کے علاوہ آپ کا شیوہ تھا۔

اپنے بزرگ اُستاد کے حکم کے بموجب آپ پہلے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صاف دل سے اس امر کا اظہار کر دیا کہ میں اپنے چند شکوک رفع کرنا چاہتا ہوں۔ سید احمد صاحب نے ایسے موقعوں کے لئے خصوصاً مولوی اسمٰعیل کو خاص کر رکھا تھا فوراً وہ بلائے گئے، اور مولوی ولایت علی صاحب سے کہا گیا جو کچھ آپ کو دریافت کرنا ہو اسمٰعیل حاضر ہے استفسار کر لیجئے۔

مولوی صاحبؒ نے پہلے وہ شکوک دریافت کیے جو اُن کے اُستاد نے بتائے تھے، اور پھر اپنی طرف سے ہر بات پر جا کے اعتراض کئے، غرض جس قدر تحصیل کیا تھا کوئی بات بھی باقی نہ رکھی۔ ہر علم ہی میں سے سوالات کئے، جواب دو لفظی اور جامع ہوتے تھے، دوسری بار جواب کے بعد پھر جواب الجواب دینے کا موقع نہ ملتا تھا، مولوی ولایت علی نے چونکہ آپ کی طبیعت صلاحیت پسند تھی، اور آپ کا دل انصاف تاب تھا۔ بیتابی سے مولانا شہیدؒ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ دونوں ہاتھ چوم لئے، اور کہا آج آپ نے مجھے اپنا اچھا رام بنا لیا، پھر مولانا شہیدؒ نے سید صاحبؒ کی تعریف کی، قصہ مختصر یہ کہ ولایت علی نے صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور التجا کی کہ مجھے اپنی ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے کا حکم دیجے۔ احمد صاحب نے بخوشی منظور فرمایا، پھر ولایت علی صاحب اپنے استاد کے پاس آئے اور جو کچھ کیفیت تھی ساری بیان کر دی، مولوی محمد اشرف صاحبؒ کو ملائی

لے کے آیا تھا۔

خود کسے ناسزا چرا گوید　　نا سزا آں کہ ناسزا گوید

ابھی سید صاحب کو چار دن لکھنؤ میں آئے ہوئے گزرے تھے۔ دعوتوں کے صدہا پیغام سُنی اور شیعوں کے ہاں سے آچکے تھے، اتنی دعوتیں کیونکر منظور کر سکتے تھے۔ آپ نے عموماً نقد روپیہ لینے پر قناعت کی کیونکہ جس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کے لئے لاکھوں روپیہ کی ضرورت تھی، گو روپیہ کا نقد لینا کسی قدر بدنامی کا سبب تھا مگر جب لینے والوں کی نیتیں صاف نہیں اور وہ اسے خدا کی راہ میں صرف کرنا چاہتے تھے، پھر دوسرے شخص کو شبہ بھی نہیں ہوتا اور ہمیشہ دینے والا باطمینان تمام دے دیتا ہے اور جب مولانا شہیدؒ جیسا مطمئن کرنے والا ہو، پھر لوگ کیوں سرگوشیاں کرنے لگے اور کیوں انہیں بدگمانی ہونے لگی تھی۔ چوتھے دن کی شب کو چوبدار آیا کہ معتمد الدولہ تشریف لاتے ہیں۔ سید احمد صاحب ملاقات کے تمبو میں آ بیٹھے اور صرف آٹھ دس آدمیوں کے سوا کوئی بھی ان کے پاس اس وقت نہ تھا۔

نائب السلطنت کے آنے پر سید احمد صاحب مع مولوی اسمٰعیل صاحب اور عبدالحی صاحب کے کھڑے ہو گئے، اور بہت خاطرداری سے اپنے پاس بٹھایا۔ اس خوش باطن رئیس کو قدرتی طور پر سید احمد صاحب سے اُلفت بہت ہو گئی تھی، اور اُلفت صرف مولانا شہیدؒ کی تقریر کا صدقہ تھا ہر شخص یہ کہتا تھا جس کے مرید ایسے ہیں پیر خود کیسا ہوگا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر نائب السلطنت نے دعوت کے لئے کہا معمولی انکار کے بعد منظور کر لیا گیا اور دوسرے دن شام کو سید احمد صاحب مع اپنے صادق مرید اسمٰعیل اور عبدالحی کے ہاتھیوں پر بیٹھ کے معتمد الدولہ کے مکان پر تشریف فرما ہوئے، آج تو تقریباً کل ہی شیعہ سُنی مولوی جمع تھے۔ اور سوائے شاہ کے اکثر امرا بھی تھے۔ جلسہ نہایت پرتکلف اور امیرانہ تھا، ابھی آپ بیٹھے ہی تھے کہ اسمٰعیل صاحب پر سب کی تیز تیز نظریں پڑنے لگیں۔ نگاہوں میں استعجاب اور خوف کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا وہ برابر ٹکٹکی باندھ کے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی عجیب الخلقت چیز کو تکتے ہیں۔ پہلے آہستہ آہستہ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر مولانا سبحان علی خان صاحب جو ایک زبردست فاضل اور مقرر تھے آگے بڑھے اور معمولی تمہید کے

بعد مولانا عبدالحی صاحب رح سے کچھ دریافت کیا، خطاب مولوی اسمٰعیل صاحب کی طرف بھی تھا مگر سید صاحب کے اشارہ سے عبدالحی صاحب نے جواب دیا۔ سوال یہ تھا کہ حدیث "الحیاء شعبۃ من الایمان" کے کیا معنے ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب نے گھنٹہ بھر کامل اس کی تفسیر بیان کی، بڑے روشن ہال میں سوائے سکوت اور گردنوں کی جنبش کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بڑے بڑے علماء حیران تھے کہ یہ معنی یہ بے مثال تشریح ہم نے نہ کسی کتاب میں دیکھی نہ اپنے کانوں سُنی مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ خود ربّانی جلوہ ہے کہ اتنی چمک دے رہا ہے یہ کسبی امر نہیں ہے نہ کسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے ہاں جسے خدا چاہے تقریر تھی یا ایک برقی تحریک تھی جو برابر دلوں کو اپنی مٹھی میں دبائے لیتی تھی اور ایسی مقناطیسی کشش تھی جو قلوب کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی، تقریر کی عمدگی پر سب نے آفرین کی اور کسی میں مع مجتہد کے یہ یارانہ ہوا کہ ایک بات بھی مولوی عبدالحی صاحب سے اعتراضاً دریافت کر سکے، مشہور تھا جس مجلس میں مولانا اسمٰعیل ہوں وہاں نفس اعتراض فنا ہو جاتا ہے۔ اور لوگوں کے دماغوں اور دلوں سے ایسا محو ہو جاتا ہے کہ سوائے تسلیم و رضا کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں، لکھنؤ کا پر تکلف کھانا لایا گیا اور سب نے بطیب خاطر کھانا کھایا، عطر و پان کے بعد پانچ ہزار روپے معتمدالدولہ نے نذرانہ کے طور پر پیش کئے، سید صاحب نے لے لئے اور پھر وہاں سے رخصت ہو کے اپنے گھر چلے آئے۔

سید احمد صاحب رح نے لکھنؤ میں سوا مہینہ کے قریب قیام فرمایا، آپ کا ارادہ یہ تھا کہ مذہب شیعی کو متزلزل کر دیں، اور وہ چڑے چڑیا کی کہانیاں جن پر شیعوں کے مذہب کا دارومدار ہے، مذہبی عقائد سے برطرف کر دیں۔ مولوی اسمٰعیل صاحب کی آرزو تھی کہ کسی طرح مجتہد صاحب عام مجمع میں مجھ سے گفتگو کر لیں، مگر مجتہد صاحب حیلے کر کر کے ٹال دیتے تھے، کبھی ملکی معاملات کی پیچیدگی بیان کر کے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے، اور کبھی جگہ کے مقرر ہونے پر تامل تھا، اور کبھی اپنی بیماری اور پستی آواز کا بہانہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ مناظرہ کرنے سے بھی انکار نہ تھا۔ اور جب شیعہ عمائد کی طرف سے مجبور کئے گئے تو وعدہ کر لیا ہاں امروز فردا میں ٹالتے رہے۔ مجتہد ہی کے سبب سے سید احمد صاحب کو مہینہ سوا مہینہ

لکھنؤ میں قیام کرنا پڑا، اور نہیں لکھنؤ آنے سے جو منشا تھا وہ پورا ہو چکا تھا، غازی الدین حیدر خود دو بار ڈیرہ ہی میں شاہ مینا کی درگاہ پر قدمبوس ہو چکے تھے اور ایک سچی روایت کے بموجب شاہ اودھ نے یہ فرمایا تھا اگر مولوی اسمٰعیل صاحب برس دن میں یہاں رہ کر روز وعظ فرمائیں تو مجھ سمیت یہاں کا بچہ بچہ سنی ہو جائے گا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ اسمٰعیل جیسا نفس سید صاحب علیحدہ کر دیتے، اور اس موہوم کامیابی پر اپنے آئندہ عظیم الشان عزم کو خام چھوڑ دیتے۔ سید صاحب نے یہ جواب دیا تھا کہ مجھے بہت سے فرائض اسمٰعیل کی معیت میں انجام دینے ہیں، اس لئے میں اسے نہیں چھوڑ سکتا، الحمدللہ کہ آپ کی طبیعت میں سنی مذہب کی صداقت تو جمی امید ہے کہ آئندہ خیالات کی کامل اصلاح ہو جائے، جتنے وعظ اب تک اسمٰعیل یہاں دے چکا ہے اور آئندہ دے گا، ہدایت حاصل کرنے والے کے لئے کافی ہیں۔

مولوی اسمٰعیل صاحب رستہ دیکھتے دیکھتے بیقرار ہو گئے، اور مجتہد کے وعدے وعید سنتے سنتے تنگ آ گئے۔ آخر ایک دن آپ نے تنہا ہی جانے کا مصمم ارادہ کیا، سپاہیانہ لباس زیب تن کیا، پٹنچہ کمر میں اُڑسا شمشیر آبدار پہلو میں، غرض اس سج دھج سے مولوی دلدار علی صاحب کے مکان پر آئے۔ یہاں اکثر مجتہد صاحب کے معتقدین دست بستہ بیٹھے ہوئے تھے، اور بہت سے طلبہ کلینی وغیرہ کتابیں پڑھ رہے تھے۔ مولوی دلدار علی مجتہد کا مکان امیرانہ سامانوں سے آراستہ تھا، اور شاہی شوکت برستی تھی۔ نقیب چوبدار کونوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ باایں ہمہ ہر شخص اندر آنے اور مجتہد صاحب تک پہنچنے کے لئے آزاد تھا ہاں خلاف ادب کوئی کلمہ زبان سے نہ نکال سکتا تھا۔

مولانا شہیدؒ نے چوکھٹ میں قدم رکھتے ہی عجب پرشوکت دربار دیکھا اور سامنے مجتہد صاحب کو طلبہ کے ساتھ مشغول پایا، آپ دلیرانہ جا کے علیحدہ ہو بیٹھے اور السلام علیک کے سوا کورنش وغیرہ نہیں کی، جیسی وہاں کی اخلاقی اور مذہبی مجالس کا قاعدہ تھا۔ نئی سپاہیانہ صورت اور اس بیباکی کو سب نے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ مجتہد صاحب نے بھی اپنے ناخواندہ اجنبی مہمان کو کن انکھیوں سے دیکھ لیا، اور خاموش طلبہ کو سبق پڑھاتے رہے۔ مولانا شہیدؒ

صاحب یہاں آئے تھے، مجتہد صاحب نے اپنے خاص مصاحبین کو دوڑا دیا کہ جس طرح ہو منت وسماجت کرکے مولوی اسمٰعیل کو لے آویں۔

غرض مولوی اسمٰعیل واپس آئے، مجتہد نے اٹھ کے تعظیم دی معانقہ کیا اور معذرت کی کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ سپاہیانہ لباس میں جلوہ افزا ہیں، اس لئے اس وقت آپ کی تعظیم نہیں دی گئی، اب دوبارہ آنے پر اس مسئلہ کی نسبت کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا شہیدؒ اٹھ کے چلے آئے۔ مجتہد صاحب کے دل کو لگی ہوئی تھی، اپنے تمام شیعی علماء کو جمع کیا اور ان کے آگے یہ جھگڑا پیش کرکے استفتا لینا چاہا۔ سب نے مل کے اس کی بابت بڑی طول طویل بحث لکھی۔ صدہا کتابوں کا حوالہ اور عبارت بھی نقل کی اور یہ ثابت کیا کہ نفاق اور چیز ہے تقیہ اور بات ہے۔

جب یہ استفتا تیار ہوگیا مولانا شہیدؒ کی خدمت میں بھیج دیا گیا، جو شخص کاغذ لے کے گیا تھا اس کی ملاقات پہلے مولوی عبدالحی صاحبؒ سے ہوئی وہ سمجھا مولوی اسمٰعیل یہی ہیں۔ اس نے بڑے تپاک سے استفتا پیش کیا اور یہ عرض کیا مجتہد صاحب نے آپ کی خدمت میں ارسال کیا ہے۔

جونہی مولوی عبدالحی صاحب نے اس فتویٰ کو ملاحظہ کیا تو آنکھیں کھل گئیں۔ عبارت کا ادق اور پیچیدہ ہونا تو ایک معمولی امر تھا مگر سب سے زیادہ مشکل یہ تھا کہ اگر جواب الجواب لکھا جائے گا اس کے لئے صدہا کتب کی ضرورت ہوگی، اور حالت سفر میں ان میں سے ایک کتاب بھی پاس نہیں ہے، سوا اس کے کوئی چارہ ہی نہیں دیکھا کہ خاموشی اختیار کی جائے، آپ نے کئی کئی بار پڑھا مگر کوئی پہلو جواب کا نہ دیکھا، لیاقت تو پیچھے درکار تھی مگر پہلے کئی اونٹ کتابوں کے چاہئے تھے جن کا بہم پہنچنا محال تھا۔ جب جواب دینے کا کوئی رستہ نہ دیکھا آپ نے وہ کاغذ مولوی اسمٰعیل کے پاس بھجوا دیا، اس وقت مولانا شہیدؒ چہل قدمی کرنے گئے تھے، آدمی دریافت کرکے آپ کے پیچھے دوڑا، اور وہ کاغذ رستہ میں اسمٰعیل کو دیا۔ آپ سمجھ گئے کہ مجتہد صاحب نے یہ کارستانی کی ہے، کتابوں کے حوالے دیکھ کے پہلے آپ بھی چونکے مگر جب قوت حافظہ نے اس سے زیادہ کتابوں کا خزانہ اپنے میں دکھایا

یا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مولانا شہیدؒ نے کتابیں نہ ہونے پر اپنے کو خزانہ کتب پایا تو اُس کے جواب دینے میں اتنا پس و پیش نہ کیا فوراً اپنے ڈیرے میں واپس آگئے، بغیر دوبارہ پڑھے لکھنے بیٹھ گئے اور دو گھنٹہ کے عرصہ میں جواب الجواب مجتہد صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ جواب الجواب میں بھی بہت سی کتابوں کا حوالہ مع اُن کی عبارت کے درج تھا۔ ہم اس بحث کو یہاں لکھنا مناسب نہیں سمجھتے وہ طول طویل بہت ہے اور ناظرین کی دلچسپی کا باعث اس قدر نہ ہوگی، کیونکہ اس سے دلچسپی وہی شخص لے سکتا ہے کہ جسے صدہا کتب تواریخ وغیرہ پر عبور ہو نہیں تو یہ عالمانہ بحث اس کے سامنے معمولی تحریر سے زیادہ وقعت نہ رکھے گی، جوں ہی مجتہد صاحب نے جواب الجواب دیکھا آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اب اُنہوں نے کوئی چارا نہ دیکھا، سوا اس کے کہ کنوئیں میں ڈوب مریں یا کچھ کھا کے سو رہیں۔ علما کے آگے جواب الجواب پیش کیا گیا، انہوں نے کہا یہ بحث تمہارے لئے مفید نہیں ہے، ہم نے کئی دن میں مل کے جواب لکھا اسمٰعیل نے بغیر مدد کتب دو تین گھنٹے میں جواب لکھ دیا ضرور اسے موکلوں کا علم آتا ہے وہ ان سے کام لیتا ہے۔ نہیں آدمی کا حافظہ ایسا زبردست نہیں ہو سکتا کہ صدہا کتابوں کی عبارت اسے ازبر ہو اور بغیر دیکھے جس کتاب کی عبارت نقل کرے اصل میں اور بن دیکھے نقل کرنے میں ایک حرف کا بھی فرق نہ ہو۔

مجتہد سوائے خاموشی کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ہاں مختلف علما، کو مولوی صاحب موصوف کے خلاف بھڑکاتے رہے، ان باتوں سے کچھ نتیجہ نہ تھا، اور بہت سے حاسدوں نے مخالفت کی مگر ایک بھی پیش نہ چلی، آخر کامیابی کے ساتھ سید احمد صاحبؒ مع اپنے دوستوں کے بنارس چلے آئے۔ کل ممالک مغربی کا تقریباً چکر لگایا، اور ہر طرح سے جہاد کی تدبیریں کرلیں، کوئی شہر کوئی قصبہ ایسا نہ تھا کہ جہاں سید احمد صاحبؒ کے واعظ وعظ دیتے اور چند آدمی جمع کرتے نہ پھرتے ہوں، اسی اثنا میں آپ نے حج بیت اللہ بھی کر لیا، اور وہاں سے واپس ہو کے پھر اپنے عظیم الشان فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہوئے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب نے یہ اعلان دے دیا تھا، سرکار انگریزی پر نہ جہاد مذہبی طور پر واجب ہے۔ نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے۔ ہم صرف سکھوں سے اپنا جایونٹ

(حقائق پالکوکرو وصے ۸۷)

(یادگار و صدرکی عطر اسلامی تحریکیں اور ان کے ص ۹۰)

کا انتقام لیتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حکام انگلشیہ کو بالکل خبر نہ ہوئی، اور نہ اُن کی تیاری پر دھیان آئے۔ سکھوں کی قوی سلطنت کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانا بہت سخت اور دشوار کام تھا مگر مولوی اسمٰعیل کی جرأت اور بیدھڑک دلیری نے ایسی خوفناک سلطنت سے مقابلہ کرنا کچھ مال نہ سمجھا، اصل میں اپنے مسلمان بھائیوں کے انتقام لینے کا جوش اُٹھ رہا تھا، ایسی بیخودی میں یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ جس پر میں حملہ کر رہا ہوں وہ مجھ سے زیادہ قوی ہے یا کمزور ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ سکھوں کی سرحدوں پر حملہ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

دسواں باب

مذہبی لڑائیاں

جن کی ابتداء ۱۲۴۱ھ سے شروع ہوتی ہے!

جتنی مذہبی لڑائیاں مجاہدین نے سکھوں کے مقابلہ میں لڑیں، ان میں سب سے زیادہ پارٹ (حصہ) مولانا شہید نے لیا تھا، پولیٹیکل خطوط جتنے حکمرانوں کے نام روانہ ہوئے، وہ سب مولانا شہیدؒ ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، جن میں سے بعض ہم آئندہ درج کریں گے۔

جب ہر طرح مجاہدین کی جمعیت ہوگئی، اور روپیہ بھی حسب ضرورت اکٹھا ہوگیا تو مولانا شہیدؒ کے مشورہ سے سید صاحبؒ نے خاموشی سے پہلے تھانیسر کا سفر کیا۔ یہاں کے لوگوں کو کوچ کے طور پر اپنے ارادہ سے آگاہ کیا، اور پھر آپ نے مالیر کوٹلہ، ممدوٹ، بہاولپور، حیدرآباد سندھ، شکارپور، جاگن، خان گڑھ، درۂ ڈھادر، درۂ بولن، قندھار، کابل کا سفر کیا۔ یہ عظیم الشان سفر بہت بڑی مصلحت پر مبنی تھا، اور جو جو نتائج سید صاحب نے مولانا شہید کے ذریعہ سے حاصل کئے وہ خوش آئندہ ہی نہ تھے بلکہ سکھ سلطنت کے لئے زوال کی ایک فال سمجھنی چاہئیے۔ عموماً جس شہر میں آپ تشریف لے جاتے تھے، پہلے وہاں کے علماء پر سکہ بٹھاتے تھے جب وہ معتقد بن جاتے تھے تو امراء اور عوام الناس کا قبضہ میں آنا کچھ بات ہی نہ تھا۔

بڑی بات یہ تھی کہ سکھوں کے ناقابل رحم مظالم سے سب چیخ اٹھے تھے اور خدا سے چاہتے تھے کوئی منتقم پیدا ہو تو ہم اُس کی مدد کریں۔ اُمید سے زیادہ مسلمانوں نے سید صاحب سے ہمدردی کی اور جب آپ کابل پہنچے ہیں تو یہاں اول مشکل جو آپ کو پیش آئی وہ ملا محمد کو اپنا رام بنانا تھا۔

ملا محمدؒ ایک فاضل اجل اور عالم متبحر تھا اور عموماً کابل کا کابل اس کا مرید تھا۔ اس کے اشارہ پر ہزاروں افغان گردن کٹانے کو موجود تھے، جب محلہ دہ افغانان میں آپ نے قیام فرمایا تو پہلے ملا محمد کے شاگرد مولانا شہیدؒ کا امتحان لینے کے لئے آئے، معمولی درسی صرفی نحوی کتابوں کے مشکل مقامات خوب دیکھ دیکھ کے بحث کرنے کے لئے موجود ہوئے مولانا اسمٰعیل صاحب اپنے مکان میں تشریف رکھتے تھے، آپ کی طبیعت میں بچپن ہی سے مذاق بھرا ہوا تھا اور ایسے مواقع پر آپ ضرور مذاق کیا کرتے تھے۔ آتے ہی ایک شخص نے شرح ملا میں سے ایک مشکل مقام دریافت کیا، آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر ایک طالب علم نے صدرا میں سے کچھ استفسار کیا، پھر بھی آپ نہ بولے۔ تیسرے نے شمس بازغہ میں سے کچھ سوال کیا اس کا بھی جواب نہ دیا گیا، اب تو طلبہ نے بغلیں بجائیں اور وہ سمجھ گئے دور کے ڈھول سہاؤنے ہوتے ہیں۔ مولوی اسمٰعیل کی اتنی شہرت تھی مگر یہ ایک حرف بھی نہیں جانتے آخر انہوں نے کہا ہم نے آپ کے علم وفضل کا چرچا سنا تھا اور یہ بھی ہمارے گوش گزار ہوا تھا آج آپ ہند میں فرد ہیں مگر ہم نے مل کے آپ کو کچھ بھی نہیں پایا۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ۔۔۔ جو چیرا تو ایک قطرۂ خون نکلا

یہ تقریر سن کے آپ مسکرائے اور یہ گویا ہوئے طالب علمو! یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے تم نے تو ان مقامات کا جو مجھ سے استفسار کرنے آئے شب بھر خوب مطالعہ کیا ہے میں نے ان پر غور ہی نہیں کیا پھر میں کیونکر برجستہ جواب دے سکتا ہوں، آج تم کوئی خاص مقام مجھے بتا دو میں بھی اسے دیکھ لوں اور تم بھی دیکھ کے آؤ کل ہماری تمہاری ٹو لڑے گی مگر ساتھ ہی اس کے یہ سمجھ لینا ایک شخص سے بحث کروں گا اتنے آدمیوں کا مقابلہ تنہا شخص کیونکر کر سکتا ہے یہ سُن کے سادہ لوح طلبہ بہت خوش ہوئے، اور ایک مقام شرح ملا کا بتا گئے اور یہ کہہ گئے آپ اسے سوچ رکھیئے گا، کل آپ سے بحث کریں گے انہوں نے اپنے اُستاد آخوند ملا محمد سے ساری کیفیت دہرائی وہ ایک معمر فاضل شخص سن کے سر ہلانے لگا اور سمجھ گیا، اسمٰعیل نے انہیں قابل خطاب نہ پایا۔ اسی لئے یہ کہہ کے ٹال دیا۔ دوسرے دن وہ خود مع شاگردوں کے آیا اور معمولی مزاج پرسی کے بعد تقلید پر

درماحث دا ہوا۔ کامل تین گھنٹے تقریر ہوتی رہی، آخر مولانا شہیدؒ نے اُسے قائل کر دیا اور یہاں تک اسے سید صاحب کا معتقد بنایا کہ اس نے بطیب خاطر بیعت کی اس کا مرید ہونا تھا کہ ہزاروں ولایتی آنے اور بیعت کرنے لگے۔ ولایتوں پر یوں فتحمندی حاصل کرنا سکھوں پر فتح پانے کا ایک دیباچہ تھا، اس کامیابی پر سید احمد صاحبؒ نے بیتابانہ پیارے شہیدؒ کو گلے سے لگالیا اور پیشانی پر بوسہ دے کے دعا دی خدا کا ہاتھ ہمیشہ تیرے سر پر رہے ان پے در پے کی کامیابیوں اور علمی فتوحات نے عملی فتوحات میں جان ڈال دی، اکثر لوگ سکھوں سے انتقام لینے کے لئے تیار ہوگئے، اور اب جنگ کی بہت زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔

مولانا شہیدؒ سید احمد صاحبؒ کی سررشتہ داری کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ اور لشکر مجاہدین کے کمانڈر انچیف بھی تھے۔ ان دوگراں تر فرائض کی انجام دہی بحسن دخوبی کرنی ایک سخت کام تھا مگر اسمٰعیل جیسے قوی بازو کے آگے وہ اس آسانی سے حل ہوجاتا تھا گویا کچھ بھی نہیں ہے آپ کے قلم ہیں، جیسی غیر معمولی قوت نمو اور زبان میں جیسی ممتاز قوت گویائی تھی۔ ایسی ہی میدان جنگ میں "شیر آبدار کو گردش دینے اور ناواقف مجاہدین کو قواعداں سکھوں سے لڑوانے میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ جنگ کی جتنی تدابیر پوشیدہ اور ظاہر کرنی تھیں سب کی گئیں اور جب ہر طرح سے آراستہ ہوگئے تو درۂ خیبر سے ہوتے ہوئے حدود پشاور میں آئے۔ یہاں سے ہشت نگر، ملک یوسف زئی میں ہوتے ہوئے موضع خویشگی میں قیام پذیر ہوئے، اس موضع سے سکھوں کی پولٹیکل منظر کا خوشنما سین بخوبی معلوم ہوتا تھا۔ مولانا شہیدؒ نے ادھر اُدھر آدمی بھیج کے تمام موجودہ حالت گورنروں اور سکھوں کی سرحدی فوجوں کی دریافت کرلی، زیادہ مدد آپ کو اپنے ان نقشوں سے ملی جو آپ نے اپنے پرائیوٹ (نج کے) سفر پنجاب میں حاصل کئے تھے۔ کامل طور پر دریافت ہوگیا فلاں قلعہ کا افسر فلاں سکھ ہے اور فلاں گڑھی کا قلعہ دار فلاں سنگھ جی ہے۔

ہر امر میں کامیابی جب ہوتی ہے کہ اعیان شہر معاونت کریں خواہ ان کی معاونت کتنی ہی قیمت کیوں نہ رکھتی ہو۔ بڑی بات مولانا شہیدؒ کے وعظ میں یہ تھی قومی اصلاحوں کا بوجھ

علماء سے گزار کر امراء کی گردن پر رکھتے تھے، عموماً تو یہ ہوتا تھا کہ وعظ سُننے کے بعد لوگ رام بن جایا کرتے تھے مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ صرف زبانی سُننے کا ان پر وہ اثر ہوتا تھا کہ نادیدہ مولانا شہیدؒ یا اُن کے مُرشد سید صاحبؒ کے مُرید اور عاشق شیدا ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی فدائیت اور فریفتگی زبان حال سے یہ گویا ہوتی تھی۔

نادیدہ جمال او مہرش بدلم سر زد   ناکاشتہ میروید دانا نہ چنیں باید

مثلاً سردار محمد خان جو امیر دوست محمد خان کا چھوٹا بھائی تھا۔ خود بخود مولانا شہید رح کی مقناطیسی کشش رکھنے والی محبت میں محو ہو کے مع اپنے باڈی گارڈ کے طلوع آفتاب سے پہلے موضع خویشگی میں آ کے قدموں پر گر پڑا، پیارے شہید نے اپنی شیریں زبانی سے اُسے خوش کر دیا اور پھر سید صاحب کی خدمت میں حاضر کیا۔ سید صاحب کی بیعت سے بعد ازاں مشرف ہو کے آپ کے سچے مددگاروں میں بنا۔ یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ مولانا شہیدؒ کی تقریر تو پر اثر مشہور تھی مگر رفتہ رفتہ آپ کی شہرت انجذاب قلبی میں بھی بڑھتی گئی۔ ایک ضعیف بوڑھا شخص (مرحوم) جو بارہا مجھ سے ملتا رہتا تھا، اور جس نے مولانا شہید کی ہمرکابی کا شرف مدتوں حاصل کیا تھا ایک دن یہ کہنے لگا مولانا اسمٰعیل صاحبؒ اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے جنگ کے اُتار چڑھاؤ کو تک رہے تھے۔ یک بیک آپ کے دل میں یہ خیال آیا سکھوں کی طرف سے ہمارے مقابلہ کے لئے مسلمان بھیجا گیا ہے یہ ملکی لڑائی تو ہے نہیں کہ وہ گنہگار نہ ٹھہرتے بلکہ یہ مذہبی جنگ ہے اگر وہ ہمارے مقابلہ میں مارا گیا تو قطعی جہنمی ہوگا ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے اس شنیع تر کام سے باز رکھیں یہ فرما کے مولانا شہید خاموش ہو گئے، آپ کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں اور چہرہ پر غیر معمولی تمتاہٹ جس میں فکر اور افسردگی کی گہری گہری تہ تھی جلوہ دے رہی تھی اور آپ کا ہر سر مو یہ گویا تھا۔

جوش دکھلا دے ذرا آج تو اے حضرت دل   اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

تین گھنٹے بھی مشکل سے گزرے ہونگے کہ وہ تنہا آپ کے خیمہ میں چلا آیا اور پابوس ہو کے کہا میری طبیعت بے چین ہے، خدا کے لئے میری مدد کیجئے، آپ نے ٹھنڈا پانی اس کے سر پر ڈالا اور اپنی گفتگو کے آب شیریں سے اس کی روحانی پیاس بجھائی خدا معلوم یہ روایت کہاں

تک صحیح ہے مگر ہاں یہ امتحان تو ہم نے مسمریزم کے ماہر کا بھی کیا ہے کہ اسے اپنے سے ناتوان کا بیہوش کر کے باتیں کرنا کوئی بڑی بات کوئی مشکل امر نہیں معلوم ہوتا یا کسی جانتے ہوئے شخص کو بلالینا کوئی بڑی بات نہیں خیال کی جاتی۔ ممکن ہے اسی طرح کی کوئی قوت پیارے شہیدؒ میں بھی ہوگی اور کبھی کبھی اتفاقیہ اس کا ظہور بھی ہو جاتا ہوگا۔

پہلی جنگ

موضع خویشگی سے سکھوں کے قوانین جنگ سامان آلات حرب اور بعض پوشیدہ معاملات سے جو جنگ کی جان ہوتے ہیں اطلاع ہو گئی تو سید صاحبؒ مولانا شہیدؒ اور اپنے خاص خاص دوستوں کے مشورہ سے نوشہرہ آگئے یہاں جنگ شروع ہو جانے کا پورا خیال تھا۔ اس مقام پر آپ نے کسی قدر سپاہ مجاہدین کو بھی درست کیا۔ دس دس مجاہدین کی ایک ایک کمپنی مقرر کی اور اُن پر ایک ایک افسر نامزد کیا اور موقع موقع پر دُور دُور تک اُنہیں پھیلا دیا، پانسو آدمیوں کی کمان آپ کی اور تین سو جانباز مجاہدین سید صاحب اور بعض مستورات کی حفاظت کے لئے چھوڑے۔ یہ پہلا ہی موقع پیارے شہیدؒ کو میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ میں شمشیر بازی کرنے کا تھا۔

دربار لاہور کو بھی پے درپے مجاہدین کے ارادے اور آگے بڑھنے کی خبریں جا رہی تھیں رنجیت سنگھ ولایتوں پر فتح حاصل کر کے خواب خرگوش میں پڑا ہوا خراٹے لے رہا تھا، اور اسے ذرا بھی خیال نہ تھا کہ میری حدود کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کے دیکھے گا جب عین جگر میں مجاہدین کے لشکر کے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں دربار لاہور کے کانوں میں پہنچیں تو وہ اپنے خواب نوشین سے چونکا ہوا اور نہایت افروختہ ہو کے سردار بدھ سنگھ کی ماتحتی میں دس ہزار فوج دے کے مجاہدین کی گوشمالی کے لئے روانہ کیا وہ جانتا تھا دس ہزار سکھ فوج بیس ہزار مخالفین پر بھاری ہے۔ بدھ سنگھ نے موضع اکوڑہ میں اپنا لشکر گاہ کیا، نوشہرہ سے یہ مقام بارہ میل کے قریب واقع ہے۔ ادھر ہلالی جھنڈا فراٹے بھر رہا تھا اور اُدھر سکھوں کا پھریرہ اُڑ رہا

تھا۔ دریائے لنڈ دونوں لشکروں کی حد فاصل تھا۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے سید صاحب نے مولانا شہیدؒ سے وہی معمولی تحریری پیغام لکھوا کے بھیجا جو نبی اکرم یا خلفائے راشدین کے وقت میں جب وہ مخالفین اسلام سے بہت ستائے جاتے تھے اور ناچار اپنی حفاظت دینی مالی اور جانی کے لئے جنگ کرنے کو تیار ہوتے تھے تو جنگ سے پہلے یہ تحریری نامہ بھیجا کرتے تھے۔ کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ، پھر ہم تمہارے بھائی ہیں، یا جزیہ دو پھر ہم تمہاری حفاظت کریں گے، اور اگر دونوں ہی باتیں منظور نہیں کرتے تو جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اسی مضمون کا نامہ سید صاحبؒ کی اجازت سے مولانا شہیدؒ نے سردار بدھ سنگھ کی معرفت دربار لاہور کو روانہ کیا، جُوں ہی قاصد دربار رنجیت سنگھ میں پہنچا اور دلیری سے یہ نامہ پڑھا دربار بھر میں اُس پر حقارت انگیز آوازیں بلند ہوئیں، جیسے مدائن میں یزدجرد کے پاس سعد بن ابی وقاصؓ کا پیغام لے کے جب مغیرہؓ گئے تھے اور یہی باتیں سنائی تھیں ان پر بھی حقارت کے نعرے مارے گئے تھے۔ رنجیت سنگھ نے نہایت بزدلانہ طور پر ایلچی کو پٹوا کے اور دھکے دلوا کے دربار کے باہر نکال دیا اور اُس نامہ کا کچھ جواب نہ دیا۔

جب قاصد لشکرگاہ مجاہدین میں پہنچا اور ساری کیفیت سنادی، سید صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا ہم اپنا فرض ادا کر چکے، اب ہم سے خداوند تعالیٰ روز حشر باز پرس نہ کرے گا۔ مولانا شہید متفکر تھے کہ ہم لنڈھ سے پار اُتر کے جنگ کریں گے تو ہمیں فائدہ ہوگا یا یہیں جما رہنا منفعت پہنچائے گا، آپ اسی شش و پنج میں تھے کہ رئیس[1] اکوڑہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے بیعت سے مشرف ہوا، اور اس نے تمام جنگ کے اُتار چڑھاؤ سید صاحب اور مولانا شہید کو سمجھائے اور کہا کہ بدھ سنگھ کا ارادہ ہے سمہ میں آ کے جنگ کرے، میرے خیال میں اس کا لنڈھ سے پار ہونا ہمارے لئے بہتر نہ ہوگا مناسب ہے کہ حضور ہی پیشقدمی کر کے دریائے لنڈھ سے پار اُتر کے اس کے بڑھنے کو روکیں۔ مولانا شہید نے بھی اس کی تائید کی۔ آخر موضع خویشگی میں جو جنگ کے لئے مناسب تھا پھر قیام کیا۔ ادھر سردار بدھ سنگھ

[1] امیر خان سردار قوم خٹک ۱۲

دوسری جنگ

اس نمایاں فتح نے دربار لاہور میں ایک زلزلہ ڈال دیا اور تمام ملک ہند میں ایک ہلکہ پڑ گیا، اب رنجیت سنگھ کی آنکھیں کھلیں اور اسے معلوم ہوا مجاہدین مُنہ کا نوالہ نہیں ہیں کہ آنکھیں بند کر کے ہڑپ کر جاؤں گا اور خبر نہ ہو گی۔ مولانا شہیدؒ نے پہلے دہلی اور بعد ازاں جہاں جہاں سید صاحبؒ نے حکم دیا خطوط روانہ کئے اور اصلی اصلی کیفیت جنگ کی تحریر کی ایک سردار نے اس خوش آئندہ فتح کے بعد سید صاحب کی خدمت میں یہ عرض کیا اگر آپ حضرو پر شب کو چھاپہ ماریں تو علاوہ بے تعداد سامان رسد آلات حرب اور مال وزر ہاتھ آنے کے سکھوں کی کمریں ٹوٹ جائیں گی کیونکہ ایک ہی بھرا پڑا سرسبز زرخیز موضع ہے جس پر سکھوں کی بہت بڑی جماعت کی زندگی کا دارومدار ہے، اگر یہاں آپ کو کامیابی حاصل ہو گئی اور قطعی ہوگی تو پھر اور بھی مجاہدین کی قوت بڑھے گی اور سکھوں کو مات ملے گی، مولانا شہیدؒ کی سمجھ میں بھی بات آگئی۔ آپ نے سید صاحب کے حکم سے شبخون مارنے کے لئے تین دستے سو سو آدمیوں کے منتخب کر کے تیار کئے، انہیں تمام جنگی اُتار چڑھاؤ کو بخوبی سمجھا دیا اور چند خاص خاص ہدایتیں جو مولانا شہید کیا کرتے تھے ان سے بھی کہہ دیں ان کی مدد کے لئے سید صاحبؒ کے حکم سے خود پیارا شہیدؒ دو سو سوار افغانی لے کے کھڑا ہوا جن میں بعض بعض آپ کے خاص خاص شاگرد بھی تھے۔ یہ تین دستے جنھوں نے طمع غنیمت میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا دی تھے۔ ان میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا ہاں دس بیس قندھاری ضرور تھے جو ان کے ساتھ سید صاحب سے اجازت لے کے روانہ ہوئے تھے یہ شبخون جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے مولانا شہید کی خلاف مرضی وقوع میں آیا۔ سید صاحب نے اجازت دے دی تھی، اور آپ نے بھی جنگ کے لئے مستعدی ظاہر کی تھی مگر ایسی خفیف جنگوں کی بنیاد کمزوری پر دلالت کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیسیوں نے حضرو کو لوٹا، اور بکثرت مالِ غنیمت لے کے وہاں سے بھاگے۔ پیچھے سے سکھوں نے تعاقب کیا اور بعد ازاں باہم جنگ چھڑ گئی

اگر مولانا شہیدؒ خطرناک دلیری نہ کرتے تو ہندوستانیوں کو سخت چشم زخم اٹھانے پڑتے، گو مال غنیمت امید سے زیادہ ہاتھ لگا مگر پھر کیا سید صاحبؒ کو ایک حصہ بھی دلیسیوں اور قندھاریوں نے نہ دیا، اور خود ہڑپ کر گئے۔ اصل میں پولیٹیکل اور جنگی معاملات کی پیچیدگیوں کو سلجھانا اور اپنے موافق ان سے نتائج پیدا کرنے ایک دشوار کام ہے مولانا شہیدؒ میں یہ روح تھی کہ وہ ان ہیبت ناک معاملات جنگ کا اُتار چڑھاؤ سمجھ سکیں مگر ان پر کاموں کا اس قدر بوجھ تھا کہ وہ کچھ کر ہی نہ سکتے تھے جتنی تدبیریں کی جاتی تھیں قدرتی یا اتفاقی طور پر تو حسب مدعا پڑ جاتی تھی۔ ورنہ بعض اوقات تو مجاہدین کی طرف سے ایسی بے عنوانیاں ہو جاتی تھیں کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا تھا۔

تمام مجاہدین پر کوئی حاکم نہ تھا یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سید صاحبؒ اور مولانا شہید وغیرہ کو وہ لوگ بزرگ جانتے تھے اور بیعت سے مشرف ہونے کے بعد اطاعت بھی کرتے تھے مگر یہ اطاعت خوشی کی اطاعت تھی، کوئی تعزیری قوانین ان کے لئے مرتب نہ کئے گئے تھے جس کے وہ پابند ہوتے نہ اُن کی بے اعتدالیوں پر جیسی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سزا دیا کرتے تھے کسی مجاہد کو تعزیر دی جاتی تھی۔

حضرو کا شبخون گو لٹیروں کے حق میں بہتر ہوا مگر سکھوں کو اس شبخون نے اور زیادہ دلیر اور حوصلہ مند بنا دیا وہ سمجھ گئے ان لوگوں میں میدان میں کھلم کھلا جنگ کرنے کی قدرت نہیں ہے یہ لٹیرا پن ہی جانتے ہیں حالانکہ یہ بات نہ تھی مجاہدین کا اکثر حصہ میدان میں بھی سکھوں کے مقابلہ میں شربت شہادت پینے کے لئے لب خشک دکھائی دیتا تھا اور وہ گھر سے اسی لئے نکلا تھا کہ یا سر رہم یا ستائم کلاہ قصہ مختصر یہ کہ اس حضرو کے شبخون سے قندھاریوں اور دلیسیوں نے تو نامہ اٹھایا مگر سید صاحب کے گروہ کا کچھ نفع سوائے مضرت جان کے نہ ہوا۔

تیسری جنگ

مجاہدین میدان جنگ میں نہایت دلیری اور قابل توصیف بے جگری سے لڑتے تھے

مگر جب انہیں کوئی لڑوانے والا یا دشمن کی زد سے بچانے والا نہ تھا، ان کی بے محابا جرائیں اور بنظیر شجاعتیں جیسا کہ چاہئے نتیجہ پیدا نہ کرتی تھیں۔

مولانا شہیدؒ نے اس وقت مصلحت یہ سمجھی کہ اس ملک کے کل مولویوں سے یہ اقرار نامہ لکھوالیا جائے کہ ہم نے سید صاحبؒ کو امام تسلیم کیا۔ یہ تدبیر چل گئی اور نہ صرف پنجاب کے مولویوں نے بلکہ ہندوستان کے بھی اکثر علما نے یہ اقرار نامہ لکھ کے بھیج دیا کہ ہم سید احمدؒ کو امام المسلمین تسلیم کرتے ہیں۔

حضرو کے شبخون کے بعد جس نے شجاع مجاہدین کے دامن جرأت پر بزدلی کا دھبہ لگا دیا تھا۔ بدھ سنگھ جنرل افواج سکھ نے ایک خط سید صاحب کی خدمت بابرکت میں روانہ کیا اور لکھا کہ شبخون مارنا اور بےخبروں پر ہتھیار چلانا شجاعان دہر کا شعار نہیں ہے کیا وجہ ہے کہ آپ میدان جنگ میں نہیں آتے اور دست بدست جنگ کر کے باہمی قسمتوں کا فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔

سید صاحب نے اس کا جواب ایسی مجملاً عبارت میں دیا کہ جس سے یہ نہیں معلوم ہو سکتا آیا آپ نے شبخون ناپسند فرمایا یا میدان جنگ میں دست بدست جنگ کرنی اچھی جانی چونکہ یہ ایک پولٹیکل بھید ہے۔ اور ایسی عبارت ضرور ایسے نازک معاملات میں تحریر ہونی چاہیئے اس لئے ہم مولانا شہیدؒ کی تعریف کرتے ہیں کہ آپ کا صحیح دماغ ان اہم اور بعض اوقات لاینحل معاملات میں بھی ایسا لڑ جاتا تھا کہ اب تک آپ کی تدابیر ملکی پر سمجھنے والے عش عش کرتے ہیں۔ خط جسے ہم بجنسہ درج ذیل کرتے ہیں مولانا شہید کی پولٹیکل قابلیت کا اعلیٰ درجہ کا نمونہ بتاتا ہے، وھو ہذا۔

از امیر المومنین سید احمد صاحبؒ بجواب نامہ سردار بدھ سنگھ جنرل افواج مہاراجہ رنجیت سنگھ

از امیر المومنین سید احمد بر ضمیر ابہت تخمیر سپہ سالار جنود و عساکر مالک خزائن و دفاتر جامع

اصلا مطعون وملام نیست زیراکہ وقتیکہ آن عظمت نشان در مقدمہ بجا آوردن احکام حاکم خود ہیچ عذرے وحیلہ نمی تواند آورد حالانکہ آن حکومت نشان از افراد ایشان بلکہ از جملہ برادران ایشان است پس ایں جانب در مقدمہ بجا آوردن حکم احکم الحاکمین چگونہ عذر تواند آورد حالانکہ آن جلیل الشان خالق جمیع افراد انسان بلکہ مکون سائر اکوان است والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

تحریر بتاریخ پانزدہم شہر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ ہجری فقط۔

بدھ سنگھ جنرل افواج سکھاں کے پاس جب یہ نامہ پہنچا تو سوائے تیاری جنگ کے وہ اور کیا جواب دے سکتا تھا، اس نے دریائے اباسین پر تین ہزار شائستہ فوج سکھوں کی روانہ کی اور حکمت یہ کی کہ آٹھ دس توپوں کو اپنے عقب میں رکھ لیا تاکہ مجاہدین بے خبر ہو کے ہم پر حملہ کریں تو ہم ان کی خبر لیں۔ اس وقت بہت بڑے انتظام کی ضرورت تھی۔ افغانوں کا بزدلا پن اور دھوکے بازی کھل چکی تھی، ان پر کسی قسم کا بھروسہ نہ ہو سکتا تھا۔ مولانا شہیدؒ نے ایک بار سید صاحبؒ کی خدمت میں یہ عرض کر دیا تھا ہمیں افغانوں کی جمعیت بڑھنے میں زیادہ خوش نہ ہونا چاہیئے یہ لوگ بزدل اور دغاباز ہیں ان کی وجہ سے ہمیں چشم زخم اٹھانی پڑے گی مگر سید صاحب نے اس بات کو نہ مانا تھا۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ جب کوئی شخص خود جہاد کے لئے بغیر کہے جانا چاہتا ہے میں اسے کیوں روکوں، ایک دیسی سردار نے درخواست کی اگر حکم ہو تو اباسین سے پار اتر کے دشمن کی فوج پر دیسیوں کے ساتھ حملہ کردوں آپ نے اجازت دے دی مگر مصلحتاً سید صاحب نے مولانا شہیدؒ کو بھی ہمراہ کر دیا کل پانسو ہندوستانی آپ کے ساتھ تھے۔ مولانا شہید نے سردار مذکور سے کہہ دیا کہ جب تک ہم کشتیوں پر قبضہ نہ کرلیں گے فتح نہیں پا سکتے۔ بڑی کشمکش سے کشتیوں پر بھی قبضہ ہو گیا۔ مولانا شہید نے دیسیوں کے ساتھ گھل مل کے دشمنوں پر حملہ نہ کیا بلکہ سکھوں کے مقابلہ میں ایک طرف سے تو دیسی سردار مذکور کی زیر کمان بڑھے اور دوسری طرف سے مولانا شہیدؒ نے اپنے گھوڑے کی باگ اٹھائی جب نصف دریا دیسیوں نے طے کر لیا اور سکھوں نے اپنے حملہ آوروں کو اپنی زد پر بالکل ٹھیک سمجھ لیا تو انہوں نے اپنی عقب والی توپوں سے فیر کرنے شروع کئے، جوں ہی دس بیس دیسی اڑے کل فوج کی فوج الٹی پھری، بہت

ے اباسین کے نذر ہوئے اور باقی جان بچا کے بھاگے۔ محض بے سراپن تھا نہ کوئی قاعدہ جاری تھا نہ کسی کی باقاعدہ کمان تھی، لوٹ کا لالچ افغانوں کو لئے پھرتا تھا۔ اور ایسے حملوں میں اگر پیارے شہیدؒ کا دم نہ ہوتا تو سخت ذلت ہوتی۔

جس وقت دیسیوں کی بے تعداد بے سری فوج بھاگی ہے مولانا شہیدؒ کے بھی پیر اکھڑ گئے تھے، آپ نے اس نظارہ کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور چاہتے تھے کہ باگیں پھیر لیں اور مٹھی بھر آدمیوں کو دشمنوں کے پنجہ سے نکال لیں مگر اپنی نڈر طبیعت اور غیرت اسلام نے تقاضا نہ کیا، آپ نے اپنے آدمیوں کو للکارا اور کہا یہی وقت ہے اسلام پر جان قربان کر دینے کا، بڑھو اے میرے بھائیو بڑھو، یہ کہہ کے سب سے پہلے گھوڑے کو آگے بڑھایا جتنے ہندوستانی ساتھی تھے آپ کے پیچھے سکھوں پر حملہ آور ہونے کے لئے ٹوٹ پڑے، قدرتی طور پر سکھوں پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ اپنی توپیں اور بہت سا سامان حرب چھوڑ کے بھاگے۔

اسے ہم تائید غیبی کہہ سکتے ہیں ورنہ مٹھی بھر آدمی کبھی اُن سے مقابلہ کر کے جانبر نہ ہو سکتے تھے۔ مولانا شہیدؒ نے کل سامان پر قبضہ کر لیا اور بفتح وظفر اپنے کیمپ میں واپس آئے۔

چوتھی جنگ

اس اتفاقیہ فتح کے بعد سید صاحب مع اپنے کل جان نثاروں کے نوشہرہ میں آ گئے یہاں سرداران پشاور بیس ہزار فوج لئے ہوئے سید صاحب کی مدد کے لئے تیار کھڑے ہوئے تھے۔ دربار لاہور کو وقتاً فوقتاً پے درپے شکستوں کی خبریں پہنچ رہی تھیں، اور وہاں سے برابر لشکر روانہ ہو رہا تھا۔ میدان سیدو جنگ کے لئے موزوں قرار دیا گیا۔ طرفین کی آنکھیں اس انقطاعی جنگ پر لگ رہی تھیں، سکھوں کی بھی پندرہ ہزار فوج جمع ہو گئی تھی، اور دونو لشکر آمادۂ پیکار تھے، بارود تیار تھی صرف بتی دینے کی کسر تھی، ایک نئی آفت سید صاحب اور آپ کے صادق مریدوں پر آتے آتے رہ گئی، سوائے تائید غیبی کے اور

کیا خیال ہو سکتا ہے۔ پشاور کے سردار جن میں بعض شیعہ مذہب بھی تھے گو بظاہر انہوں نے سید صاحب سے بیعت کر لی تھی مگر جانی دشمن تھے۔ رسد پہنچانے کا انتظام انہوں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ دو شخص[۱] آپ کے لئے کھانا لایا کرتے تھے، یعنی کھانے کا انتظام ان کے سپرد تھا، سید صاحبؒ اور مولانا شہید وغیرہ کو ان پر کامل بھروسہ تھا۔ انہوں نے ایک دن موقع پا کے زہر ہلاہل سید صاحب کے کھانے میں ملا دیا۔ اتفاق سے وہ کھانا شب کو صرف سیدؒ صاحب نے کھایا۔ کھانا کھاتے ہی آپ کے تیور بدل گئے، اور زبان کا اینٹھنا سنسنیوں کا ہونا شروع ہوا، خیر یہ ہوئی کہ آپ خود بخود بیہوشی کے عالم میں قے پر قے کرنے لگے۔ مولانا شہید مغموم پاس بیٹھے ہوئے تھے، صبح کو جنگ ہونے والی تھی اور سردار فوج کی یہ کیفیت ہو گئی۔ گھڑی بگھڑی آپ کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ دونوں فوجیں جنگ کے لئے آراستہ ہوئیں۔ مجاہدین سید صاحبؒ اور مولانا شہید کی غیر موجودگی سے ہول میں آئے جاتے تھے۔ شیعوں کے سردار نے چالاکی سے ایک لنگڑا ہاتھی سید صاحب کی سواری کے لئے بھیج دیا، اور مہاوت کو خوب سکھا پڑھا دیا جس طرح ہو سید احمد کو ہلاک کرا دیجو۔ خیمہ کے دروازہ پر آ کے لوگ غل مچانے لگے سید صاحبؒ بہت جلد سوار ہو جائیں ورنہ جنگ مومنین کے لئے خطرناک بن جائے گی۔ اس وقت سید صاحبؒ کو کچھ کچھ ہوش آ گیا تھا مولانا شہید نے کہا جس طرح ہو ہاتھی پر مجھے بٹھا دو۔ آخر پانچ چھ آدمیوں نے سید صاحبؒ کو پکڑ کے ہاتھی پر سوار کرا دیا۔ شیعوں کا سردار بیس ہزار فوج سے دامن کوہ میں کھڑا ہوا تھا۔ مجاہدین کو اس سے بہت سہارا تھا جب آپ میدان جنگ میں پہنچے ہیں تو لڑائی شروع ہو گئی تھی، شیعوں کا سردار برابر سکھوں کو توپیں مار رہا تھا مگر سوائے آواز کے گولا گولی نہ چھوڑا جاتا تھا۔ جب سخت معرکہ آرائی ہوئی اور سکھوں نے شیعہ سردار سے دو آدمیوں کی معرفت ساز باز کر لی تو وہ آندھی مینہ کی طرح حملہ آور ہوئے، شیعہ سردار اپنی کل فوج کے ساتھ غل مچاتے ہوئے بھاگ نکلے۔

---

[۱] نذر محمد، ولی محمد۔

انہیں دیکھ کر مجاہدین کے بھی پیر اکھڑ گئے، مولانا شہید رح نے پہلے سکھوں کے خونخوار حملہ کو روکا مگر جب دیکھا کہ سید صاحب تو بیہوش پڑے ہوئے ہیں، اور ان کا ہاتھی جنبش نہیں کھاتا اور وہ عنقریب سکھوں کے قبضہ میں آنے کو ہیں۔ آپ نے میدان سکھوں کے ہاتھ سونپ کے سید صاحب کو سنبھالا، اور بمشکل کئی آدمیوں کی مدد سے آپ نے گھوڑے پر بٹھا کے صاف میدان جنگ سے نکل آئے، جب مجاہدین نے سید صاحب اور مولانا شہید کو اپنے میں نہ پایا ان کے پیر بھی اکھڑ گئے نہ کوئی کمانڈر تھا نہ انہیں کوئی خالد جیسا لڑانے والا اور نہ مثنیٰ جیسا حملہ آوروں کے پنجہ سے نکالنے والا تھا جدھر ان کا سینگ سمایا سراسیمہ ہو کے بھاگے، سکھوں نے تعاقب کیا اور مظلوم مسلمانوں کو نہایت بے بسی کی حالت میں قتل کیا، ان کا سامان لٹ رہا تھا اور اُن کی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ ادھر سید صاحب کے لینے کے دینے پڑ رہے تھے، اور ادھر مجاہدین کی جانوں پر بن رہی تھی۔ بہت سے مسلمان سکھوں نے قید کر کے لاہور روانہ کئے جہاں وہ نہایت بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ یہ فاش شکست اپنے سوتیلے بھائی شیعوں کے ہاتھوں ناواقف مجاہدین کو اٹھانی پڑی، اسی طرح ایک شیعہ وزیر نے ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور جب بت پرست سلطان نے بغداد فتح کر لیا تو بے گناہ سُنی لاکھوں قتل کئے گئے تھے، شیعوں نے جو جو مظالم مسلمانوں پر توڑے ہیں وہ قابل بیان نہیں، سید صاحب کو اگر ذرا بھی اس کا علم ہوتا کہ شیعہ سُنی کا کبھی دوست نہیں بن سکتا تو وہ کبھی اُن کے دھوکے میں نہ آتے۔ وہ سچے مسلمان تھے اور انہوں نے شیعہ سُنی کی تفریق ہی بالکل اڑا دی تھی مگر اس صاف باطنی کے مقابل میں بھلا حضرات شیعہ کب چوکنے والے تھے جس کروٹ ان سے بن پڑا انہوں نے کبھی کوئی دقیقہ سنیوں کے ستانے اور ہلاک کرنے کا اٹھا نہیں رکھا۔ یہ قہرناک شکست بھی بیچارے سنیوں کو ان ہی کی مہربانی سے نصیب ہوئی۔

سلسلہ مہرداریار محرم۔

پانچویں جنگ

آخر بمشکل مسلمان سکھوں کے تعاقب سے بچ کے اپنے مریض سید کے گرد جمع ہوئے، سید صاحب بیہوش پڑے ہوئے تھے اور انہیں دنیا مافیہا کی کچھ بھی خبر نہ تھی، برابر علاج ہو رہا تھا اور کوشش کی جا رہی تھی کہ زہر کسی طرح جسم سے نکل جائے۔ ایک وفادار سنی سردار نے مولانا شہیدؒ کو مشورہ دیا کہ آپ سید صاحبؒ کو چند لئی اگر لے چلیں تو بہتر ہے، وہاں کی آب و ہوا بھی اچھی ہے اور مخالفوں کا بھی اتنا خوف نہیں ہے۔ جاڑا کڑاکے کا پڑنے لگا تھا اور پہاڑوں پر برف باری شروع ہو گئی تھی۔ مولانا شہیدؒ نے سردار مذکور کی صلاح بموجب معہ کل مجاہدین کے سید صاحب کو لے کے موضع چند لئی ہی آ کے قیام کیا سامان سارا لٹ چکا تھا، مجاہدین کی حالت افسوسناک تھی، سرمائی سامان کچھ نہ رہا تھا اور رسد کا سامان تو تین دن پہلے سے ختم ہو چکا تھا، مجروحین تڑپ رہے تھے اور تندرست فاقہ کشی سے نالاں تھے، سید صاحب ابھی تک بیہوش ہی تھے۔ اب یہ حالت مولانا شہید کی سخت امتحان کی تھی۔ کوئی مددگار چاروں طرف نظر نہ آتا تھا۔ ہر چند آپ کا شیریں موثر وعظ مجاہدین کو بہت کچھ تھپک رہا تھا مگر فاقہ کی زبردست "بیقرار" کے آگے اس کا اثر بھی زیادہ دیر نہ رہتا تھا۔ ادھر اپنی بے سرو سامانی کا غم دوسرے سید صاحب کی نازک حالت کا جانکاہ صدمہ تیسری بے عزتی کے ساتھ شکست کھانے کا تبدل الم جان کو آدھا کئے دیتا تھا گو پیارا شہید اس پر بھی شاکر تھا مگر اس کے صابر دل کو بے چین کرنے والا نظارہ مومنین کی زار حالت کا تھا جو انتہا درجہ سخت اور نازک تھی، خدا خدا کر کے آٹھ دن میں سید صاحب کو ہوش آیا، اب مومنین کی کسی قدر ڈھارس بندھی اور انہیں بزرگ سیدؒ کے بچنے کی امید ہوئی، موضع والے بیچارے روزمرہ کہاں سے دیتے، آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ درختوں کی چھالیں اور جنگل کی بوٹیاں اُبال اُبال کے کھانے لگے، دن بھر دھوپ میں گزر کرتے تھے اور شب کو سردی سے محفوظ رہنے کے لئے الاؤ کے گرد بیٹھ جاتے تھے، سب کی یکساں ہی کیفیت تھی نہ سید صاحب بچے تھے نہ مولانا شہید، کوئی صورت بہتری کی نہ معلوم ہوتی تھی۔

آپ اس وکیل کو مایوس نہ جانے دیں گے۔ سید صاحب کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی آپ نے فرمایا میرے خیال میں اسمٰعیل تمہارا افسر ہو کے جانا انسب ہوگا۔ مولانا شہیدؒ سوائے چشم کے اور کیا جواب دیتے، فوراً سو آدمی ذرا مضبوط سے جن میں رامپوری نو وارد بہت تھے چنے گئے، اور تیسرے دن مولانا شہید انہیں اپنے ہمراہ لے کے وکیل کے ساتھ جانب پکھلی روانہ ہوئے اور بخیر و عافیت موضع پکھلی میں پہنچ گئے۔

مولانا شہیدؒ کی بے سر و سامانی اور مجاہدین کی قلت گو بعض وقت ناظر سوانح کو خلجان میں ڈالے گی اور وہ یہ دیکھ کے حیرت کرے گا کہ ایسا شخص جو بہت عرصہ سے خود طرح طرح کی مصیبت میں پھنسا ہوا ہو اور اس وقت بھی اس کی ناگفتہ بہ حالت ہو پھر بھی وہ کس شوق اور اُولوالعزم ارادہ سے اپنے بھائی مسلمانوں کے بچانے کے لئے آمادۂ پیکار ہو، اور خونخوار دشمن کی کثیر التعداد فوج اور سامانِ حرب کی ذرا بھی پرواہ نہ کرے، حقیقت میں یہ بات غور و تامل کی ہے مگر جب مولانا کی حمیتِ اسلام سے بھری ہوئی فطرت پر نظر کرے گا تو اسے چنداں استعجاب نہ رہے گا۔

مولانا شہیدؒ کا اصلی منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی حمایت میں میری جان نکلے اس سے بحث نہ تھی کہ ان مسلمانوں کے عقائد درست ہوں یا نہ ہوں۔ کئی بار تجربہ ہو چکا تھا کہ دیسی مولانا شہید اور اُن کے پیر سید احمد صاحب سے فدایانہ عشق نہیں رکھتے بلکہ اپنے ذاتی اغراض میں ڈوبے ہوئے ہیں، بایں ہمہ یہ تمام غیر خوش آئندہ خیالات نہایت کمزور اور بادِ ہوا معلوم ہوئے اور وہ اپنے پیر کے مشورہ سے ان ہی مسلمانوں کو سکھوں کے ظالم پنجہ سے بچانے پر آمادہ ہو گیا۔ اس سے زیادہ اسلام سے فدایانہ عشق رکھنے کی مثال بہت کم ملے گی۔

پکھلی میں مولانا شہیدؒ کا پہنچنا سکھوں کی اشتعالِ طبع کا باعث[1] ہوا، ناظم موضع نے ایک سکھ[2] افسر کی سرکردگی میں ڈیڑھ ہزار فوج روانہ کی اور اسے ہدایت کر دی کہ موضع ڈمگلہ میں پہنچ کر اپنی مورچہ بندی کرے۔

---

[1] سردار ہری سنگھ ناظم پکھلی ۱۲ [2] سردار پھول سنگھ ۱۲

سردار افواج سکھ نے ڈمگلہ میں خوب مضبوطی سے مورچہ بندی کی اور بکثرت دیسی بھی اپنی فوج کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنے ساتھ کر لئے، بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت سکھوں کی جمعیت چار ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ مولانا شہید نے بھی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں اپنے مٹھی بھر آدمیوں کو قیام کرنے کا حکم دیا۔

خوانین پکھلی مولانا شہیدؒ کی خدمت میں معہ اپنے ہمراہیوں کے آموجود ہوئے اور باہم یہ مشورہ طے پایا کہ شبخون مارنا چاہیئے۔ مولانا شہیدؒ نے دو ہزار دیسی خوانین کے ذریعہ سے اپنی کمک پر دیکھے مگر اس خوش منظر سے آپ کا دل خوش نہیں ہوا، آپ دیسیوں کی بزدلی اور دغابازی کا تجربہ کر چکے تھے، آپ کو یقین تھا کہ یہ سینہ بسینہ یا سینہ بسینہ خونخوار سکھوں سے میدان جنگ میں شمشیر بازی نہیں کر سکتے مگر اب وقت بہت بڑی آپڑی تھی اگر انہیں ساتھ نہ لیتے تو خوانین سے بگڑتی ہے اور جو ہمراہ لیتے ہیں تو میدان جنگ سے اُن کے فرار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ آخر فکر کرتے کرتے آپ نے ایسا بندوبست فرمایا کہ اگر دیسی بھاگ بھی جائیں تو ہندوستانی لڑاکو مجاہدین پران کا کچھ اثر نہ پڑے اور دوسرے دن شب کو تیاری کر کے حملہ کا حکم دیا۔

دیسی ابھی سکھوں کے مورچوں کے قریب بھی نہ پہنچنے پائے تھے کہ فرار شدن کا منصوبہ گرداننے لگے اور ایسے دم دبا کے بھاگے کہ شاید کوسوں پر جا کے دم لیا ہوگا۔ کل تین سو آدمیوں کے قریب دیسیوں کے رہ گئے۔ شب کے دو بج چکے تھے رات اندھیاری اور گھٹا ٹوپ تاریک تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا، سکھوں نے اپنے لشکر کے چراغ کبھی کے گل کر دیئے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے آبادی کی خبر دیتے تھے، ورنہ اندھیری کی تاریک چادر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوسوں تک سنسانی حکومت کر رہی ہے، آدمیوں کے چلنے کی آہٹ ان ہی ہوا کے جھونکوں سے معلوم ہوتی تھی۔ مجاہدین زمین سے لگواں جا رہے تھے اور اُن کی کوشش تھی کہ ہمارے قدموں کی آہٹ نہ معلوم ہو۔ مورچوں پر جتنے سکھ متعین تھے وہ سب ہوشیار تھے۔ قلب لشکر کے سپاہی ضرور آرام میں تھے؛ ادھر اُدھر لشکر کی بیداری سکھوں کی دُور اندیشانہ روح کا نقشہ کھینچ رہی تھی، مولانا شہیدؒ نے بجائے اس

آدمی تو مورچہ پر چھوڑے اور نوّے ہندوستانیوں کے ساتھ جن میں رامپوریوں کی بڑی تعداد تھی عقب کی طرف اپنے کو پہنچا دیا اور سامنے سے تین سو دیسی جو ابھی فرار نہ ہوئے تھے ایک دل چلے مسلمان کی زیر کمان بڑھے چلے آتے تھے، جب مولانا شہید بندوقیں تانے ہوئے بہت ہی قریب پہنچ گئے تو چند سنتری مورچوں پر پہرہ دیتے دکھائی دیئے، گو ان کی صورت شکل قد ڈیل ڈول مطلق نہ دکھائی دیتا تھا پھر بھی اس قدر معلوم ہو رہا تھا کہ سیاہ پرچھائیاں گردش لگا رہی ہیں چند منٹ تک آپ نے سوچا اور فکر کیا کہ مجھے اس پہلو پر حملہ کرنے سے کامیابی ہوگی یا دوسرے رُخ پر حملہ آور ہونا فائدہ دے گا۔ فوراً آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آپ نے شتابانہ مگر غیر ممکن السمع قدموں میں دوسری طرف سے سکھوں کو آدبایا اور خوفناک تکبیروں کی آواز سے سکھوں پر حملہ کیا، سکھوں نے گولیوں کا مینہ برسانا شروع کیا مگر تاریک شب میں ان کی فی ہزار ایک گولی بھی بمشکل نشانہ پر لگ سکتی تھی، مولانا شہیدؒ نے بندوقوں سے گزر کے تلواروں کے قبضے پکڑ لیئے، اور اب سینہ بسینہ جنگ شروع ہو گئی سکھ کچھ تو شراب اور نیند کے نشہ میں تھے اور کچھ انہیں اپنے مخالفین کا بے تعداد لشکر معلوم ہوا، اس کا ہراس اور بھی انہیں بزدل بنا رہا تھا۔ پہلے تو بیس منٹ کے قریب انہوں نے اندھا دھند مقابلہ کیا اور جب ان پر حد سے زیادہ خوف طاری ہوا تو وہ سراسیمہ ہو کے بھاگے اور اپنا کل سامان فاتحانِ اسلام کے لئے چھوڑ گئے، سکھوں کا سردار بڑا آزمودہ کار مردِ میدان تھا اس نے ایک ہزار قدم پر جا کے اپنے سپاہیوں کو پھر جمع کیا اور گاؤں کے پانچ چار جھونپڑوں میں آگ لگادی تاکہ مخالفین کی تعداد معلوم ہو جائے، جوں ہی خشک پھوس کی تیز تیز بلند بلند لپٹیں اُٹھیں مجاہدین کا بھرم کھل گیا اور انہیں معلوم ہوا کہ یہ مٹھی بھر آدمی ہیں جنہیں ہم نے ہزاروں سمجھ لیا تھا اپنی لاعلمی اور ساتھ ہی اس کے بزدلانہ پن پر ملامت کی اور دوبارہ غیظ و غضب میں مسلمانوں کی جمعیت پر حملہ کیا۔

یہاں ایک نیا گُل اور کھل گیا تھا کہ جب سکھ اپنا سامان چھوڑ کے سراسیمہ بھاگے ہیں تو دیسیوں نے موقع غنیمت جان کے اُسے لُوٹنا اور اپنے گھر لے جانا شروع کردیا تھا کچھ تو بھاگ گئے تھے اور جو کچھ دیسی رہ گئے تھے وہ اسباب پر گرے ہوئے تھے

ملاکے قافلے آرہے ہیں جن میں چھ سات سو آدمیوں سے زیادہ ہیں یہ سُن کر پیارا شہید بہت خوش ہوا، اور اپنی جمعیت کی بڑھوتری دیکھ کے اور بھی زیادہ ہمت بندھی یہ صحیح ہے کہ ہر کے را بہر کارے ساختند ۔ ملائی دماغ کبھی اس قابل نہیں ہوتا کہ اتحاد سے کام کرے قدرتی طور پر اس میں خودپسندی اور بیجا تبختر۔ غیر تبجو ضد اس بلا کی ہوتی ہے کہ نہ وہ خود چین سے رہتا ہے نہ اپنے متعلقین کو چین سے رہنے دیتا ہے ۔ ان لوگوں کو جنگ سے اور تدابیر ملکی یا توی اتحاد سے کیا کام یہ دوسری بات ہے کہ مولوی اسمٰعیل جیسا ایک جوہر نکل آئے جسے فطرت کے نہروں کا کامل نمونہ کہنا چاہئیے جس میں فطرت نے ہر علم اور فن کا مذاق مضمر رکھا تھا ہمارے ایک مرحوم بوڑھے دور اندیش دوست کا خیال صحیح ہے کہ اگر مولانا شہیدؒ کے ساتھ ملانے نہ ہوتے تو آج سارا پنجاب مسلمانوں کا ہوتا ۔ پیارا شہیدؒ اپنی جانبازیوں کا بہت کچھ فائدہ اٹھاتا مگر ان ملانوں نے جو اس کے ساتھ تھے اُسے ہمیشہ اپنی نامعقول تدابیر کے صدقہ میں ناکام رہنے دیا اور آخر نوبت یہ ہوئی کہ مولانا شہیدؒ اور سید صاحبؒ کی شہادت ہی پر کل کوششوں اور خونریز جانبازیوں کا اختتام تھا۔

غرض جب یہ قافلے ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہیں تو ان میں مولوی محبوب علی صاحب دہلوی عجب دماغ کے شخص تھے، ان کی نسبت زیادہ لکھنا فضول ہے صرف یہی دو لفظ کفایت کرتے ہیں ۔ وہ ملانے تھے کچھ ضرورت نہیں کہ تمام جہان کا رونا رو بیٹھیں کہ وہ خودپسند تھا، خردماغ تھا، متعصب اور کوتاہ اندیش تھا، حاسد اور مسلمانوں کو برباد کرنے والا تھا۔ بس ان الفاظ کے بجائے یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ ملانا یا ملاّ تھا۔

مولوی محبوب علی صاحب جن کا سفر مولانا شہید یا سید صاحب اور آپ کی پارٹی (گروہ) کے لئے منحوس تھا وارد پنجاب ہوئے اور ابھی پانچ چار منزل سید صاحب سے ہوں گے کہ آپ نے تند اور نامہذب الفاظ میں جیسا کہ عموماً ملانوں کی تحریر ہوا کرتی ہے ایک خط سید صاحبؒ کو روانہ کیا اور اس میں یہ ناقابل باتیں تحریر کیں پہلے تمہیں لازم تھا کہ کلمہ گو کافروں سے بھگتے اور ان پر جہاد کرتے پھر سکھوں کی طرف متوجہ ہوتے ۔ یہ کلمہ گو کافر درانی تھے جنہوں نے محبوب علی صاحب کے مذہبی احکام میں انگشت اعتراض دراز کی تھی یا دوسرے

(حیات طیبہ، ص ۱۰۹)

راوی کی روایت کے بموجب انہوں نے سمجھایا تھا کہ ابھی آپ آگے نہ بڑھیں، رستہ میں سکھوں کی فوج جو ابھی دربار لاہور نے بھیجی ہے پڑی ہوئی ہے۔ مبادا آپ سے مقابلہ ہو اور آپ چشم زخم اُٹھائیں۔ بس اس سننے کی کہاں تاب تھی فوراً ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا اور یہ بھی فتوے دے دیا کہ سکھوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر (معاذاللہ) جہاد فرض ہے۔

مولانا شہیدؒ نے نہایت صبر سے اس خط کو پڑھ کے سنایا۔ مولوی صاحب کی تیز مزاجی اور بے جا ظلم پر افسوس کیا اور بعد مشورہ یہ سوچا ہوا جواب لکھ کے بھیجا آپ اتنی جلدی نہ فرمادیں انشاء اللہ جو کچھ یہاں آکے مشورہ ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔ غرض خدا خدا کر کے کل مولوی صاحبان پنجتار میں پہنچے۔

ابھی آئے ہوئے دو ایک دن بھی نہ ہوئے تھے کہ ہمارے بہادر صدری ملا نے سید صاحب کی معاشرت پر دس بیس اعتراض جما دیئے اور کہا جب تک مجھے اس کا جواب نہ ملے گا میں ہرگز دوسرا کام نہ کرنے دوں گا۔

ان اعتراضوں کو نقل کر کے میں ناظر کی سمع خراشی نہ کروں گا کیونکہ جتنی باتیں مولوی صاحب نے کیں وہ ایسی ذلیل اور ناروا تھیں کہ جو عموماً ایک ملانے دماغ کی صفت ہوتی ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ آپ لوگوں کو بہکانے لگے اور بہت سے مجاہدین کو اپنی طرف توڑ لیا۔ اتفاق سے مولانا شہید سید صاحب کے کیمپ میں محبوب علی کے داخل ہونے سے پہلے دو چار روز کے لئے کسی نج کے کام پر بھیج دیئے گئے تھے۔ یہاں محبوب علی نے لوگوں کا ناک میں دم کیا آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی رامپوری صاحب نے ان کو ساکت کیا جب وہ ساکت ہو گئے تو اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کے دہلی روانہ ہوئے۔ آپ جامع مسجد کے نیچے امام کی گلی میں رہتے تھے۔ روزمرہ اس فرحت خیز ٹکڑے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور معتقدوں کے روزمرہ مرغن کھانے اُڑانا بھلا وہاں کب رکھے تھے۔ یہ اس نظر سے گئے تھے کہ جو حصہ پنجاب سکھوں سے انہیل نے لیا ہے اس پر میں حکمران بنا دیا جاؤں گا، اور جب انہوں نے ہنوز تلواروں کی جھنجھناہٹ کی صدائیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہولناک آوازیں اور بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں اور توپوں کی مہیب گرج کے سوا اور کچھ نہ دیکھا تو اپنی اصلیت پر آ گئے۔ آخر محبوب علی صاحب اپنے آدمیوں

کرلے کے دہلی واپس پھرے۔ جب مولانا شہیدؒ نے یہ کیفیت سنی آپ ہاتھ سے ہاتھ ملنے لگے، اور کہا کاش دو چار دن میں اور ٹھہر جاتا تو محبوب علی صاحب کو مزا چکھاتا۔ اور انہیں دہلی کے مرغوں کھانے یہیں کھلا دیتا۔ حقیقت میں مولانا شہید ہوتے تو ضرور پوری طرح خبر لیتے کیونکہ محبوب علی نے ایسا ہی کام کیا تھا۔ ایک شخص کی روایت کے بموجب مولانا شہید مولوی محبوب علی کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ سید صاحب نے منت سماجت کرکے بچایا ورنہ تو نذیر ہی ڈالی ہوتی مگر یہ روایت ایسے شخص کی زبانی سنی ہے۔ جو وہاں موجود نہ تھا بلکہ سنی ہوئی بیان کرتا ہے اور جو روایت ہم نے اوپر لکھی کہ مولانا شہیدؒ وہاں اس موقع پر موجود نہ تھے معائنہ کرنے والوں نے بیان کی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مولوی محبوب علی صاحب کا دہلی سے روانہ ہونا بیچارے مسلمانوں کے لئے جو مولانا شہیدؒ کے زیر کمان کام کر رہے تھے سخت منحوس تھا۔ یہ حادثہ جوان ذات شریف کی والا ذات کی تشریف آوری کا نتیجہ تھا۔ غریب الوطن مسلمانوں کے حق میں سم قاتل کا اثر رکھتا تھا۔ اگر مولانا شہیدؒ جیسا کوئی اس فوج کا سر دھرا نہ ہوتا تو اسی دن تمام امیدوں اور آرزوں کا خون ہو جاتا۔ اور مسلمان جانبازوں کو کہیں بھاگتے نہ بنتی۔ اسی پر خیر گزری اور خدا نے ایسے مفسد کو بہت جلد کیمپ میں سے دفع کیا۔

دوسرا غضب ناک واقعہ مسلمانوں کے کیمپ میں اور یہ ہوا کہ مولانا عبدالحی صاحبؒ نے جنہیں علم و فضل میں مولانا شہیدؒ سے دوسرے نمبر پر سمجھنا چاہیئے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ آپ کی وفات موضع خیر بتاریخ ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ ہجری میں وقوع میں آئی۔ یہ قبل از وقت موت مومنین کے دلوں کو ہلا دینے والی تھی۔ جس طرح مولانا شہیدؒ نے اپنے زبردست مشیر اور فاضل دوست کو کھو دیا، اسی طرح سید صاحب نے اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا سمجھا یہ بے نظیر فاضل جس پر ہمیشہ تاریخ کی روشنی چمکے گی عجیب و غریب قابلیت کا تھا، اس کی زبان میں قوت گویائی اور قلم میں غیر معمولی نمو کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دور دور آپ کا شہرہ تھا۔ شیریں کلامی اور برجستہ تقریر کرنے میں بھی آپ ید طولیٰ رکھتے تھے، سید صاحب نے آپ کا ماتم کیا، مولانا شہید آپ پر خون کے آنسو روئے، مسلمانوں کی زبان سے بے ساختہ یہ نکل

رہا تھا۔

نوجوان تجھ سے ہی آباد تھا یہ سب خطہ تیرے مُنہ موڑتے ہی جل گیا سارا گلشن
ہچکی بندھ جاتی ہے اے مخزنِ لطف و خوبی یاد کر کر کے تجھے کرتا ہے عالم شیون

یہاں تو غریب الوطن پردیسی مسلمانوں پر یہ بپتا پڑی اور ہندوستان میں مولوی محبوب علی صاحب نے ان کے خلاف لوگوں کو آمادہ کیا اور ایسی ایسی بے بنیاد باتیں گھڑ گھڑ کے اُن کے سر چپکیں کہ عموماً مسلمان برافروختہ خاطر ہوئے، اور جو کچھ ہمدردی مولانا شہیدؒ سے وہ کرتے تھے اُنہوں نے کرنی چھوڑ دی۔ ناچار سید صاحب نے مولانا شہید کے مشورہ سے چند فاضل اس غلط فہمی کے مٹانے کے لئے روانہ ہندوستان کئے، جنہوں نے واقعات کا پراثر الفاظ میں بیان کر کے بہت کچھ لوگوں کا اطمینان کیا اور اُنہیں پھر سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کا ہمدرد بنا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر ہندوستانی سکھوں سے اپنے بھائی مسلمانوں کا انتقام لینے کے لئے شامل مولانا شہیدؒ نہ ہوئے تھے اور انہیں صرف لوٹ کا لالچ کشاں کشاں لایا تھا مگر ان کی اس بدکرداری سے بیچارے شہید پر کوئی دھبہ نہیں آسکتا جیسے بعض کفار عرب بظاہر مسلمان ہو جاتے تھے مگر باطناً کافر رہ کے مولانا سیدنا جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کارروائی کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کے زک دینے کی نئی نئی تدبیریں کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے واسطے یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ایمان والوں سے مل کر کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب وہ اپنے شیاطین میں جاتے ہیں تو کہا کرتے ہیں ہم مسلمانوں سے ٹھٹھا کرتے ہیں۔

یہی کیفیت مولانا شہیدؒ کے کیمپ کی تھی اس میں دونوں ہی طرح کے آدمی تھے۔ دین کی حمایت بھی کرنے والے تھے، اور لوٹ کا مال اینٹھنے کے لئے بھی آ گئے تھے۔ دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے ان کی شناخت قوت بشری سے جب تک تجربہ نہ ہو بہت بعید ہے۔

ساتویں جنگ

یہاں غریب الوطنی پر پے در پے یہ بپتا پڑ رہی تھی اور دربار لاہور وہاں مسلمانوں کے پسپا کرنے کے لئے نئی نئی فوجیں برابر روانہ کر رہا تھا۔ ابھی مولانا شہیدؒ اتفاقی حوادث سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ چار ہزار فوج دریائے لنڈھ سے عبور کر کے اتمان زئی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے آپہنچی۔ اب کے نئی بات اور یہ ہوئی تھی کہ ان چار ہزار آدمیوں میں ناں خال سکھ نظر آتے تھے ورنہ سب کے سب درّانی مسلمان تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک دو چھینٹوں سے اپنے بھائی مسلمانوں پر چڑھ آئے تھے۔ ان کے ساتھ دو توپیں بھی تھیں۔ مولانا شہیدؒ نے اطلاع پاتے ہی اپنی شکستہ فوج کو آراستہ کیا اور تھوڑی سی جمعیت کے دو حصے کر کے ایک حصہ اپنی زیر کمان کیا اور دوسرا حصہ سید صاحب کی ماتحتی میں مقرر ہوا کچھ حملہ آور مسلمان جو محمدی جھنڈے کے نیچے کام کر رہے تھے مشکل سے بارہ تیرہ سو ہوں گے۔ باہم مولانا شہیدؒ اور سید صاحب میں یہ مشورہ طے پا گیا کہ میں دشمن کے میمنہ کی طرف شب خون ماروں اور آپ میسرہ کی جانب سے ان پر گر پڑیں۔

درّانی اپنی کثیر التعدادی پر اکڑے ہوئے تھے اور یہاں خدا کے بھروسہ پر پھولے نہ سماتے تھے۔ سید صاحب جس نصف حصہ فوج کی کمان کر رہے تھے وہ ابھی بہت دور تھے مگر مولانا شہیدؒ درّانیوں کی فوج کے بہت ہی قریب پہنچ گئے تھے۔ پہرہ دار نے آواز دی کون آتا ہے مولانا شہیدؒ خاموشانہ آگے بڑھے چلے آئے۔ اس نے پھر دوسری آواز دی۔ آپ نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے تیسری آواز دی جواب نہ ملنے پر اس نے گولی ماری اور خوف زدہ غل مچاتا ہوا لشکر میں آگیا۔ مولانا شہیدؒ گھوڑے پر سوار تھے اور دو سو آدمی اور بھی آپ کے ساتھ قدم بقدم علاوہ چار سو پیدلوں کے آرہے تھے۔ مولانا شہید کی پہلی نظر تو توپوں پر لگ رہی تھیں، آپ سب سے پہلے ان ہی پر جا پڑے، گولہ انداز نے مہتابی کو روشن کر کے چاہا کہ پہلے مولانا شہید کو اڑا دوں کہ مولانا نے تلوار کا پھرتی سے وار کر کے اس کی گردن

لہ مولوی محمد علی صاحب، مولوی ولایت علی صاحب، مولوی عنایت علی صاحب۔

(برطانوی مظالم کی کہانی ص ۲۸۸/۲۸۹)

اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یوں مارا گیا۔ مولانا شہیدؒ نے فوراً وہ دونوں توپیں درانیوں کی طرف پھیر کے فیر کرنے شروع کئے ایک وفادار ہندو[1] جو مولانا شہیدؒ پر فریفتہ تھا، گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اس نے اس قدر پھرتی سے گولہ اندازی کی کہ درانیوں کے پیر اکھڑ گئے، ادھر مولانا شہیدؒ ان پر گر پڑے، تکبیروں کی آوازیں خوب زور شور سے بلند ہو رہی تھیں۔ بھلا اب درانی کیوں کر میدان جنگ میں ٹھہر سکتے تھے۔ اپنا کل سامان چھوڑ کے بھاگے جب وہ فرار ہو رہے تھے۔ سید صاحب بھی ان پر آ پڑے جتنے درانی مارے گئے ان کی تعداد ٹھیک نہیں معلوم ہاں جن مردوں کو وہ میدان میں چھوڑ گئے تھے وہ چار سو سے زیادہ شمار میں تھے، مولانا شہیدؒ کی فوج کا ایک آدمی بھی زخمی نہ ہوا۔ یہاں سے فرار ہو کے درانیوں نے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک بلند ٹیلہ پر مورچہ بندی کی اور اب ان کا ارادہ انتقام لینے کا پورا پورا ہو گیا۔ اس عرصہ میں صبح ہو گئی تھی۔ ان کے مقابل میں مولانا شہیدؒ بھی مورچہ بندی کر چکے تھے۔ مورچہ بندی سے فارغ ہو کے آپ نے اذان کہی اور سب مسلمانوں نے جماعت کی نماز پڑھی جب یہ جماعت ہو چکی تو مورچہ والی جماعت نے اسی طرح نماز فجر پڑھی اور اب تازہ دم ہو کے گولہ باری شروع کر دی۔ درانی گولیاں مار رہے تھے، اور یہاں سے گولوں کو ان کے جواب کے لئے چھوڑا جاتا تھا۔ تین چار گھنٹے تک تو وہ بہت جم کے لڑے مگر جب ان کے آدمی آموں کی طرح گولوں سے ٹپ ٹپ ٹپکنے لگے تو مورچہ غریب الوطنوں کے حوالہ کر کے بھاگے اور میل بھر کے فاصلہ پر جا کے قیام کیا۔ مولانا شہیدؒ نے صرف اس خیال سے کہ درانی مسلمان ہیں اپنے آدمیوں کو یہ حکم کر دیا تھا جب تک سینہ بسینہ جنگ میں کوئی مقابلہ کے لئے تلوار نہ اٹھائے اُسے قتل نہ کرنا نہ بھاگنے کا تعاقب کرنا اور جسے گرفتار کرو اسے وہی کھانا دینا جو تم آپ کھاتے ہو اور وہی کپڑا پہنانا جو تم آپ پہنتے ہو کیونکہ وہ بھی تمہارے بھائی مسلمان ہیں۔

درانی جہاں سے آئے تھے وہیں بھاگ کے چلے جاتے اگر رئیس خیبر وغیرہ کی طرف سے ان کو مدد نہ پہنچتی۔ خیبر والا سید صاحب سے بیعت کر چکا تھا مگر سکھوں کی رشوت نے اُسے باغی بنا دیا، اور اب وہ کھلم کھلا مولانا شہیدؒ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ قدرتی طور

[1] راجہ رام قوم راجپوت باشندۂ بیسواڑہ ۱۲

سے درانیوں پر مولانا شہیدؒ کا ایسا خوف بیٹھا ہوا تھا کہ خفیف سی جنگ میں وہاں سے بھی فرار ہو گیا اور اپنے ساتھ خیبریوں کو بھی بھگا کے لے گیا۔

اس عظیم الشان فتح سے مسلمان مالامال ہو گئے اور اس کا اثر ملک پنجاب پر بہت بڑا یہ ہوا کہ دو ہزار سرداروں کے نذر دیت نامے ایک دن میں آ گئے جس میں انہوں نے اپنی گزشتہ گور پرستی وغیرہ سے توبہ کی تھی اور سچی راہ اختیار کی تھی انہوں نے عہد کیا کہ قرآنی احکام پر عمل درآمد کریں گے، اور جو بدعتیں کہ دین میں خلل ڈالتی ہیں بالکل ترک کر دیں گے ان کی یہ بھی درخواست تھی کہ ہمارے ہاں عمال اور قاضی مقدمات کے فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے جائیں ہم ان کی اطاعت کریں گے اور ان کے فیصلوں کو اپنے حق میں ناطق خیال کریں گے۔

پیارے شہیدؒ کا پہلا مدعا یہ تھا کہ دین خدا کی اشاعت ہو اور مسلمان اس بدعت و شرک کی گنگھور گھٹا سے نکلیں وہ مدعا جیسا دہلی میں حاصل ہوا تھا، ایسا ہی پنجاب میں بھی حاصل ہوا، الحمد للہ کہ پھر ایسے تاریک تر خطہ میں خدا کا جلال چمکا اور لوگ سچے محمدی بننے لگے۔ گور پرستی اور پیر پرستی، تعزیہ پرستی، ماتا مائی کی پرستش کو لات ماری اور اس اکیلے خدا کی پرستش کا ڈنکا بج گیا جس کا ناطق قرآن مجید ہے۔

یہ لوگ جو سچے دین دار بنے تھے مولانا شہید اور آپ کے غریب الوطن ساتھیوں کے سب سے زیادہ ہمدرد تھے انہوں نے یہ التزام کر لیا تھا کہ اپنی کمائی کا آٹھواں حصہ مولانا شہید کے لشکر کی نذر کر دیں اور جو کچھ وقتاً فوقتاً ان سے بن آوے وہ لشکر اسلام کی خدمت کرتے رہیں۔

آٹھویں جنگ

یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور ہے کیونکہ اب کے ایک فرانسیسی جنرل سے مقابلہ تھا جو سکھوں پر کمان کر رہا تھا اور جسے دربار لاہور نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا تھا۔ ان صاحب بہادر کا نام اسوا شورا تھا یہ دربار لاہور میں اپنی جانبازی اور فوجوں کو دشمن سے لڑانے میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ غرض تین ہزار سکھی فوج لے کے

بڑھے اور چلتے وقت یہ وعدہ کر آتے ہیں کہ میں سید احمد اور اسمٰعیل کو حضور کے دربار میں زندہ لا کے کھڑا کر دوں گا، فوراً دریائے اباسین کو معہ چند مسلمان سرداروں کی رہنمائی کے عبور کیا، اور اب سید صاحب کے کیمپ کی طرف بڑھے۔ لیکن بڑھنے سے پہلے وہ ہنڈ ریاست میں ٹھہر گیا۔ یہاں ایک باغی امیر[1] مسلمان کا عمل دخل تھا وہ سید صاحب سے بیعت کر کے باغی ہو گیا تھا، اس نے فرانسیسی جنرل کو غریب الوطن مسلمانوں کے رازدارانہ حالت کی بہت کچھ اطلاع دی اور بیان کیا کہ یہ مٹھی بھر آدمی ہیں صرف اسمٰعیل کی تدبیروں سے چار چار پانچ پانچ ہزار فوج سے میدان لیا ہے۔ فرانسیسی نے بہت غور سے رئیس کی تقریر سنی اور حکم دیا کہ تم بھی ہمارے لئے کچھ فوج جمع کر دو۔ کئی دن تک یہاں مقیم رہا اور بہت سا سامان رسد اور کئی توپیں ڈھائی ہزار فوج نئی بھرتی کر کے مولانا شہید کے کیمپ کی طرف بڑھا یہاں دم دم کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ آپ بھی اپنی تیاری سے غافل نہ تھے۔ آپ نے چاروں طرف دیکھ بھال کے مورچہ بندی کے لئے ایک مقام دو پہاڑوں کے بیچ میں پسند کیا۔ یہی رستہ تھا جسے طے کر کے آدمی پنجتار میں آ سکتا تھا۔ آپ نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں پھرتی سے ایک دیوار ساڑھے پانچ فیٹ بلند بنوائی۔ اس کی تعمیر میں مولانا شہید اور سید احمد بھی شریک تھے بارہ تیرہ سو مسلمانوں نے دو تین دن کے عرصہ میں اس پھرتی سے ایک مضبوط دیوار بنائی کہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ دیوار پر چار برجیاں بنائیں اور ہر برجی میں ایک ایک توپ لگائی گئی۔ کئی کئی گولہ انداز مقرر کئے گئے یہ دیوار گویا مسلمانوں کا زبردست مورچہ بنی۔ سکھ تو سکھ اس وقت اگر فرانسیسیوں کا زبردست لشکر بھی حملہ کرتا تو مسلمانوں کا خیال تھا کہ ایک دفعہ تو ہم اسے بھی پسپا کر دیں گے یہ مانا کہ آدمی بہت کم تھے مگر ان میں ابتدائی مسلمان عروج کا سا جوش تھا، اور ہر شیر شمشیر بکف جنگ کرنے کے لئے موجود تھا۔ آخر کئی دن کے بعد فرانسیسی جنرل وہاں آ کے پہنچا، اور اپنے خیمے وہیں نصب کئے۔

مولانا شہیدؒ اور سید صاحب نے اب کے اور ایک نیا انتظام کیا تھا یعنے فوج کے تین حصے کر کے ہر حصہ کو ذرا فاصلہ پر روانہ کر دیا تھا۔ پہلے نشان کا نام صبغۃ اللہ تھا اس کو

---

[1] سردار خادی خان باغی ۱۲

سفید اور زرد ریشم وَمَنْ یَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبْرَاھِیْمَ آخر آیت تک نفیس حرفوں میں کاڑھی گئی تھی یہ نشان وادا ابوالحسن نصیر آبادی کے پاس تھا جو چار سو جانباز مسلمانوں کے آگے ایک خوبصورت گھوڑے پر سینہ تانے ہوئے کھڑا تھا۔ دوسرا نشان جس کا نام مطیع اللہ تھا اور جس پر سورہ بقرہ کا آخری رکوع سبز ریشم سے موٹے موٹے لفظوں میں نہایت ہی خوشخط کاڑھا گیا تھا ابراہیم کے پاس تھا جو خود فولادی اور زرہ بکتر پہنے ہوئے اپنے حصتہ کو لے ادھر اُدھر گردش لگا رہا تھا۔ تیسرا نشان فتح اللہ نامی تھا اس پر اخیر رکوع سورہ صف کا لکھا ہوا تھا، اور اس کو ایک عرب محمد نام لئے ہوئے تھا۔ یہ نشان نہایت ہی خوق البھڑک تھا اس کا حاشیہ ایک خوبصورت ہلال کا تھا اور جو آیت اس کے بیچے کاڑھی گئی تھی وہ بالکل سرخ ریشم کی تھی یہ ساری ترکیبیں مولانا شہید کی تھیں، آپ گویا کمانڈر انچیف اور ان پروں کے لڑانے والے تھے۔ جب تمام سلمان اس طرح میدان میں آکر جمے تو مولانا شہید نے نہایت پر شوق اور فرحت افزا نگاہوں سے اس طرف دیکھا، مسلمانوں کی آن بان اور ان کے بہادرانہ تیور دیکھ کے پیارا شہید بہت ہی خوش ہوا، اور پھر سب کے بیچ میں کھڑے ہو کے آیت بیعت رضوان پڑھ کے سُنائی اور نہایت خوبی سے اس آیت کی تفسیر بیان کی، عام مسلمانوں میں جن میں قندھاری بھی دو ڈھائی سو شامل تھے ایک عجیب تحریک پھیل گئی، ایک ایک نے وجد انگیز حالت میں نہایت صدق دلی سے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی یہ بیعت گویا ایک قسم کا پجن تھا کہ جنگ میں ہم منہ نہیں موڑنے کے اور جب تک ہماری جان میں جان باقی ہے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑنے کے، بس اسی ایک قسم کی بیعت کو شریعت اسلام کے بانی نے جائز قرار دی ہے اور یہ موجودہ پیری مریدی کی مکروہ بیعت ایک محض لغو اور ناکارہ خلاف اسلام فعل ہے۔

وہ وقت آگیا کہ مولانا شہیدؒ کے وعظ کے اثر کا نتیجہ جو مسلمانوں کے دلوں پر ہوا تھا ہو رنگ لائے۔ یہاں فرانسیسی جنرل آندھی اور بینہ کی طرح یلغار کرتا ہوا زیر دیوار پہنچا۔ ابھی دو گولی کے پٹے سے بھی زیادہ تھا کیمپ بہت پیچھے رہ گیا تھا اس نے ایک بلند ٹیلہ پر چڑھ کے دوربین سے مسلمانوں کی فوج کو ملاحظہ کیا جو کہ مولانا شہید نے تیرہ سو آدمیوں کو

ٹکڑیاں ٹکڑیاں کر کے ذرا دُور دُور کے فاصلہ پر اس ترکیب سے کھڑا کیا تھا کہ دیکھنے والے کو ہرگز یہ تمیز نہ ہو سکتی تھی کہ یہ صرف تیرہ سو ہی ہیں جوں ہی اس کی نظر لہراتی ہوئی سرخ و زرد جھنڈوں پر پڑی اور زرہ بکتر والے سواروں کو ادھر اُدھر دوڑتے ہوئے دیکھا ہوش باختہ ہو گئے، متعجب اور خوف زدہ ہو کے کہنے لگا او خادی خان رئیس ہنڈ باغی، تم نے ہمیں دھوکا دیا تم کہتا تھا اسمٰعیل کے ساتھ غازی تھوڑے ہیں یہ اتنے کہاں سے آ گئے اور بابا ہم اتنے غازیوں سے کیونکر میدان جنگ لے گا جب تک مہاراجہ رنجیت سنگھ خود ہی نہ آئے گا اسے فتح نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی رئیس ہنڈ نے اطمینان کیا اور کہا آپ جنگ کریں میں اور فوج جمع کر دوں گا۔ غرض بہزار دقت قدم بقدم اپنی فوج کو لے بڑھا، گیا تو بہت تیز رفتار میں آ رہا تھا یا اس نے اب دھیمی چال کر دی اور ایک طرف سے پیارے شہید کو دھوکا دے کے دوسرے رُخ سے دیوار پر جا پہنچا اور دیوار کو ڈھانا شروع کر دیا۔ اس وقت مولانا شہید نے بھی عجیب کام کیا، آپ نے پہلے صبغۃ اللہ نشان والی فوج کو بڑھنے کا حکم دیا او پھر جو تاک تاک کے گولہ اندازی کی ہے انہیں سنبھلنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اب سکھ پسپا ہوئے اور جیسے بے دھڑک وہ دیوار پر چلے آئے تھے کئی سو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بہادر ابوالحسن صبغۃ اللہ لئے ہوئے برابر وجد انگیز حالت میں بڑھا چلا جاتا تھا، بندوق دونوں ہاتھوں میں تھی توڑا سلگ رہا تھا مگر ابھی اس نے نہ اس کی فوج نے فیر کرنے شروع کئے تھے۔

مولانا شہید ان تمام ٹکڑیوں کو لڑا رہے تھے، آپ کے ہاتھ میں ایک سبز جھنڈی تھی، اور آپ نے یہ حکم دے دیا تھا جب تک میں جھنڈی نہ ہلاؤں فیر نہ کئے جائیں۔

ہر جانباز بہادر بے چین تھا کہ اسمٰعیل جھنڈی کیوں نہیں ہلاتا آخر جب وہ موقع آگیا کہ مسلمانوں کے فیر کچھ کام کرتے، آپ نے جھنڈی ہلائی اور ایک کڑا کے کی آواز میں اللہ اکبر کہا۔ بس یہ کہنا تھا کہ فیر شروع ہو گئے اور بڑھتے بڑھتے اس قدر قریب آگیا کہ سینہ بسینہ جنگ کی ٹھہر گئی۔ اتفاق سے نشان بردار کے بازو میں ایک گولی لگی اور مولانا شہید نے دیکھا کہ نشان جھکنا چاہتا ہے کہ آپ قلب فوج میں سے لپکے اور فوراً اس کے ہاتھ سے نشان لے کے اس پرے کی کمان کرنے لگے، قدرتی طور پر پیارے شہید کا رعب سکھوں کے دلوں

پر اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ جہاں اُنہوں نے صورت دیکھی اور وہ کانپ گئے، اب کیا تھا
خوب گھمسان کا میدان ہوا۔ تلوار، بندوق، چھری، کٹاری ہر ایک چیز چل رہی تھی جس کے
پاس جو کچھ ہوا اس نے مقابل کی اُسی سے خبر لے لی جدھر یہ شیر گرتا تھا صفوں کی صفوں کو
کائی کی طرح سے چیر ڈالتا تھا۔ مولانا شہید جب کئی سکھوں کی کمپنیوں کو صاف کر چکے تو
آپ کی طبیعت میں خطرناک دلیری کا ایک دھواں دھار جوش اٹھا اور وہ جوش یہ تھا کہ
انٹورا صاحب جنرل افواج سکھ کا سر کاٹ لاؤں۔ یہ جوش گو آپ کی نڈر طبیعت بیدھڑک
دلیری تیز شجاعت اور سخت بے جگری کا شاہد تھا مگر ساتھ ہی اس کے خوش آئند نہ تھا۔
فرانسیسی دو ہزار سنگین سکھوں کے بیچ میں محفوظ تھا وہاں تک دو تین سو آدمیوں کا اول تو پہنچنا
ہی محال تھا اور اگر پہنچ بھی جائیں تو کامیابی یہ عنقا صفت سمجھنی چاہیئے۔

باایں ہمہ پیارا شہید پسپا کرتا ہوا سکھوں کے قلب تک جا پہنچا اور ذرا دم لے کے
اپنے پراگندہ آدمیوں کو سمیٹا اور ارادہ کیا کہ بجلی کی طرح انٹورا پر جا پڑوں۔ وہ مولانا شہید
کی غیر معمولی شجاعت کی بانگی دیکھ رہا تھا اور یہ بھی اس کی نظر میں تھا کہ اور جتنے اسلامی پرے
لڑ رہے ہیں کوئی پیش قدمی کر کے اس قدر آگے نہ بڑھ سکا جتنا اسمٰعیل اپنی کمپنی کو لے کے
آگے بڑھ آیا یہ خیال انٹورا کو پسپا کرنے کے لئے کافی تھا ایسا ہیبت ناک اثر اس کی
طبیعت پر ہوا کہ اس نے باگیں اٹھا دیں اور بشکل مسلمانوں سے پیچھا چھٹا کے اپنے کیمپ
میں آرام لیا۔ بھلا بپھرا ہوا شیر (اسمٰعیل) کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کے آگے سے گورخر
کی طرح بھاگ جائے۔ اس نے تعقب کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل کیمپ اور اس کا سامان
مسلمانوں کے لئے چھوڑ کے آپ سیدھا لاہور کی طرف بھاگا یہ فتح بہت شان و شوکت سے
مولانا شہید کو حاصل ہوئی۔

نویں جنگ

نابکار خادی خان نے اس شکست سے بڑی منہ کی کھائی۔ رستہ میں جتنے گھر اور گاؤں
مسلمانوں کے آئے ایک ایک کو بتا بتا کے انٹورا صاحب سے آگ لگوا دی اور معصوم بچوں کو

سکھوں کی خون آلود تلوار سے قتل کرایا جہاں تک اس سے ہو سکتا تھا مسلمانوں کی بیخ کنی میں کوتاہی نہ کرتا تھا۔ اپنے اضلاع میں نئی نئی گھڑنتیں گھڑ کے پیارے شہید اور سید احمد صاحب کو بدنام کرتا اور ہمیشہ ان کے خلاف مسلمانوں کو آمادہ پیکار کرتا رہتا تھا۔ لطف یہ تھا کہ صدق دلی سے بیعت بھی کر چکا تھا۔ مولانا شہیدؒ نے کہا سکھوں سے تو ہم لڑتے ہی رہیں گے مگر سب سے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹا دینا چاہیئے۔ مبادا کسی وقت اس سے سخت چشم زخم پہنچے۔ اب اس یورش کے قابل سوائے پیارے شہید کے اور کون تھا۔ سات سو آدمیوں کو ساتھ لے کے آپ ہنڈ کی طرف بڑھے۔ خادی خان کو بھی مولانا اسمٰعیلؒ کے آنے کی خبر ہوئی وہ اپنے قلعہ کی مضبوطی اور فوج ہونے پر اس قدر غرّان تھا کہ اسے کچھ پروا نہ ہوئی اور اس نے کہہ دیا اسمٰعیل کی قضا لا رہی ہے بھلا کسی کے گھر پر چڑھ کے آنا مشکل اور کام رکھتا ہے پہلے آپ کا ارادہ تھا کہ شب کو سیڑھیاں لگا کے قلعہ پر چڑھ جائیں مگر شب کو رستہ بھولنے کی وجہ سے یہ ارادہ تو پورا نہ ہو سکا۔ ابھی صبح کی پو پھٹی تھی کہ آپ قلعہ ہنڈ کی دیواروں کے نیچے جا پہنچے۔ کل ڈیڑھ سو آدمی ساتھ تھے اور باقی ماندہ پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ نے خاموشی سے بارہ بندوقچیوں کو بھیج دیا کہ تم دروازہ کے پاس اس ٹیلہ کے پیچھے چھپ کے کھڑے ہو جاؤ۔ جوں ہی دروازہ کھول کر قلعہ میں سے لوگ نکلیں اور شہر کی طرف جانے لگیں تم فوراً قلعہ میں گھس جانا اور انہیں گولیاں مار دینا، بھاگتے ہوؤں کو روکنا نہیں، مقابلہ کرنے والے کو تہ تیغ کرنا۔ ابھی بہت روشنی نہ ہوئی تھی۔ نسیم سحری طفلانہ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چل رہی تھی اور خادی خان کو خبر دے رہی تھی کہ تیرا یہ خواب نوشین زہر آلود ہے۔ مگر وہ کچھ اپنے قلعہ کی مضبوطی میں ایسا مخمور تھا کہ اسے نسیم سحری کے جھوکوں کی اطلاع کی بھی ذرا خبر نہ تھی، جوں ہی مولانا شہید نے بندوقوں کی آواز سنی آپ بھی فوراً بندوق چھتیائے ہوئے معہ ہمراہیوں کے داخل قلعہ ہوئے۔ ہتھیار اٹھانے کی بھی فرصت نہ دی اور سب کو خوف دے کے باہر نکال دیا۔ قلعہ کے دوسرے حصہ میں خادی خان سوتا تھا۔

ٹھائیں ٹھائیں بندوقوں کی آواز ہوئی اور لوگوں کا غل سنائی دیا تو بےخبر رئیس ہڑبڑا کے

اٹھا اور پریشان باہر نکل آیا دیکھا تو یہاں گلی ہی اور کھلا ہوا ہے ۔ فوج کے سرداروں کو ڈراؤنی صدائیں پکارا وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا ۔ پھر وہ اپنے کمرہ کے زینہ سے قلعہ کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے غل وشور مچانا شروع کیا ۔

سراسیمہ ادھر اُدھر بھاگا پھرتا تھا، آخر ایک مسلمان کی گولی نے اُسے تھل بیڑے سے بٹھایا ۔

یہ تعجب سے دیکھا جائے گا کہ سوائے سامان حرب کے مولانا شہیدؒ نے قلعہ میں کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اس کی مستورات کو حکم دے دیا کہ تم جہاں چاہو چلی جاؤ اور اپنا کل مال و متاع لے جاؤ ۔ چنانچہ وہ اپنا تمام سامان لے کے چلتی بنیں ۔ اب مولانا شہید کا قبضہ بالکلیہ قلعہ پر تھا ۔ مگر مخالفت کی آگ دن بدن بھڑکتی جاتی تھی اور افسوس یہ ہے کہ غریب الوطن مسلمانوں میں کوئی بھی مولانا اسمٰعیل جیسا تدابیر جنگی میں ماہر و کامل نہ تھا پھر کون امید کرسکتا ہے کہ زمانہ کے وہ وعدے جو اس نے مولانا شہید سے بچپن میں کئے تھے پورے ہوتے، اور تمام وہ آرزوئیں جو اول دن سے آپ کی طبیعت میں اٹھ رہی تھیں بر آتیں ۔ اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا ۔

یہاں مولانا شہیدؒ کا قبضہ ہنڈ کے قلعہ پر ہوا اور وہاں پنجتار اور ہنڈ کی راہ مخالفوں نے بند کر دی ۔ سید صاحبؒ سخت پریشان ہوئے اور متذبذب تھے کہ کیا کرنا چاہیئے کاش وہ اپنے کل آدمیوں کو لے کے ہنڈ میں چلے آتے تو یہ چشم زخم جو بہادر شہید نے اٹھائی کبھی اس شجاع نفس کو نہ اٹھانی پڑتی ۔ خبر نہیں سید صاحب کیا سوچتے رہ گئے اور انہوں نے اسمٰعیل کی ذرا بھی خبر نہ لی، قلعہ میں صرف سوا سو کے قریب آدمی تھے جس میں سے کم ہوتے ہوتے ساٹھ رہ گئے تھے ۔ کیونکہ ایک ایک دو دو شخص روز سید صاحب کی خدمت میں روانہ کئے جاتے تھے کہ آپ فوراً قلعہ ہنڈ پر آجائیں، خبر نہیں رستہ ہی میں بیچارے مخالفین کی تیغ برّان کے شکار ہو جاتے تھے یا سید صاحب کے کیمپ میں جا کے غائب ہو جاتے تھے ۔

حاکم قلعہ کے بھائی امیر خاں نے تنگ ہو کے اور قلعہ کی فتح سے مایوس ہو کے

سید صاحبؒ کو جاگا تھا کہ آپ مجھے قلعہ واپس دلوا دیں میں آئندہ سے شریعت محمدی کے موافق عمل درآمد کرنے کو موجود ہوں وہ بیچارے ایک فقیر طبیعت آدمی تھے انہیں ملکی اور جنگی معاملات سے اتنی دلچسپی نہ تھی گو آپ کی دلیری اور بے جگری میں کلام نہ تھا مگر ایسی شجاعت جب تک کہ اس کے ساتھ پولیٹیکل دماغ نہ ہو محض بے کار ہوتی ہے۔ امیر خان کے بہکائے میں آکے آپ نے مولانا اسمٰعیل کو ایک رقعہ لکھ بھیجا کہ قلعہ فوراً حامل رقعہ ہذا کے حوالہ کر دو یہ آئندہ شریعت محمدی کی اشاعت دینے کی قسم کھاتا ہے۔

شاہ صاحب نے زیادہ وقعت کی نظر سے اس رقعہ کو نہ دیکھا اور اس کا جواب لکھ بھیجا یہ قلعہ اس آسانی سے نہیں دیا جا سکتا، قصہ مختصر کہ آخر حاکم پشاور نے پانچ ہزار فوج سے قلعہ ہنڈ پر حملہ کیا تاکہ اپنے سپاہی کا انتقام لے۔ یہاں پچاس ساٹھ آدمی جن کے پاس سامان بھی بہت کم رہ گیا تھا کیونکر ایسی عظیم الشان فوج کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ سید صاحب کا رستہ دیکھتے دیکھتے شاہ صاحب کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں مگر وہاں صدائے برنخاست کا مضمون تھا، آخر غازی اسمٰعیل محصور ہو گیا۔ حاکم پشاور کے لشکر کی کمان ایک انگریز کیول صاحب نامی کے ہاتھ میں تھی۔ آٹھ دن تک غازی نے ان مٹھی بھر آدمیوں سے پانچ ہزار فوج کو قلعہ پر قبضہ نہ پانے دیا مگر تابکے رسد بند کر دی گئی تھی۔ پانی سوائے چشمان پرنم کے کہیں ڈھونڈے بھی نہ ملتا تھا کیونکر کام چل سکتا تھا۔ حاکم پشاور کو یہ خبر نہ تھی کہ اسمٰعیل ایسا خستہ حال ہے وہ آٹھ دن کے محاصرہ سے خود تنگ آگیا اس نے کیول صاحب کی معرفت صلح کا پیام دیا۔ چونکہ ایک انگریز کا قدم بیچ میں تھا اس لئے شاہ صاحب کو بھروسہ تھا کہ مجھ سے دغا نہ ہوگی۔ معاہدہ میں یہ امر طے پایا کہ اسمٰعیل اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کے قلعہ سے نکل جائیں کوئی مزاحم نہ ہوگا مگر ہتھیار ایک بھی ساتھ نہ ہو۔ جب عہد نامہ پر کیول کے دستخط ہو گئے تو شاہ اسمٰعیل معہ اپنے جاں نثار ہمراہیوں کے نہتے قلعہ میں سے نکل آئے۔ حاکم پشاور سلطان محمد خان نے سخت بزدلی اور بے ایمانی کو کار فرما کر کے مولوی اسمٰعیل کو ان کے کل آدمیوں کے ساتھ قید کر لیا۔ کیول چونکہ ایک ایمان دار مسیحی تھا۔ اپنے آقا کے اس بزدلانہ پن سے سخت ناراض ہوا۔ اور

نہایت سخت و سست کہا، نتیجہ کچھ بھی نہ ہوا، کیسوں نے نوکری چھوڑ دی اور شاہ صاحب نہایت بے کسی کی حالت میں قید ہو گئے۔ سلطان محمد نے مولوی اسمٰعیل کو سامنے بلا کے کہا تم جانتے ہو تمہارے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے گا۔ مولانا شہیدؒ نے بیباکانہ جواب دیا تیری شقاوت قلبی اور بے ایمانی سے یہ اُمید ہے کہ تو ہمیں شربت شہادت پلا دے، بسم اللہ ہم اس کے لئے تیار ہیں اور بہت خوشی سے خدا کی راہ میں گردن کٹانے کو موجود ہیں۔

یہ خبر خوفناک آگ کی طرح پنجتار میں پہنچی۔ سید صاحب اور غازیوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہر مسلمان غریب الوطن کا دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس کے اس سخت جانکاہ غم نے اُنہیں بزدل نہ بنا دیا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ طیش میں بھر گئے اور انہوں نے عہد کر لیا کہ جب تک اسمٰعیل کا انتقام سلطان محمد سے نہ لے لیں گے ہمیں کھانا پینا حرام ہے۔ سید صاحب نے بصلاح چند مسلمین پشاور کی طرف باگیں اٹھا دیں۔

سلطان محمد نے جب یہ سُنا کہ سید صاحبؒ پشاور کی طرف بڑھے ہیں وہ قلعہ ہنڈ کو چھوڑ کے پشاور میں ہل ہانکتا کو دوں پھانکتا پہنچا، قیدی اس کے ساتھ تھے۔ یہاں پنج کے قیدیوں کو اُس نے ایک سخت گڑھی میں قید کیا جو جو تکلیفیں بے چارے غازیوں کو دی جاتی تھی وہ قابل بیان نہیں گڑھی کے ارد گرد دو سو سواروں کا پہرہ ہر وقت رہتا تھا مگر مولانا اسمٰعیل اپنی رہائی کی تدبیر میں لگے ہوئے تھے، اور اس تکلیف اور سخت تر قید میں بھی مایوس ہو کے نہ بیٹھ رہے تھے۔ ایک دن موقع پا کے آپ فصیل پر مع اپنے کل آدمیوں کے چڑھ آئے وہاں سے دھڑام دھڑام کود کے سواروں پر گر پڑے، سوائے بودی سی لکڑیاں یا پتھروں کے آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ شب کی تاریکی نے سواروں کو سراسیمہ کر دیا کئی سوار گر پڑے، اور کتنے سوار ادھر ادھر جان کے خوف سے چھپ گئے۔ شاہ صاحب کے ہاتھ میں گھوڑے اور سامان حرب بندوق تلوار وغیرہ لگ گیا، آپ گھوڑوں پر سوار ہو کے یہ غل مچاتے ہوئے بھاگے۔ سلطان محمد خان سے کہہ دینا اسمٰعیل جاتا ہے اگر روکا جائے

توڑ دول لے۔

آپ دھڑاکے سے نکلے چلے آئے کسی کا یہ یارا نہ ہوا کہ آپ کا تعقب کرتا۔ یہاں سے رہائی پا کے آپ پنجتار پہنچے اور سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھتے ہی سید صاحب اور کل غازیوں کی جان میں جان آگئی، اور سب نے شکر خدا کیا کہ ظالم عہد شکن کے پنجہ سے کس آسانی سے جان بچائی۔

سید صاحب کا ارادہ تھا کہ اپنا ہیڈ کوارٹر کشمیر کو بنائیں مگر رستہ کے امیروں کی مخالفت سے کوئی امید نہ ہو سکتی تھی کہ غریب الوطن صحیح وسالم کشمیر پہنچ سکیں گے۔ ایک بار شاہ اسمٰعیل صاحب نے کوشش بھی کی مگر انب وعشرہ کا حاکم آپ کا سد راہ ہوا۔ اس لئے آپ کو مجبوراً واپس آنا پڑا، اور اب آئندہ حملہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

دسویں جنگ

مولانا شہیدؒ کو کشمیر کے راستہ میں جس ریاست نے روکا تھا وہ انب کی دولت مند ریاست تھی اس کی سرسبزی اور خودسری کی دھاک تمام پنجاب پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صلاح یہ ٹھہری کہ کشمیر کی جگہ غازیوں کا ہیڈ کوارٹر انب ہی کو کرنا چاہیئے مگر ریاست انب پر قبضہ کرنا کچھ منہ کا نوالہ نہ تھا بلکہ اس مشکل کشائی کے لئے اسمٰعیل جیسے نڈر بہادر اور فنون جنگ کی ضرورت تھی۔ کئی دن کے مشورہ ہونے کے بعد مولانا شہیدؒ نے انب کی طرف باگ پھیری۔

پائندی خان حاکم انب کو جب معلوم ہوا کہ اسمٰعیل یلغار کرتے ہوئے آرہے ہیں تو اس نے ایک چال چلی یعنے ایک فدویت نامہ لکھ کے شاہ صاحب کی خدمت میں روانہ کیا اور صاف طور پر تحریر کر دیا کہ میں نے اطاعت قبول کی۔ احکام اسلام کی پابندی اپنے اوپر فرض جانی، اور اپنی کل ریاست میں احکام جاری کر دوں گا کہ ہر شخص قرآن وحدیث کے مطابق آئندہ سے عمل کرے۔ اس سے بہتر شاہ صاحب کی نظر میں اور کونسی بات آسکتی تھی۔ آپ یہ فدویت نامہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے اور باری تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ

تیری ہی برکت سے تیرا جلال پنجاب کے تاریک تر خطہ میں پھیلتا جاتا ہے۔

پائندی خان اپنے خیال میں جب مسلمانوں کو چکمہ دے چکا تو اب اس نے دو ہزار مردِ میدان منتخب کر کے حملہ کی تیاری کی اور چاہا کہ غفلت میں سب کو تہِ تیغ کر ڈالوں مگر اس کا یہ بزدلانہ خیال خبط تھا جنون تھا اور محال تھا۔ شاہ اسمٰعیل بڑا تجربہ کار اور ہوشیار جنگی شخص تھا وہ اپنی خواب گاہ میں بھی ہتھیار باندھ کے سوتا تھا وہ بالکل امن کی جگہ بھی چوکنّا رہتا تھا، اس کی طرف سے قطعاً ہتھیار کھولنے کی ممانعت تھی اور حکم تھا فتح کے بعد بھی ایسے چوکنے اور ہوشیار رہو گویا تم مغلوب ہو چکے ہو اور تمہیں اپنے مہیب دشمن کا خوف ہے۔

شب کے تین بجے پائندی خاں نے اپنے خیال میں غافل پا کے اسمٰعیل پر حملہ کر دیا یہاں سارا معاملہ لیس تھا ایسی خونریزی سے جنگ ہوئی اور بہادر ایسی جان توڑ کر لڑے کہ بڑے نقصان کے ساتھ پائندی خان کو بھاگنا پڑا، اور پھر اس پیمان شکن کا آنب کے کسی ضلع میں بھی ٹکنا دشوار ہو گیا، معمولی طور پر اس کا چند آدمیوں نے تعقب کیا مگر اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ دریائے اباسین کو عبور کر کے خبر نہیں کہاں کا مارا کہاں جا نکلا۔

آنب چونکہ سرسبز دولت مند اور وسیع ریاست تھی اس لئے فی الحال مولانا شہید نے یہی بہتر سمجھا کہ آنب ہی کو ہیڈ کوارٹر بنایا جائے چنانچہ نہایت اطمینان سے کل دفاتر قاضیوں اور مفتیوں کے کھولے گئے، اور بالکل ہر بات شرع محمدی کے موافق انجام پانے لگی۔ سید صاحب نے نئے طور سے اپنی مہر کندہ کرائی جس پر اسمہ احمد لکھا ہوا تھا۔ مولانا شہیدؒ نے بھی ایک مہر کندہ کرائی، اس پر واذکر فی الکتاب اسمٰعیل لکھا ہوا تھا یہ دونوں مہریں کبھی تو مولانا شہید کی امانت میں رہتی تھیں اور کبھی منشی فضل الرحمان صاحب کے پاس رہتی تھیں ہر شئ کا حساب کتاب ہر منشی کے پاس تھا اور علیحدہ علیحدہ ہر ہر محکمہ کے افسر مقرر ہو گئے تھے تحصیل مالگذاری کا بندوبست بھی بطرز احسن ہو گیا اور جتنی باتیں کہ تدابیر ملکی کے لئے ضروری ہیں وہ سب مولانا شہید جیسے صائب رائے کی بدولت انجام پذیر ہو گئی تھیں اور اب کسی قدر شانِ دینِ احمدی معلوم ہوتی تھی۔ غریب الوطن مسلمانوں کو بھی چنداں آرام ملا تھا اور ہر شخص خوش و

خرم نظر آتا تھا۔

گیارہویں جنگ

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مسلمان لڑاکوں کی دھاک ملک پنجاب پر ایسی زبردست بیٹھی ہوئی تھی کہ ہر لشکری کا دل کانپتا تھا اور بڑے بڑے افسر مالے بیٹھے تھے کہ ہم نے اسمٰعیل جیسا جنرل اور فوج کو لڑانے والا نہیں دیکھا۔

لفظ اسمٰعیل پنجاب میں بچہ بچہ کو معلوم تھا اور اس کا ایسا خوف چھایا ہوا تھا کہ درانیوں اور سکھوں کی عورتیں اپنے بچوں کو اسمٰعیل کے نام سے ڈراتی تھیں صرف اس بے نظیر قوی جری اور شجاع نفس کی بدولت پنجاب کا بہت سا حصہ سید صاحب کے زیر حکومت ہو گیا تھا پنجتار قلعہ لنڈھ اور اس کے تمام اضلاع نوبت بنوبت فتح ہوتے چلے گئے تھے۔ دریائے اباسین کا سارا ملک مسلمانوں ہی کے زیر حکومت تھا۔ زیدہ، تربیلا، پھولڑہ وغیرہ وسیع اور سرسبز صوبے سب فتح ہو چکے تھے۔ اور فی الحال محمدیت نے سب کو اپنا محاط بنا لیا تھا۔ مولانا شہید ارمان بھری خوش خوش نظروں میں دین خدا کی سچی نورانی ہدایت کی اشاعت دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں پھولے نہ سماتے تھے آپ کا اصلی مدعا یہ تھا کہ شرک اور بدعت کی خراب اور غلیظ رسم مٹ کے وحدت پرستی کا نور چمکے۔ اس سے زیادہ ایک مصلح اپنی مرادمیں اور کیا کامیاب ہو سکتا ہے۔ خود خداوند تعالیٰ اس جانکاہی اور بے مثال کوشش کی داد دیتا تھا۔ اور تمام مخلوق عرش ذرہ ذرہ مرحبا وص مرحبا کی صدائیں بلند کرتا تھا۔ یہ ایک شاعرانہ استعارہ نہیں ہے بلکہ ایک تحقیقی بات ہے جب ایک مقدس نفس ایک عظیم الشان غرض کی انجام دہی کر چکتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ بھی نکل آتا ہے۔ اس وقت خود اس کا دل دلتا ہے اور اسے مبارک باد دیتا ہے اور وہ اس آواز کو اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ یہ وہ واز ہے کہ جو حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر آئی تھی اور جس آواز میں خدا بولتا ہے۔ یہ آواز ان ہی مقدس اور برگزیدہ انفاس کو آتی ہے جن کا دل دنیاوی کدورتوں سے پاک ہوتا ہے اور جن کے نورانی قلب پر ہر دم ربانی جلوے پرتوفگن ہوتے ہیں ان کا یقین معمولی یقین رکھنے والوں

سے کہیں بڑھا ہوا ہے، ان کا اعتقاد اپنے اکثر ہمعصروں سے درجۂ ممتازیت رکھتا ہے، اپنے دل کی مستقیم حالت سے جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں خداوند تعالیٰ اس میں ہمارا رہبر ہے۔ وہ خدا کا جلال باطنی آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھنے لگتے ہیں اور انہیں کچھ تعجب نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اپنی تمام آئندہ اور گزشتہ آرزوں کو پہلو بہ پہلو اپنے دل میں آتا ہوا اور موجود دیکھتے ہیں اور باہم مقابلہ کرنے کی قوت ان میں پوری ہو جاتی ہے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ اپنی ناکامی کو بھی کامیابی تصور کر کے اس سے خوش دل رہتے ہیں۔ غرض ایسے مصلح جن کے دل اُتار چڑھاؤ کی یہ کیفیت ہوتی ہے انہیں یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ ہم دنیا میں محض اصلاح قومی اور خدا کی مخلوق کے لئے بہبودی کے سامان مہیا کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اسی پاک اور برتر خیال میں ہوش سنبھالتے ہیں۔ اسی میں جوان ہوتے ہیں، اسی میں پوری عمر میں پہنچ کر جان بحق تسلیم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح مولانا شہید کا حال تھا جو آرزو کہ آپ نے ہوش آتے ہی کی تھی وہ نہ دولت ہونے کی تھی اور نہ ملک گیری کی خواہش تھی صرف یہ آرزو تھی کہ جس طرح ہو قرآن و حدیث کے احکام کی پابندی مومنین پھر سرگرمی سے کریں اور اپنے کو کسی کے ساتھ بجز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نسبت دینی سخت بے ادبی اور خیرہ چشمی خیال کریں۔ کتنے غضب کا مقام ہے کہ جس مسلمان سے دریافت کرو کہ تمہارا مذہب کیا ہے یا تم کس گروہ میں ہو تو وہ اس کا جواب یہ دے گا کہ میں حنفی ہوں یا شافعی ہوں یا حنبلی ہوں یا مالکی ہوں یا کیا جانے کیا کیا ہوں مگر کسی خدا کے بندہ کی زبان سے یہ نہ نکلے گا کہ میں الحمد للہ محمدی ہوں اس سے زیادہ بے ادبی مسلمان ہو کے اور کیا ہو سکتی ہے، کفرانِ نعمت اور محسن کشی اسی کو کہتے ہیں۔ اگر نسبت کا بھی کچھ شرف ملتا تھا تو چار صحابہ کو مگر یہ بات نہ ہوئی، نہ کوئی ابوبکری ہوا، نہ عمری ہوا نہ عثمانی ہوا ہاں حضرات شیعہ خواہ مخواہ اپنے کو شیعانِ علیؓ کہتے ہیں مگر جب ان سے دریافت کیا جائے گا تو جواب یہی دیں گے کہ ہم شیعہ ہیں۔

ہمارے شہید نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی زبان سے یہ نکلوا دیا کہ ہم محمدی ہیں چاروں

(حیاتِ طیبہ ص ۲۰۳ ، مولانا مرزا حیرت)

طرف سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اس ضلع میں اتنے محمدی آباد ہیں اور اس ضلع میں اتنی تعداد اسلامیوں کی ہے۔

یہ مولانا شہیدؒ کی تائید غیبی سمجھنی چاہیئے کہ دن بدن ان کی سلطنت خود بخود بڑھتی جاتی تھی اور تمام سرداروں کے فدویت نامے برابر چلے آ رہے تھے۔ مسلمانوں کے پاس سامان حرب مکمل ہو گیا تھا، اور چند روز کے آرام نے انہیں پھر کے سے ایسا تازہ دم بنا دیا تھا کہ اب ان کی تلواریں میانوں میں تڑپنے لگی تھیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ جو کئی شکستوں کے بعد بھی اب تک خواب خرگوش میں پڑا سوتا تھا آخر بیدار ہوا، اور متوحش نظروں سے اسمٰعیل کی فتوحات کی لین ڈوری آگے بڑھتی ہوئی دیکھی اس کے ہوش و حواس پراگندہ ہو گئے۔ اور اب اسے یقین ہو گیا کہ جب تک میں بذات خود اس کا انتظام نہ کروں گا ملک بچنا مشکل ہے۔

سکھ اب تک بالکل بچے ہوئے ایک آدھ شکست کھا کے سیر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے رشوتیں دے دے کے مسلمان رئیسوں کو سید صاحب کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور کوئی مسلمان سید صاحب سے مخالفت نہ کرتا بلکہ ساتھ دیتا تو پھر ناممکن تھا کہ پنجاب بھر میں سکھوں کی سلطنت کا نام و نشان بھی رہتا مگر یہ بات ہی اول دن سے ہونی نہ لکھی تھی بھلا کیونکر ہو کے رہتی۔

وہ خیال سکھوں کا کہ مسلمان رئیس ہی اسمٰعیل کو نیچا دکھا دیں گے بالکل خام ثابت ہوا۔ اور اب انہوں نے وحشتناکی سے دارالخلافہ کے مطلع پر غبار جنگ نمودار دیکھا۔ رنجیت سنگھ نے مشورہ کے بعد چار ہزار فوج پیدل اور ایک ہزار سوار چار توپ خانے اور بہت سامان حرب دے کے چتربائی پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ کئے۔ اور افسر فوج خالصہ کو آپ ہدایتیں کر دیں کہ یوں جنگ کرنا اور یہ کرنا غرض جتنی باتیں اسے سمجھانی تھیں سب بیان کر دی گئیں۔ وہ جنرل شراب کے نشہ میں سرمست چتربائی پر حملہ آور ہوا۔

شاہ صاحب نے یہ انتظام کیا تھا کہ بہت سے پرچہ نویس ادھر ادھر مقرر کر دئے تھے جو بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے۔ اور ایک ایک ادنے ادنے خبر لا لا کے دیتے تھے۔

پرچہ نویسوں نے سکھوں کے لشکر کی پوری پوری خبر دے دی ۔ یہ سب سے زیادہ انسب معلوم
ہوا کہ مولانا شہید ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ سکھوں کی فوج کا استقبال کریں ۔ دو توپیں اور
ایک ہزار آدمی لے کے آپ سکھوں کے استقبال کے لئے بڑھے ۔ ہزار میں آٹھ سو پیدل اور
دو سو سوار تھے ۔ چترباں سے جانب شرق ایک وسیع میدان میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا
پہلے دونوں طرف سے توپوں کے فیر ہوتے رہے ۔ بعد ازاں شاہ صاحب نے حملہ کا حکم دیا
پانسو آدمی تو مورچوں پر قائم رہے اور پانسو نے حملہ کر کے دو مورچے اپنے قبضہ میں کر
لئے اور پھر آگے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا ۔ ابھی دست بدست بھی جنگ نہ ہوئی تھی کہ سکھوں
کی خالصہ خونخوار مہیب فوج ایسی دم دبا کے بھاگی جس کی نظیر کہیں بھی نہیں معلوم ہوتی ۔ خبر
نہیں ایک ایک مسلمان انہیں سو سو کے برابر معلوم ہوتا تھا یا تیر تھیں ان کی صورتیں ایسی
دہشت ناک دکھائی دیتی تھیں کہ جہاں انہوں نے حملہ کیا اور مخالفین کے پیر اکھڑ گئے ۔

ان متواتر فتوحات سے اندازہ کرنے والا سمجھ سکتا ہے کہ اگر ذرا بھی مسلمانوں میں
قوت انتظامیہ ہوتی تو ان کی حکومت قطعی دوبارہ پنجاب پر قائم ہو چکی تھی ۔ رنجیت سنگھ جیسے
دس اور ہو جاتے تو کچھ بھی نہ کر سکتے تھے ۔ ایک صرف اسمٰعیل کا دم تھا بھلا وہ کیا کر سکتا
تھا اور اکیلا تمام جہان کے فرائض کی انجام دہی اس سے کیونکر ہو سکتی تھی ۔ آخر کو انسان
تھا خطا و صواب دونوں کا احتمال بلکہ یقین اس کی رائے پر ہو سکتا تھا ہاں واقعات کو
پیش نظر رکھ کے یہ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسا بہت کم اتفاق پڑا ہے جہاں اس کی رائے
نے خطا کھائی ہو ورنہ ایسی صحیح بیٹھتی تھی کہ گویا کسی نے اسے القا کر دی ہے اور بے شک
خدا اسے القا کرتا تھا ۔ اور اس کا دل خصوصیت سے گزرگاہ جلیل اکبر تھا ۔ یہ تعجب سے
دیکھا جائے گا کہ اب سید صاحب اور مولانا شہید کی وہ دھاک بندھی ہوئی تھی کہ ایک
سو ہزار ایک قلعہ فتح کیا اور آس پاس کے کئی ضلع بھی فتح ہوتے چلے گئے ۔ چترباں کی
فتح کیا پائی میسوں فدویت نامے ایران دوگے آ وارد ہوئے ۔ اور سب نے شریعت
محمدی کے روشن راستہ میں چلنے کا عہد واثق کیا ۔

مسلمانوں پر بھی مولانا صاحب نے خود حملہ نہیں کیا نہ آپ کو ان سے پرخاش تھی بلکہ اس

گیارہواں باب

فتح پشاور اور بعض بے اعتدالیاں

پے در پے کی کامیابیوں نے ایک زبردست اثر اضلاع سمہ اور پشاور کے سرداروں پر ڈالا، اور دن بدن اکثر ریاستیں خود بخود مطیع ہوتی گئیں، جب یہ قوت مسلمانوں کو حاصل ہوئی تو مولانا شہیدؒ کے مشورہ سے پشاور کی طرف باگیں پھیریں اور ارادہ کیا کہ پشاور کو زیر فرمان شریعت کرکے لاہور پر ایک زبردست حملہ کی تیاری کر دی جائے۔ مولانا شہیدؒ کے رعب کی مہیب قوت نے کسی کو یارا نہ دیا کہ وہ پشاور کے رستہ میں مزاحم ہوتا۔ آخر آپ بے روک ٹوک حدود پشاور سے گذر کے اس کی چار دیواری کے نیچے پہنچ گئے۔

اس وقت حاکم پشاور دست بستہ حاضر ہوا، اور سید صاحب کے ہاتھ پر بڑے جھگڑے اور قیل وقال کے بعد بیعت کی، اور ٹھنڈے پیٹوں ملک پشاور سید صاحب کے سپرد کر دیا، اور عرض کیا حضور کو اختیار ہے خواہ مجھے اپنی جگہ پر بحال کریں یا اپنا دوسرا خلیفہ مقرر کر دیں۔ اب یہاں اور مملکت کے ایک بہت بڑے ماہر کی ضرورت تھی۔ جب خدا نے اس آسانی سے ملک دے دیا تھا، اس کو اسی آسانی سے کھو دینا ایک پولیٹیشن کی نگاہ میں وقعت پیدا نہیں کرتا۔

جب لشکر اسلام پشاور میں داخل ہوا ہے تو چاروں طرف مبارک باد کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور بظاہر ہر شخص خوش و خرم معلوم ہوتا تھا۔ سلطان محمد خان نے چند ہی روز میں سید صاحبؒ کو کچھ ایسا شیشہ میں اتار لیا کہ انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ملک پشاور پھر اسی کو تفویض کیا جائے۔ مولانا شہیدؒ نے جب سید صاحبؒ کو ایسا آمادہ پایا تو آپ خاموش ہو رہے اور کچھ زبان پر نہ لائے، حالانکہ آپ کی مرضی ہرگز نہ تھی کہ ایسا کیا جائے

مگر اپنے پیر کا ادب مانع تھا کہ ان کی آمادگی کے خلاف رائے زنی کی جائے اور جو تصور بندھ گیا اس کی ضد میں بحث کیا جائے۔ جاہل سے لے کے عالم تک حتیٰ کہ اسی ملک کے اکثر سردار جو سید صاحب کے دل سے معتقد تھے، برابر اپنی ناراضی ظاہر کر رہے تھے بلکہ دو چار نے تو جرأت کر کے سید صاحبؒ کی خدمت میں عرض بھی کر دیا کہ سلطان محمد خان حاکم پشاور اور اس کے بھائیوں نے بارہا عہد شکنی کی ہے اور ہمیشہ بیعت کر کر کے پھر گئے ہیں اس کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔ آپ کبھی اس پر بھروسہ نہ کریں، اور اس ملک کو اس کے سپرد نہ کریں مگر سید صاحب نے اپنی نیک نیتی سے کسی کے مشورہ کو نہ مانا اور آخر اسی کو امیر پشاور کر کے آپ پھر پنجتار میں واپس چلے آئے۔

ہاں انتظام میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو گیا، قاضی اور دہ یکی (عشر) کی تحصیل کرنے والے مقرر کئے گئے اور عام حکم دے دیا گیا کہ شراب افیون چانڈو اور مدک کوئی نہ پینے پائے۔ شراب کی بھٹیاں توڑ دی گئی تھیں، کسبیاں اور خانگیاں ناپید کر دی گئی تھیں اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھتا تھا اس کو تعزیر دی جاتی تھی۔ عموماً پنجاب کے باشندے ترک اور نشئی چیزوں کے استعمال کرنے کے عادی تھے، انہیں یہ قیود سخت قہرناک معلوم ہوئیں مگر ابھی غازیوں کا سکہ جما ہوا تھا کوئی چوں تک نہ کر سکتا تھا۔ چہ جائے کہ علانیہ مخالفت کرتا، ملک پشاور درحقیقت مولانا شہید یا سید صاحب کا رام ہو چکا تھا اور ہر شخص یہی جانتا تھا کہ سلطان محمد ان ہی کی طرف سے حکمرانی کرتا ہے۔ احکام شریعت ناگوار صورت میں پبلک کے آگے پیش کئے جاتے تھے۔ "سید صاحب نے صدہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرع محمدی کے موافق عمل درآمد کریں نگران کی بے اعتدالیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ ان سے نکاح کر لیں اور بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جا رہی ہیں، مجاہدین میں سے کسی شخص نے انہیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جا نکاح پڑھا لیا۔" ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مجاہدین میں سب طرح کے آدمی تھے بُرے بھی اور بھلے بھی بلکہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بُرے زیادہ اور بھلے کم تھے۔ کبھی علانیہ طور پر سید صاحب کے کسی ساتھی کو سزا نہیں

دی گئی۔ حالانکہ اکثر ناجائز افعال ان سے سرزد ہوا کرتے تھے۔ یہ محض ناممکن تھا کہ نوجوان عورت
رانڈ ہو کے عدت کی مدت کے گزر جانے پر بے خاوند بیٹھی رہے اس کا جبراً نکاح کیا جاتا تھا
خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ پشاور میں بڑے بڑے سرداروں میں نکاح ثانی کی رسم نہ تھی،
اور اسے سخت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے یہ مانا کہ نکاح ثانی قرآنی حکم ہے۔ مگر جس
ناگوار طریقہ سے وہ پبلک کے آگے پیش کیا گیا تھا وہ ناقابل برداشت تھا۔

ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی کہ میرا نکاح ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور دے رہے
ہیں نہیں ہوا چاہیئے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالہ مجاہد کرتے تھے اور ان کو
کچھ چارہ نہ تھا۔

ایک ایک چھوٹے چھوٹے ضلع قصبہ گاؤں میں ایک ایک عمال سید صاحب کی طرف
سے مقرر ہوا تھا وہ بے چارا جہانداری کیا خاک کر سکتا اُلٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے
نئے احکام بے چارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا اور وہ اُف نہ کر سکتے تھے۔ کھانا
پینا، بیٹھنا، اٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب ان پر حرام ہو گیا تھا۔ نہ کوئی منتظم تھا نہ کوئی دادرس
تھا۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہو جانا کچھ بات ہی نہ تھا۔ کاش مولانا شہید پشاور کے عامل
ہوتے تو پشاوریوں پر یہ ظلم نہ ہوتا۔ ذرا کسی کی لبیں بڑھی ہوئی دیکھیں، اس کے لب کتروا
دیئے۔ ٹخنوں سے نیچے تہبند دیکھی ٹخنہ اڑوا دیا۔ تمام ملک پشاور پر آفت چھا رہی تھی۔ انتظام
سلطنت ان مسجد کے ملانوں کے ہاتھ میں تھا جن کا جلیس سوائے مسجد کے دلو درس کے
کبھی کچھ نہ رہا تھا اور اب ان کو منتظم امور سلطنت بنا دیا گیا تھا اور پھر غضب یہ تھا کہ اُن
پر کوئی حاکم مقرر نہ تھا کہ پبلک ان کی اپیل اعلےٰ حکام کے آگے پیش کرے۔ ان ہی بے دماغوں
کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے تھے اور تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں
کوئی بات بھی قابل تنسیخ اور ترمیم نہیں ہے۔ کیسا ہی پیچیدہ مقدمہ ہوتا تھا۔ اس کی گھڑی
بھر بھی تحقیق نہ کی جاتی تھی نہ اس پر غور کیا جاتا تھا بس ملاں جی کے سامنے گیا اور اُنہوں نے
چٹ سے فیصلہ دے دیا۔ کون جھک جھک کرے اور کون تحقیق کی تکلیف برداشت کرے۔
سید صاحب کی خدمت میں شکایتوں کی عرضیاں گزر رہی تھیں مگر وہاں کچھ بھی پرسش نہ ہوتی

تھی۔ آپ کو یقین تھا شریعت کے ارکان کی پابندی کرنے سے چونکہ یہ عادی نہیں ہیں اور اب انہیں پابندی کرنی پڑتی ہے، اس لئے یہ ہمارے آدمیوں سے ناراض ہوتے ہیں۔ مولانا شہید خاموشی سے اس بے انتظامی کو دیکھ رہے تھے اور سکتہ میں تھے کہ دیکھئے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

غرض ایک عام ناراضی ان نئے منتظموں کی طرف سے تمام ملک پشاور میں پھیل گئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ باہم ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں۔ تاہم ابھی بہت کچھ رعب کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور رئیسوں پر سکہ جما ہوا تھا وہ ابھی ان خونخوار سازشوں میں جو منتظموں کے خلاف کی جاتی تھیں شریک نہ تھے۔ گو ان کے تیور بھی بدلنے لگے تھے پھر بھی ان میں سنجیدہ سکوت حکمرانی کر رہا تھا۔

بدقسمتی سے ایک نیا گل کھلا گل کیا کھلا گویا غازیوں یا مجاہدوں کی زندگی کے شیرازہ کو اس نے پراگندہ کر دیا۔ باہم یہاں کے کل عمال نے جن کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی ایک فتویٰ مرتب کیا اور اسے پوشیدہ مولوی اسمٰعیل کی خدمت میں بھیج دیا۔ فتویٰ کا مضمون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے یا نہیں۔ مولانا شہید کیا واقف تھے کہ ملک پشاور میں یہ آگ پھیل رہی ہے اور اس وقت اس فتویٰ کی اشاعت سخت غضبناک ہوگی۔ آپ نے سادہ طور پر اس پر اپنی مہر کر دی، اور سید صاحب کی بھی اس پر مہر ہوگئی۔ اور پھر وہ فتوے قاضی شہر پشاور سید مظہر علی صاحب غازی کو بھیج دیا گیا۔ انہوں نے اس فتویٰ کی اشاعت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصہ میں ملک پشاور میں جتنی رانڈیں ہیں سب کے نکاح ہو جانے ضرور ہیں ورنہ اگر کسی گھر میں بے نکاح رانڈ رہ گئی تو اس گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔

اس اعلان کا شائع ہونا تھا تمام ملک مجاہدین کے خلاف شمشیر بدست ہو گیا۔ بہت دھوم دھام سے سازشیں ہونے لگیں اور ایک عام کہرام تمام ملک پشاور میں مچ گیا۔ بڑے بڑے خوانین جو اپنی رانڈ لڑکیوں کا نکاح کرنا سخت عیب خیال کرتے تھے بڑے افروختہ ہوئے اور انہوں نے باہم یہ مشورہ کیا کہ تین دن کی مدت میں ان سب کو تہ تیغ کر

ڈالو۔ مجاہدین نے بھی آخر وقت میں بھا کے سبب سب سامان ہو چکا تھا اُن کے تیور پہچانے اور اب وہ خائف ہو کر سید صاحب کو لکھنے لگے کہ یہاں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ سید صاحب کچھ ایسے بے پرواہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا نہ مخبروں کی خبروں پر کچھ توجہ کی جو دم بدم یہ پرچہ گزار رہے تھے کہ آپ جلد فوج لے کے اس طرف روانہ ہوں ورنہ خاتمہ ہی ہوا چاہتا ہے۔

سید صاحب نے مطلق توجہ نہیں کی آخر نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم اعلٰے مولوی سید مظہر علی صاحب جو اس آتش فشاں فتوے کے بانی مبانی اور اشاعت دہندہ تھے اور جنہیں سید صاحب نے بڑے اعتبار اور بھروسے سے مقرر کیا تھا۔ سلطان محمد حاکم پشاور کے دربار میں معہ ساتھیوں کے بُلائے گئے اور فوراً اُن کا سر قلم کیا گیا اور عام حکم دے دیا گیا کہ ایک ایک مجاہد قتل کیا جائے۔ ساری رات میں کل مجاہدوں کی جو بطور منتظم مختلف حصص میں متعین تھے گردنیں اُڑا دی گئیں اور نہایت بے کسی کی حالت میں ان میں سے اکثر سڑکوں پر بکروں کی طرح ٹالے ذبح کئے گئے۔

یہ خونی خبر وحشت ناک آگ کی طرح پنجتار میں سید صاحبؒ کے گوش حقیقت نیوش میں بھی پہنچی۔ آپ نے یہ خبر گوش گزار فرما کے خون کے آنسو روئے اور ایسا صدمہ ہوا کہ کل ارادے پست ہو گئے۔ اور ایسی مایوسی چھائی کہ انتقام کی بھی ہمت نہ رہی۔ پیارے شہیدؒ کا دل سب سے زیادہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ سخت حیرانی کی بھری ہوئی نظروں سے چاروں طرف تکنے لگے۔ اب کیا تھا کمر ٹوٹ چکی تھی اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی ظاہر تھا کہ کئی برس خون پسینہ ایک کرکے پنجاب کے بڑے حصہ پر سکہ بٹھایا تھا اور وہ آناً فاناً میں یوں خیرباد ہو گیا۔ کثیر التعداد مجاہدین کا مارا جانا بھی قہرناک تھا اور پشاور کا ملک چھن جانا تو سب سے ہی زیادہ خونی اثر پیدا کرنے والا تھا۔ ان تمام ناگفتہ بہ غمناک صورتوں نے مولانا کو بٹھا دیا اور پھر اس شیر میں بھی یہ اُولوالعزمی نہ رہی کہ وہ اپنے دوستوں کا عوض لیتا۔ اب اس نے اپنی شکستہ دلی اور سخت مایوسی کی حالت میں اپنے کو بالکلیہ اپنے محترم پیر کے حوالہ کر دیا کہ جو کچھ یہ چاہے جو کچھ یہ کرے اس کا ساتھ دو خود کوئی بات سوچنا اور مشورہ دینے کا کام نہیں ہے

سید صاحب مولانا شہید سے بھی زیادہ شکستہ خاطر تھے۔ آپ نے یہی بہتر جانا کہ اس ملک پنجاب کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہر چند لوگوں نے سمجھایا مگر آپ نے نہ مانا اور کہا جہاں میرا خدا لے جائیگا میں چلا جاؤں گا۔

جب آپ پنجاب سے ہمیشہ کے لئے ہجرت کی تیاری کر رہے تھے تو روانہ ہونے سے دو دن پہلے جمعہ کے دن اپنے کل ساتھیوں کو بآواز بلند اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی اذن دے دیا جو شخص اپنے وطن جانا چاہتا ہے بخوشی جائے اس میں میں ناراض نہیں ہوں میرے ساتھ وہی شخص رہ سکتا ہے جسے تین تین وقت کے فاقے برداشت کرنے اور برہنہ پا جنگلوں میں چلنا گوارا ہو بعض یہ سُن کے تو رخصت لے کے چلے آئے اور اکثروں نے یک زبان ہو کے یہ کہا ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

ملک سمہ والوں نے ناقابل بیان مظالم مجاہدین پر توڑے تھے اور سخت کمینہ پن سے اُنہیں فریب دے دے کے ضائع کیا تھا۔ ایک شخص نے جب قافلہ مجاہدین ہجرت کر رہا تھا مولانا شہیدؒ سے کہا سمہ والوں سے تو اپنے ساتھیوں کا انتقام لو اُنہوں نے سب سے زیادہ عہد شکنی اور ظلم توڑے ہیں آپ نے ٹھنڈا سانس بھر کے فرمایا خدا منتقم حقیقی کافی ہے۔ یہ دعا یہ جملہ بارگاہ ایزدی میں قبول ہو گیا۔ آپ کو ملک سمہ چھوڑے ہوئے دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ خالصہ فوج سکھاں سمہ پر آ پڑھی اور دیسیوں پر ایسی خونریزی کی جس کی نظیر اس ملک کی تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی۔ اہل سمہ کے گھر جلا دیئے اور سکھوں کی جس تلوار نے ماؤں کو قتل کیا ان ہی تلواروں نے بچے بھی قتل کیئے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اچھال اچھال کے تلواروں سے چورنگ اُڑا دیئے گئے۔ گھر کھیت سب جلا کے خاکستر کر دیئے گئے، جب اس قدر خونریزی ہوئی تو سمہ کے باشندے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا خدا کے لئے چلئے اور ہمارے سروں پر ہاتھ رکھئے۔ اب ہم آپ سے بغاوت اور عہد شکنی نہ کریں گے۔ مولانا شہید بھی اس وقت موجود تھے۔ آپ نے سید صاحب کی اجازت سے جواب دیا، خدا ہی اپنی حکمت کو خوب جانتا ہے۔

تمہاری سزا یہی ہے تم نے ہم سے دغا کی اور بے گناہ مسلمانوں کا خون کیا۔ سکھوں نے اس کی تادیب تمہیں پوری دی۔ اور اُسی کے تم لائق تھے اب تم جاؤ اور اپنے کام سے لگو۔ یہ سن کے وہ چلے گئے اور سید صاحب راج دواری (ملک کاغان) میں جا کے مقیم ہوئے۔ آگے جانے کے راستے برف باری سے بند ہوگئے تھے۔ مجبوراً سید صاحب کو وہیں قیام کرنا پڑا کچھ کچے پکے مکانات بھی تیار ہوگئے، اور مہاجر بآرام اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔

ناظر جب مولانا شہید کی بے مثال امنگ اور اولوالعزمی کو دیکھے گا اور بعد ازاں اس کا نتیجہ ملاحظہ کرے گا تو اُسے پیارے شہید کی زبردست طبیعت کا نقشہ بخوبی معلوم ہو جائے گا اور وہ یہ سمجھ لے گا کہ دنیا میں جتنے حکمران شمشیرزن یا مصلح ہوئے ہیں وہ سب اسی طبیعت اور بے نظیر لیاقت کے ہوئے ہیں جس کی مایوسی اور ناکامی کامیابی کے مساوی تھی اور جس نے کسی کام میں فیل ہونے پر افسوس نہیں کیا اور ہمیشہ اپنا کامل بھروسہ خداوند حقیقی پر رکھا، وہ پیارا شہید تھا جس نے ہندوستان میں عبدالوہاب کی طرح شریعت محمدی کا ٹھنڈا خوشگوار شربت ہندوستانی مسلمانوں کو پلایا" اور ان کی قابل تنفر عادتوں اور رسوم کو ایسا مٹا دیا کہ آئندہ پھر کبھی اُن کی اولاد اس طرف متوجہ نہ ہوگی۔ ایسا شیر ایسا دلیر ایسا مصلح ایسا اپنی متواتر کوششوں میں کامیاب اب اس خطہ سے ہجرت کر رہا ہے کہ جس میں اس نے توحید کا بیج بویا تھا اور جس نے سکھوں کے قابل رحم مظالم سے نجات دلوانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور جس کا بہت سا حصہ سخت خونریزی کے بعد صاف کر دیا تھا اور اب اپنے بوڑھے پیر کی ماتحتی اور اطاعت میں سرنگوں آنکھیں نیچی کئے ہوئے خاموشانہ حالت میں چلا جاتا ہے اور کچھ نہیں کہتا مگر اس کی باطنی نظریں پنجاب کے نامکمل خطہ کی طرف پڑ رہی ہیں کہ جسے وہ ادھورا چھوڑ کے جاتا ہے اور جتنی کوشش کی تھی اس کا پھل اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا۔

ابھی چند روز کا عرصہ ہوا تھا کہ تمام پنجاب میں بجز چند حصوں کے دین محمدی کی اشاعت ہوگئی تھی اور سب نے باتفاق عہد کر لیا تھا کہ آئندہ سے قرآن وحدیث پر عمل کیا جائے گا اور ہونے بھی لگا تھا۔ مگر ان بے اعتدالیوں کی کسے خبر تھی جو عمال اور سید صاحب کے مقرر

کئے ہوئے قاضی پشاوریوں پر توڑیں گے اور مولانا شہید کی ساری کوشش یوں بیکار جائیگی گو اس کوشش کا روحانی اثر پنجابیوں پر تو بہت کچھ رہا اور آئندہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا نکلتا آئے گا مگر ملکی اثر کچھ نہ رہا سوا اس کے کہ ایک ویران ملک میں ان کا کچھ بقیہ نظر آتا ہے۔

روحانی اثر جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ابھی تک پنجاب کے کسی نہ کسی ضلع میں دکھائی دیتا ہے جتنے لوگ مسلمان ہیں بدعت و شرک، گور پرستی، تعزیہ پرستی نہیں کرتے۔ اور اس اکیلے خدا کی پرستش کرتے ہیں جس کا شاہد قرآن ہے اور نہیں پنجاب میں تو کوسوں بھی نظر نہ آتا تھا کہ ایک شخص بھی اللہ کا نام لیتا ہوا سنائی دیا ہو۔ سوائے غوث اور قطب کے ان کا کوئی خدا ہی نہ تھا۔

حقیقت میں یہ صحیح ہے کہ ناتجربہ کاروں کی ہمراہی ایک مدبر اعلیٰ کی لائقہ تدابیر کو بدنما لباس پہنا دیتی ہے جو کچھ پیارے شہید نے کیا اس کے کاموں کا بہت سا حصہ ہر عیب و خطا سے پاک ہے ہاں بعض بعض امور ملکی میں اس سے سخت غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن پھر بھی ان غلطیوں کا اثر اسی کی ذات تک رہا، دوسرے اس کے ساتھیوں پر نہ پڑا۔ مگر حیف صد حیف اس کے ہمراہیوں نے تو لذائذ نفسانیہ اور اپنی خر دماغی سے لٹیا ہی ڈبو دی اور ایسا ستیاناس کر دیا کہ اسے ملک پنجاب چھوڑتے ہی بن پڑا۔

ایک[۱] یورپین مورخ اس افسوس ناک واقعہ کی نسبت یہ تحریر کرتا ہے "سید احمد صاحب نے یہ ضرورت سمجھی کہ وہ اپنے ہندوستانی پیرواں کو اپنے فضل و کرم سے نہال کر دیں جن کا ان پر کامل بھروسہ تھا۔ پہلے آپ نے اپنے کو سرحدی لوگوں سے (دہ یکی) عشر لینے میں محدود کیا اس امر کو انہوں نے خفیف انکراہ سے برداشت کیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم سے دہ یکی نیک کام میں خرچ کرنے کے لئے لی جاتی ہے۔ مگر جب سید صاحب کے پیروان دہ یکی سے گزر کے زیادہ لینے لگے تو سرحدی لوگ سخت برہم ہوتے اور جس کا نتیجہ سید صاحبؒ کے لئے بہتر نہیں ہوا۔ سید صاحب کا مزاج صلح کل حاکمانہ امتزاجی

[۱] دی انڈین مسلمان مصنفہ ہنٹر صاحب صفحہ ۱۸-۱۷۔

خصر اپنے میں بہت کم رکھتا تھا بلکہ اس میں سخت تعصب اور فتنہ انگیزی استغفراللہ آمیز ہو رہی تھی جس نے اس حیرت انگیز اثر کو جو سرحدی لوگوں پر ہوا تھا آنا فانا میں ملیامیٹ کر دیا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ میری قوت زوال پذیر ہو رہی ہے۔ آپ نے اور بھی زیادہ سرحدی لوگوں پر سختی کی اور ان کے ساتھ سخت ناانسانیت کا برتاؤ کیا جس نے سرحدیوں کی اس بے نظیر محبت کی دوشیزہ نازک لڑکی کو مجروح کیا، جس نے ان پر غضب کا عجیب افسوں پھونکا تھا، آپ نے پہاڑی آدمیوں کی شادی بیاہ کی رسوم میں دست اندازی کی جو اپنی لڑکیاں بڑے بڑے امیروں کو پیسے کے لالچ میں بیاہ دیتے تھے یا یہ کہو کر ان کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے تھے، اور چونکہ آپ کے ساتھی غریب الوطن تھے، اور اب انہیں جوروں کی بھی خواہش تھی تو آپ نے ایک فرمان جاری کیا کہ جتنی کواری لڑکیاں ہیں وہ سب ہمارے لیفٹننٹ کی خدمت میں مجاہدین کے لئے حاضر کی جائیں گی، اگر ان کی شادی بارہ دن میں نہ کر دی گئی، قوم کی قوم اس اعلان سے بھڑک اٹھی اور اس نے ہندوستانی آدمیوں کو قتل کر ڈالا، سید صاحب بڑی دقت سے اپنی جان بچا کے بھاگے۔" یہ بیان ایک یورپین مورخ کا ہے۔ میں ان الفاظ کی تائید نہیں کرتا جو اس نے سید صاحب کی نسبت لکھے ہیں نہ مجھے اس کا پتہ لگا ہے، آیا یہ اعلان سید صاحب نے جاری کیا تھا اس کی بابت جو کچھ میں اپنے گزشتہ صفحوں میں لکھ آیا ہوں درحقیقت وہی بات ٹھیک ہے اور اس میں ذرا بھی تفاوت نہیں ہے۔ گو بعض ہمارے ہمعصر سوانح نویسوں نے اس کا ذرا بھی ذکر نہیں کیا ہے، اور سوئے ادبی کے خیال نے انہیں دیانت داری سے باز رکھا مگر ہم نے اپنی ایمان داری سے جو واقعے ہمیں پہنچے انہیں بے کم و کاست یہاں درج کر دیا۔

بار بار زیادہ افسوس اس بات کا آتا ہے کہ وہی مثل یہاں صادق آتی ہے۔ "کرے ڈاڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔" مولانا شہید نے تو اس محنت اور جانکاہی سے ملک پنجاب کے اتنے بڑے حصہ کو مسلمانوں کے لئے صاف کر دیا تھا اور ناتجربہ کاروں نے چند بے اعتدالیوں سے اپنی جانیں بھی کھوئیں اور مفتوحہ ملک چھنوا

دیا۔ ایسا کہ تسمہ تک لگا ہوا باقی نہ چھوڑا۔ وہ عظیم الشان بہادر جس نے رنجیت سنگھ جیسے شیر پنجاب کے خونخوار پنجوں سے اتنا بڑا ملک چھین لیا تھا۔ خردماغ ملاؤں نے اس آسانی سے اپنی جانوں کے ساتھ اُسے بھی کھو دیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

بارہواں باب

شہادت

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دنیا کی ناپائیداری کا المناک اور دل بجھا دینے والا خیال عجیب و غریب قوت سے تمام جہان میں پھیل رہا ہے اور ہر شخص خواہ فاضل ہو یا جاہل خود بخود اس عظیم الشان تغیر و تبدل سے جو روزمرہ اس کی آنکھوں کے آگے ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا استنباط کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے جو کچھ میں نے کیا یا آئندہ جو کچھ کروں گا چند روز میں اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا، اور پھر صفحۂ ہستی پر شمہ برابر بھی نہیں رہنے کا وہ خیال کرتا ہے ہزاروں شہنشاہ ہوگئے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کہاں تھے اور کہاں چلے گئے ؎ آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔

یہ پست اور فانی خیالات اس کے دل کو بجھا دیتے ہیں اور پھر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے کسی گوشہ میں عزلت گزینی اختیار کرتا ہے اور اس تبدل حالت میں اپنی زندگی گزار دیتا ہے مگر حقیقت میں یہ اس کی بڑی بھاری غلطی ہے۔ دنیا ناپائیدار ہے مگر انسان ایک دائمی چیز کا نام ہے یہ مانا کہ ذات باری کے آگے اس کو مداومت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اس تمام کائنات سے زیادہ دیر قائم رہنے والا ہے مگر یہ ان پاک برتر نفوس کا ذکر ہے جنہوں نے اپنی لعل سی جانیں اصلاح بنی نوع اور بہبودئ خلائق کے لئے قربان کردیں اور اپنا دھن من تن قوم پر قربان کر دیا۔ گو وہ ایک مقررہ مدت کے بعد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں مگر درحقیقت وہ ٹلتے نہیں ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا ہے اور ان کی سچی زندگی میں جان پڑ جاتی ہے یہ کیونکر سمجھ میں آسکتا ہے کہ آفتاب اور سیارے تو لاکھوں برس سے قائم ہیں اور ابھی ان کی زندگی کی کوئی حد

نہیں مگر انسان جوان سے اشرف اور اعلیٰ ہے چند روز میں فنا ہو جائے اور پھر اس کا نام و نشان تک مٹ جائے۔ یہ خیال یا عقیدہ جس قدر رکیک اور خام ہے اسی قدر انسان کے لئے ایسا خیال کرنا خیرہ چشمی اور سوء ادبی ہے۔

مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب گو ہماری ظاہری آنکھوں کے آگے سے غائب ہو گئے مگر وہ اب بھی ہم میں موجود ہیں۔ ہم بعض وقت اپنے آپے کو بھول جاتے ہیں مگر ان کا تصور نہیں جاتا اور ہر دم اپنے سچے محسن کی یادگار رہتی ہے۔ جو نمایاں کام مولانا شہید کر گئے وہ معمولی نظروں سے دیکھنے کے قابل نہیں ہیں بلکہ گہری اور عمیق تر نگاہیں جب تک ان معاملات میں نہ بیٹھ جائیں گی، کبھی ان کا اصلی رتبہ اور سچا ارتفاع نہیں کھلے گا۔

جب پشاور میں ملاؤں کی بعض بے اعتدالیوں نے غضب ڈھایا ہے اور سید صاحبؒ کو پنجاب چھوڑتے بن پڑی ہے۔ اس وقت پیارے شہید کے دل کی جو کیفیت تھی وہ وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس پر ایک ہزارواں حصہ بھی ایسی مایوسانہ حالت کا گزر چکا ہے کس شوکت سے جس حصہ پنجاب کو سکھوں کے ہاتھ سے چھینا تھا وہ چند بد دماغوں کے صدقہ میں آناً فاناً میں ہاتھ سے نکل گیا وہ امیدیں جو پشاور فتح ہونے کے بعد طبیعت میں نئی نئی تاب ولولوں کا جامہ پہن کر اٹھ رہی تھیں ایک خونریز دورے سے سب کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسی قاتل اور فنا کر دینے والی حالت میں کسی معمولی انسان کا زہرہ ہے کہ وہ ایک سکنڈ بھی زندہ رہ سکے اور اس کا پتہ پانی ہو کے نہ بہہ جائے۔

مگر یہ اسمٰعیل ہی کا دم تھا کہ اس نے بمقتضائے فطرت بشری حسرت بھری نگاہوں سے تو اس واقعہ جانکاہ کو دیکھا، اور ایک سرد آہ کھینچی مگر وہ صبر سے خاموش ہو رہا اور اپنے پیر کی متابعت میں اسی طرح سرگرم پرجوش بن گیا۔ گو فطرۃ کے ہنروں کا کامل نمونہ تھا مگر زمانہ نے اُسے کسی لمحہ اپنی آنکھوں پر بٹھانے سے انکار کیا اور آخر اب وہ زمانہ آیا کہ وہی زمانہ جس نے انکار کیا تھا اب آنکھوں پر بٹھاتا ہے، اور آرزو کرتا ہے کہ مولوی اسمٰعیل کے نام سے میں ہمیشہ کے لئے مستفیض کیا جاؤں۔

پشاور کا ہاتھ سے نکلنا تھا اور سید صاحب کے گروہ کا خاتمہ ہو جانا تھا۔ جب آپ بالاکوٹ

تشریف لے جا رہے تھے ۔ رنجیت سنگھ والئے لاہور نے یہ موقع غنیمت جان کے شیر سنگھ کی سرکردگی میں بیس ہزار فوج سکھوں کی روانہ کی کہ پہاڑوں ہی میں ان کا فیصلہ کر دے اور ایک خونریز میدان کے بعد مجاہدین کی قسمتوں اور کوششوں کو انجام پر پہنچا دے ۔

آپ بالاکوٹ پہنچے تھے کہ پیچھے سے سکھوں کا لشکر بھی آدھمکا ۔ جو راستہ کہ سید صاحب نے اختیار کیا تھا وہ حد سے زیادہ تنگ تھا ایک توپ بھی نہیں جا سکتی تھی دو آدمی برابر نہیں نکل سکتے تھے ۔ جب سکھوں کے حملہ کی خبر ہوئی تو مولانا شہیدؒ نے پہاڑوں پر چڑھ کے دو تین مورچے بنائے اور ہر مورچہ پر قلیل تعداد آدمیوں کی مقرر کر دی ۔ آپ نے خود ایک مسجد کے غرب رویہ مکان میں اپنا مورچہ بنا لیا تھا ۔ کل تعداد مسلمانوں کی نو سو سے زیادہ نہ تھی اور پھر لطف یہ کہ سوائے توڑے دار بندوقوں کے توپ ایک بھی نہ تھی جو توپیں کہ آپ پنجتارے لائے تھے وہ رستہ کی تنگی کی وجہ سے امرائے دہ کو دیتے آئے تھے یا اُن کے پاس امانتاً رکھ دی تھیں ۔ اب صرف تلواریں اور بندوقیں رہ گئی تھیں پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ بیس ہزار فوج سے یہ آٹھ سو نو سو آدمی مقابلہ کر سکتے اور مخالفین کی آتش فشاں توپوں کا جواب دیتے ۔

مولانا شہیدؒ سمجھ گئے تھے کہ بس یہ آخری میدان ہے جہاں تک ہو سکے جان توڑ کر لڑیں اور مسلمانوں کے لئے اپنی جان قربان کر دیں ۔ پہاڑی بدذات قومیں روپیہ کے لالچ سے سلمان ہو کے سکھوں سے گٹھ گئی تھیں ، اور انہوں نے رستہ ہی دینے پر قناعت نہ کی بلکہ سید صاحبؒ کے ضعف کی کیفیت بھی ساری بیان کر دی ، اب وہ وقت آلگا کہ جانباز بہادر اپنی اصلی شجاعت کا جوہر دکھا کے سکھوں کے مقابلہ میں جوانمردی سے شہید ہو ۔

(ہندوستان بطور ص ۱۲۰)

تھوڑی دور کے فاصلہ پر سکھوں نے اپنی مورچہ بندی کی ، اور اب گولہ اندازی شروع ہوئی ۔ گولوں کا جواب گولیاں کسی حالت میں ممکن نہیں ہو سکتا ۔ کئی گھنٹے تک تو مولانا شہیدؒ نے بغیر نتیجہ کوشش کی مگر جب آپ نے بندوقوں کے فیر کرنے فضول دیکھے تو مورچہ پر دو تین آدمی چھوڑ کر نشیب میں ہو کے سکھوں کے مورچہ کی پشت پر جا پہنچے ، اور جوں ہی للکار کے اللہ اکبر کا نعرہ مارا ، سکھ پریشان ہو کے اور مورچہ چھوڑ کے بھاگے ۔ چار توپیں مولانا شہیدؒ

افسوس ہے ایسا خونخوار بہادر ایسا لاثانی شجاع ایسا عظیم الشان مصلح اس مایوسی اور بے بسی کی حالت میں شہید ہوا مگر یہ وہ شہادت تھی جس کے خونی نقوش زمانہ کی پیشانی پر اب تک چمک دے رہے ہیں اور جب تک زمانہ قدیم ہے یہ سرخ رنگ نقوش کبھی مٹ نہیں سکتے، بے اختیار زبان سے یہ ماتمی اشعار نکلتے ہیں۔

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو	اے از ترادش دل اشکبار شو
اے خون بدیدہ درد گزار جگر فرست	اے دم بسینہ دود چراغ مزار شو
اے لب بنوحہ نالہ جانکاہ سازدہ	اے سر بغصہ خاک سر رہگزار شو
اے خاک چرخ گر نہ توان زجا درآئے	اے چرخ خاک گر نہ تواں شد غبار شو
اے نوبہار چوں تن بسمل بخون بغلط	اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے ماہتاب روی بسلی کبود کن	اے آفتاب داغ دل روزگار شو
اے فتنہ باد صبح وزیدا این قدر مخسپ	اے رستخیز وقت رسید آشکار شو
آہ این چہ سیل بود کہ مار از سر گزشتہ	تنہا نہ سر مگو کہ زدیوار و در گزشت

سب سے زیادہ افسوس کی یہ بات ہے کہ سید صاحب بھی اسی میدان کارزار میں شہید ہوئے گو آپ کے بعض متعلقین پر خدا کی شان سے آج تک نہیں آئی پھر بھی وہ وہ فضلا اس میدان میں کام آئے کہ ہندوستان کی اپنے علم وفضل کے لحاظ سے جان تھے۔ ہرچند مولانا شہیدؒ نے چاہا کہ سید صاحبؒ کو بچالوں اور اپنی جان ان پر قربان کردوں مگر لکن نہ ہوا، باہمی جدائی کی گھڑی آن لگی تھی، اور اسے کوئی ٹالنے والا نہ تھا۔ یہ جانکاہ واقعہ بماہ مئی ۱۸۳۱ء کو وقوع میں آیا۔ (خاص بالاکوٹ میں)۔

جو لوگ بچے تھے دریائے انڈس سے عبور کرکے ستیانا میں جاگزین ہوتے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے وہاں اپنی ایک بستی بسالی اور پہاڑوں کو بھی اپنا مرید بنالیا۔ جو اب تک سوانت نیروں میں دیکھے جاتے ہیں۔

تیرھواں باب

عبدالوہاب علیہ (نجد میں) اور مولانا شہید دہلوی بعض یورپین کی رائے!

ابن عبدالوہاب جس نے دوبارہ مکہ اور مدینہ کو اسلامی شریعت کی پابندی کے لحاظ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا سا بنانا چاہا۔ اور آخر میں اپنی تحریک کوششوں میں کامیاب ہو کے اسلامی احکام کا پابند ہونے کے لئے ہر شخص کی ابتدا میں مجبور کیا گیا تھا۔ ملکی معاملات میں خواہ وہ کیسا ہی ضعیف العقل ہو اور اس نے کیسی ہی خطائیں کی ہوں مگر دین کے معاملہ میں اس کی زندگی سچے مسلمان کی زندگی کے ہم پلہ تھی۔ خلاف شریعت امور سے اُسے سخت چڑ تھی اور وہ چاہتا تھا کہ نبی اکرم نے جن شرعی امور کی پابندی کی مسلمین کو ہدایت کی تھی ان کا پابند مسلمانوں کو بنا دوں۔ اب یہ اس کی غلطی تھی کہ اس نے اپنے زمانہ کی ملکی آب و ہوا اور طبائع کے میلان کو نہیں دیکھا اور یکایک ان سے چاہا کہ ناگوار طریقہ میں شریعت کے احکام کی پابندی کریں۔ اگر وہ نبی اکرم کی مصلحت یا ربانی حکمت کو غور کرتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ قرآن کا پارہ پارہ ہو کے ۲۳ برس کے عرصہ میں نازل ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ انہیں ربانی احکام قبول کرنے اور ان سے دلچسپی لینے کا عادی بنا دیا گیا اور جوں جوں طبیعت میں شوق پیدا ہو گیا اسی کے مطابق آیتیں نازل ہوتی گئیں۔

جو کچھ ابن عبدالوہاب نے مذہب اسلام کو چمکانا چاہا اور لوگوں کو موحد بنانا چاہا اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ وہ نجد بلکہ تمام عرب کی تاریخ میں ایک مشہور شخص ہے۔ اکثر نافہم مسلمان ہو کے ان پاک نفوس کو جنہوں نے قرآن و حدیث کو صحیح ٹھہرایا ہے وہابی بلکہ وہ مقدس چیزوں پر عمل کرتے ہیں، اور اسی کی اپنے بھائیوں کو بھی دعوت دیتے

ہیں وہابی کہتے ہیں اس کہنے سے وہ وہابی نہیں بن سکتے مگر اس کہنے سے اس تلخ تر دشمنی اور حسد کا اندازہ ہوسکتا ہے جو اکثر نافہم پاک مسلمانوں سے رکھتے ہیں وہ اپنی نسبت اپنے پاک نبی سے کرتے ہیں اور اسی میں انہیں فخر ہے اور یہی اُن کا مایہ بساط ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ شاہ اسمٰعیل صاحب اور ابن عبدالوہاب کے مرتبہ اور اصلاح مومنین کی بے نظیر کوششوں میں کیا امتیاز قائم ہوسکتا ہے اور باہم دونوں میں کیا مناسبت ہے۔ چونکہ یہ ایک دلچسپ اور نہایت لطیف مضمون ہے، اس لئے میں ابن عبدالوہاب اور اس کے جانشینوں کی مختصر تاریخ بیان کرتا ہوں جس کی مناسبت مولانا شہیدؒ کے حالات زندگی سے بہت ہے۔

ابن عبدالوہاب ۱۶۹۱ء میں بمقام عین (نجد میں) پیدا ہوا۔ امام حنبل کے مذہبی طریقہ پر نہایت عمدگی سے اس کے باپ نے اسے تعلیم دلوائی، جب نجد میں فارغ التحصیل ہوگیا تو مکہ مدینہ اور بصرہ میں جا کے اپنے علوم دینی کی تکمیل کرنی چاہی۔ جب اس نے اپنی آرزو کے موافق ان شہروں میں بھی تحصیل علوم کرلی تو بغداد کے عظیم الشان کتب خانہ کی مقناطیسی کشش نے ابن عبدالوہاب کو اپنی طرف کھینچا۔ جب ابن عبدالوہاب نے بغداد میں کل حدیثوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور اسلام کی بابت بہت سی قلمی کتابیں ملاحظہ کیں تو اور بھی اس کی سرگرم روح میں ایک تازہ جوشیلی رُوح پھُکی۔

اس کے بعد اس فاضل نے اپنے باپ کے ساتھ حج بیت اللہ کیا اور مدینہ منورہ میں حاضر ہو کے شیخ عبداللہ بن ابراہیم کے ہاتھ پر بیعت کی، یہ ایک متبحر عالم تھا اس نے شریعت اسلامی کی اور بھی ابن عبدالوہابؒ کو تعلیم دی۔ کچھ دن تک اپنے باپ کے ساتھ حریملہ میں رہا اور جب اس کے باپ کی وفات ہوگئی وہ اپنے وطن عین میں چلا آیا جہاں مذہبی پیشوا بنایا گیا۔ اپنے مختلف سفروں میں ابن عبدالوہابؒ نے گو بڑے بڑے فضلاء دیکھے اور اسلامی سوسائیٹیوں اور درسگاہوں کی بھی خوب دھوم دھام دیکھی مگر شریعت محمدی کا پابند یا عامل بالحدیث بہت ہی کم نظر پڑا۔ اس نے مقبروں کو مزین دیکھا، اس نے ریشم اور چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال عام دیکھا۔ منشی چیزوں کا رواج بھی ہر

مسلمانی سلطنت میں ملاحظہ کیا۔ فضول شگونوں اور وہموں کا معتقد تابع لوگوں کو پایا۔ گور پرستی کی لے بڑھی ہوئی دیکھی، اور عیاشی کو نئی صورتوں میں جلوہ افزا دیکھا۔ اس نے قرآن شریف اور احادیث نبویہ کو نہایت توجہ سے سمجھ سمجھ کے پڑھا تھا۔ ربانی مقاصد اس کے بخوبی دلنشین ہوگئے تھے، اور وہ اسلام اور اس کے واجب الاعتصام بانی کا مفہوم سمجھ گیا تھا یہ قرآنی مقصد اعلیٰ پر عبور اور پھر اسلامی دنیا میں یہ خلاف شریعت باتیں دیکھنے سے ایک نیا رنگ اصلاح کا اس کی طبیعت میں پیدا ہوا۔ اس کی عین خواہش تھی کہ ان مکروہ مکروہ اور ناپاک باتوں کو اور ناقابل بیان رسوم کو جو عجمیوں سے پیوند ہونے کے بعد مسلمانوں میں پڑگئی تھیں سب کو علیحدہ کر دوں اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی جدا کرکے انہیں پاک صاف اور نتھرا ہوا مسلمان بنا دوں، یہ خیال غیر معمولی جوش کی صورت میں ابن عبدالوہاب کے دل میں پیدا ہوا، اور نیز اس کی تکمیل کی امنگ اُٹھی۔

ابن عبدالوہابؒ نے سوائے قرآن وحدیث یا صحابہ کے قیمتی اقوال یا حدیثوں کے دوسرے ائمہ کی باتوں پر نہ کبھی عمل کیا نہ اپنے معتقدوں کو عمل کرنے کی ہدایت کی وہ کہا کرتا تھا جن پاک اور مبارک انفاس نے اپنی آنکھوں سے جمال احمدی دیکھا ہے، اور آپ کی زبان فیض ترجمان سے مشرف ہو چکے ہیں ان کی باتوں کو قبول کرنا اور ماننا چاہیئے نہ کہ ان لوگوں کی باتوں اور استنباطی مسائل کو تسلیم کریں، جو عقل کے تکے لڑا گئے، اور جنہیں نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی نہ حضور کی زبان مبارک سے انہوں نے کچھ سنا۔ اسلام کی بنا صرف قرآن و احادیث پر ہے۔ اور یہی کافی ہے جب قرآن میں موجود ہے کہ تمہارا دین کامل ہو چکا پھر دوسرے کسی نفس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دین اسلام میں کوئی مین میخ پیدا کرے اور پھر لوگ اس کے استنباطی مسائل میں اس کے گروہ کے کہلائیں۔ ابن عبدالوہاب کی اس بے نظیر اور سچی سچی سیدھی سیدھی تعلیم نے عظیم الشان اثر مسلمانوں پر کیا، اور وہ غول کے غول اس کے پاس آنے لگے مگر اس کی یہ کامیابی نامساعد ثابت ہوئی۔ رئیس شہر سخت برہم ہُوا، اور آخر ابن عبدالوہاب کو شہر چھوڑنا ہی بن پڑا۔ وہاں سے بھاگ کے اس نے صریحہ میں ایک رئیس اعظم محمد بن سعد کے پاس

پناہ لی۔ اس سردار نے جس کا قوی تر اثر ہزاروں آدمیوں پر پھیلا ہوا تھا۔ ابن عبدالوہاب کے اسلامی نتھرے ہوئے خیالات کو چکایا، اور اپنی تلوار سے بھی مدد کرنے کو مستعد ہوا۔ اس نے محمد بن عبدالوہاب کی لڑکی سے شادی کر لی، خدا کی شان سے اُس کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالعزیز رکھا گیا۔ یہ لڑکا فطرت نے عجیب دل و دماغ کا پیدا کیا تھا، وہ اپنے باپ، دادا، نانا، پرنانا سے بھی خالص محمدی دین پھیلانے میں پرجوش نکلا۔ اپنے باپ کے گزر جانے کے بعد (۱۰۶۵ء) اس نے اپنی فتوحات کی لین ڈوری جزیرہ نمائے عرب کے بہت دُور کے حصہ تک بڑھا دی۔

عبدالعزیز صرف ایک لڑاکو اور جانباز بہادر مرد میدان جری ہی نہ تھا بلکہ ایک سچا مسلمان تھا، اور اس کو حقیقی عامل بالحدیث کہہ سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے جتنے احکام ہیں سب پر استواری اور زندہ دلی سے اس کا اور اس کے دوستوں کا عمل تھا اور وہ خوش تھا کہ میری وجہ سے پھر کئی صدی کے بعد دوبارہ سچا اسلام عرب میں پھیلتا جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایک خراسانی کی چھری نے عین سجدہ کی حالت میں قبل از وقت اس کا فیصلہ کر دیا۔ یہ جانکاہ اور المناک واقعہ ۱۸۰۳ء میں وقوع ہوا۔ عبدالعزیز کے بعد اس کا بڑا بیٹا سعد اپنے باپ سے بھی زیادہ پرجوش اور مرد میدان نکلا۔ اس نے اور بھی اپنی فتوحات ملکی کو وسعت دی، اور ترکی سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ یہ ایک نہایت ہی پاکیزہ صورت اور جمیل شکل کا نوجوان تھا۔ جیسا حسن ظاہری سے آراستہ تھا۔ حسن باطنی سے بھی قدرت نے اُسے ویسا ہی مزین کیا تھا۔ علم و فضل میں جیسا اپنے وقت کا شیخ الکل تھا اسی طرح فنون جنگ میں بھی بے مثال مہارت رکھتا تھا۔

بارہ برس کی عمر میں اپنے باپ کے مذہبی جھنڈے کے نیچے خونخوار عربوں سے ایک بڑا میدان لے چکا تھا، اور اب تو اس کی عنفوان جوانی کا زمانہ تھا، اس حالت میں اس نے وہ وہ کارنمایاں کئے جو اب تک نجد کی تاریخ میں تعجب سے دیکھے جاتے ہیں۔

قرآن کا قرأت کے ساتھ خوش لہجہ پڑھنا بھی اس پر ختم تھا۔ حدیث کی چھ کتابیں

تقریباً اسے حفظ تھیں ادھر اس کی جنگی شوکت بڑھی، اور اُدھر اُس کے علم وفضل کی دھاک نے ہزاروں عربوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا، وہ غول کے غول آنے لگے، اور اس کے اسلامی مذہبی جھنڈے کے نیچے کھڑے ہونے لگے۔

سعد نے بیس ہزار فوج سے سلیمان پاشا سے مختلف جنگوں میں پے در پے فتوحات حاصل کیں اور اس کے مذہبی پیروان یا فوج کے آگے ترکوں کی ملکی اسپرٹ کی دال نہ گلی۔ آخران فتوحات کے بعد اس نے سیدھا کربلائے اقدس کا رُخ کیا، اور خفیف سے مقابلہ کے بعد شہر کربلا پر سعد کا قبضہ ہوگیا۔ صدہا بلند بلند مقبرے جن پر سنہری کام ہو رہا تھا شریعت محمدی کے مطابق ڈہا دیئے گئے، اور شہدار کربلا کے مزاروں کے آرائشی سامان فوراً آگ میں جلا دیئے گئے۔ سعد کی طرف سے ڈھنڈورا پٹ گیا کہ آئندہ سے اگر کسی نے خلاف شریعت کوئی بات کی اس کی سزا قرآن و حدیث کے موافق دی جائیگی، اسی سال کے بعد اس کے پرجوش مذہبی لشکر نے مکہ پر بھی قبضہ کر لیا اور ۲۷ر اپریل ۱۸۰۳ء میں سعد اپنے ہمراہیوں کے ساتھ طواف کے لئے کعبہ میں داخل ہوا۔

مقام کی بزرگی نے سعد کی کسی قدر وحشیانہ خونخوار روح کو ملائم کر دیا، اور اس نے صرف اس ادب سے کہ یہاں ہمارا آخرالزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوا تھا مطلق یہاں کے لوگوں کو کسی قسم کی بھی تکلیف نہیں دی۔ ہاں خلاف شریعت امور کی اصلاح کرنے کے لئے سخت ہدایت ضرور کر دی گئی مثلاً چاندی سونے کے حقے، ایرانی شال، گنگا جمنی کے ظروف، ریشمی ایرانی پوشاکیں جنہیں شریعت اسلام نے کبھی جائز نہیں ٹھہرایا تھا ایک جگہ جمع کئے گئے، اور ان سب میں آگ دے دی گئی۔ ہر شخص مجبور کیا گیا تھا کہ احکام دین کی پابندی کرے، اور تمام وہ باتیں جو نبی اکرمؐ کے زمانہ مسعود میں رائج تھیں بہت دھوم دھام سے ان کی اشاعت دی گئی۔

حقہ پینے کی ممانعت بہت سخت تھی۔ ایک دن اتفاق سے محتسب نے ایک خاتون کو جو حقہ کی حد سے زیادہ عادی تھی حقہ پیتے دیکھ لیا، وہ ہر چند چاہتی تھی کہ بچ کے نکل جاؤں، پر ممکن نہ ہوا، آخر وہ پکڑی گئی۔ الٹے گدھے پر اسے سوار کیا گیا، اور اس کی گردن پر اس کا حقہ

دکھا گیا۔ اور گلی در گلی اسے پھیرا گیا تاکہ عورتوں کو سخت عبرت ہو اور پھر وہ شہر بدر کر دی گئی۔ ان لوگوں کو شریعت کے قوانین کے موافق سزا دی جاتی تھی جو احکام اسلام سے انحراف کرتے تھے خواہ مرد ہو یا عورت۔ پنج وقتہ نماز میں ہر مسلمان مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ہر مسجد میں شریک جماعت ہو جائے اگر کہنے پر بھی کوئی سوتا ہوا نہ اٹھا تو اسے درّہ ہوشیار کرتا شہر کی مسجدیں اب پانچوں وقت لبالب بھری ہوئی معلوم ہونے لگیں، خلفائے راشدین کے عہد مبارک کے بعد پھر یہ موقع تھا کہ معائنہ کرنے والے کی آنکھ شریعت کے احکام پر لوگوں کو خواہ دلچسپی سے خواہ طوعاً کرہاً مگر عمل ضرور ہے کرتا ملاحظہ کرے گی بازار میں کسی دوکان پر ایک حقہ یا کوئی چلم نظر نہ آتی تھی اور ذرا بھی خلاف شریعت کوئی سامان کہیں دوائی کو بھی ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ کیا مقدور تھا کہ کوئی اپنے گھر میں پوشیدہ رہ سکے، بازار تو بازار رہا۔

جب سعد نے اپنا پورا پورا انتشا فتح مکہ کا پورا کر لیا تو اس نے سلطان ترکی کی خدمت میں مفصلہ ذیل الفاظ میں ایک خط لکھا جس میں اپنی کامیابی یا فتحیابی کی خبر دی گئی ہے وہ خط یہ ہے۔

سعد کی طرف سے سلیم کو معلوم ہو

”میں مکہ معظمہ میں ۴ محرم ۱۲۱۸ھ ہجری میں داخل ہوا۔ میں نے شہر میں بالکل امن کیا اور کسی متنفس کو نہیں ستایا۔ ہاں ان چیزوں کو برباد کر دیا جن کی پرستش ہوتی تھی۔ میں نے ہر قسم کے خراج کو سوائے ان ٹیکسوں کے جن کی اجازت قرآن دیتا ہے موقوف کر دیا ہے۔ میں نے قاضیوں کو مقرر کر دیا ہے جو بالکل شریعت محمدی کے موافق مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں امید ہے کہ آپ بھی یہ سن کے خوش ہوں گے میں چاہتا ہوں آپ دمشق اور مصر القاہرہ کے حکمرانوں کے پاس حکم نامہ لکھ کے بھیج دیں کہ وہ اس پاک معبد میں خلاف شرع محمل کے لئے نہ آئیں، اور نہ قرنا بجاتے ہوئے شہر میں داخل ہوں۔ مذہب ایسی باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔ میں دعا کرتا ہوں خدا کی برکتیں اور رحمتیں تم پر نازل ہوں۔“

۱۸۰۴ء اختتام پر مدینہ بھی سعد کے قبضہ میں آگیا۔ مدینہ لے کے اس کے مذہبی جوش میں یہاں تک اُبال آیا کہ اُس نے اور مقبروں سے گزر کے خود نبی اکرم کے مزار کو بھی سلامت نہ چھوڑا۔ آپ کے مزار کی جواہر نگار چھت کو برباد کر دیا، اور اس چادر کو اٹھا دیا جو آپ کی قبر مقدس پر پڑی رہتی تھی۔

نو برس تک سعد نے بہت زور شور سے مذہبی حکومت کی، دن بدن عربوں میں ان کا اثر بڑھتا گیا اور فوج سال بسال زیادہ ہوتی گئی، جب ان کی قوت بڑھنے لگی تو سلطان ترکی کی بھی آنکھیں کھلیں، اور اب انہیں اپنی سلطنت کا اندیشہ ہوا کہ کہیں اس پر سعد حملہ نہ کرے۔

علی پاشا ترکوں کی فوج لے کے سلطان کے حکم سے مکہ کی طرف بڑھا۔ دو تین خونریز میدانوں کے بعد مکہ اور مدینہ فتح کر لیا گیا۔ سعد کی وفات کے بعد (۱۸۱۴ء) اس کا بیٹا عبداللہ اپنے باپ کی جگہ تخت خلافت پر بیٹھا، اور اس نے پریشان فوج کو جمع کر کے ابراہیم پاشا افسر ترکی سے مقابلہ کیا۔ لڑتے لڑتے عین میدان جنگ میں گرفتار ہو گیا۔ ابراہیم پاشا نے اسے قسطنطنیہ روانہ کر دیا۔ مسجد صوفیہ میں ۱۹ دسمبر ۱۸۱۸ء کو اس کی گردن اڑائی گئی۔

عبداللہ کے بعد اس کا بیٹا ادھر اُدھر ترکوں کے خوف سے بھاگا بھاگا پھرا۔ آخر ریاض میں وہ بھی گرفتار ہو کے قتل کیا گیا، اس کے بعد عبداللہ کا پوتا فیصل اپنے باپ کی جگہ تخت خلافت پر ۱۸۳۰ء میں جلوہ فرما ہوا، اس نے وسطے عرب میں اپنے مذہبی اثر کو بہت سرگرمی سے پھیلایا اور ریاض کو جہاں اس کا باپ قتل ہوا تھا اپنا دارالخلافہ بنایا۔ وہ یہ پہلا خلیفہ تھا جس نے ۱۸۶۳ء میں یورپین مسافر پیلگریو سے ملاقات کی اور سر لوئیس پیلی لیفٹنٹ کرنیل کا بطور وکیل مکہ معظمہ استقبال کیا۔ سر لوئیس کی ملاقات کے بعد ۱۸۶۶ء میں فیصل کا انتقال ہو گیا۔ اور اب اس کی جگہ اس کا بیٹا عبداللہ تخت نشین ہے۔

یہ دیکھ کر ناظر اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر محمد ابن عبدالوہاب کے بعد پے درپے اس کے بیٹے پوتے ایک سے ایک زیادہ نہ پیدا ہوتے رہتے تو کبھی کا ان کا نام و نشان تک مٹ جاتا۔ برخلاف مولانا شہیدؒ کے نہ ان کے ساتھیوں میں ان کی زندگی میں نہ بعد ازاں کوئی ایسا سردھرا تھا کہ سکھوں سے اپنے مرشد کا انتقام لیتا یا ان کے اصول مذہبی کو خوب پھیلاتے

کی کوشش کرتا مگر الحمد للہ کہ جو بیج مذہبی اصلاح کا مولانا اسمٰعیل صاحب بو گئے تھے، وہ پھلا پھولا بڑا ہوا، اور اس نے اپنی جڑیں لوگوں کے دلوں میں مضبوط پکڑ لی ہیں جو کبھی نہیں جا سکتیں، اور جن کی نسبت ہمارا بزرگ قوم اپنی بیش بہا کتاب[1] میں یہ لکھتا ہے۔

"سنی چرچ کے جگر میں سو برس گزشتہ سے ایمان اور عمل کی مطابقت نے بہت بڑا اثر کرنا شروع کیا ہے مذہب وہابیہ جس نے اپنی صورت صدی کے آغاز میں ظاہر کی اپنی روح رواں صحراسے استنباط کرتا ہے۔ غیر مقلدی مذہب کا چشمہ انسانی قلوب کے باطنی گوشوں سے اُبلتا ہے، اور مستحکم چرچ کی سخت اور درشت مخالفت سے اپنی حفاظت کی جگہ تلاش کرتا ہے۔ یہ سخت ناانصافی اور جہالت ہے کہ ہم ایک غیر مقلد کو وہابیوں کی حدود میں محدود کر دیں وہ اس وہابیہ دائرہ میں آنے سے آزاد ہے وہ بہ نسبت اپنے مخالفین کے آپ بہت بڑے فلسفیانہ اور عقلی اصول رکھتا ہے، اس میں شک نہیں کہ سُنی چرچ کے جگر میں غیر مقلدی کی جو یہ تحریک ہوئی ہے اپنے ساتھ آئندہ خوفناک نتائج اور وعدے وعید کا مادہ مضمر رکھتی ہے۔"

مسٹر امیر علی جج کی آزادانہ رائے کی قدر وہ ہی شخص کر سکتا ہے کہ جسے آزادی اور انصاف سے کچھ حصہ ملا ہے، اگر ہم ذرا بھی توجہ کریں گے تو ہمیں کھل جائے گا جس شخص نے کئی کروڑ مسلمانوں کے جگر میں نئی تحریک پیدا کر دی اور اس کی وفات کے بعد کوئی اس کے مذہبی خیالات کی تائید کرنے والا نہ ہوا اس کے عالی رتبہ اور عالیشان درجہ کا اندازہ پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کی نسبت ہمارا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سات آٹھ سو برس کی ہندوستانی اسلامی سلطنت کا اگر ہمیں یا خود اسلام کو کوئی نتیجہ حاصل ہوا تو صرف دہلی میں ابتدائے صدی میں شاہ اسمٰعیل کے پیدا ہونے سے اور سنی چرچ ہی نہیں بلکہ شیعہ چرچ کے جگر میں اصلاح کی غیر معمولی تحریک قائم کرنے سے (پھر پایا)

اب میں مفصلہ ذیل یورپین کی کتابوں سے مولانا شہید اور سید صاحب[1] در محمدی مذہب اجسے غلطی سے وہابیہ مذہب سے پکارا گیا ہے) اس کی نسبت کچھ طول طویل آراء کا

---

[1] اسپرٹ آف اسلام مصنفہ سید امیر علی جج ہائی کورٹ کلکتہ صفحہ ۵۵۲ - ۵۵۱

خلاصہ کرتا ہوں جو یقیناً بہت ہی دلچسپ ہوگا۔

(۱) برک ہرڈس بدوئنس اینڈ وہابیز (برک ہرڈس صاحب کا بیان بابت بدو اور وہابیوں کے)

(۲) برانجیہ بریف ہسٹری آف وہابیز (وہابیوں کی مختصر تاریخ مصنفہ براجیہ)۔

(۳) مسٹر لیوس پیلیس پولیٹیکل مشن تو نجد (مسٹر لیوس پیلس کی پولیٹیکل سفارت نجد میں)۔

(۴) ہنڈرس مسلمان آف انڈیا (مسلمانان ہند مصنفہ ہنٹر صاحب)۔

(۵) پیلگریوس سنٹرل اینڈ ایسٹرن عربیا (پیلگریو کی کتاب وسطے اور مشرقی عرب کے بیان میں)۔

(۶) لیڈی انس بلنٹس پلگریج ٹو نجد (بیگم انس بلنٹس کا سفر نجد)۔

(۷) ڈی آر بیڈ جرس امام اینڈ سید آف اومان (ڈی آر بیڈ جرس کی کتاب اومان کے سیدوں اماموں کے

(۸) بلنٹس فیوچر آف اسلام (بلنٹس صاحب کی کتاب اسلام کی آئندہ حالت میں۔

مذکورہ بالا کتابوں میں سے جو بہت جوش و خروش سے انگریزی میں اناپ شناپ تصنیف کی گئی ہیں اور جن میں زیادہ تر مصنفوں نے اپنے خیالات کو درگذر کیا ہے اور خواہ مخواہ بیچارے محمدیوں کو خوفناک صورت میں دکھایا ہے کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے جس سے ہندوستان کے مسلمان واقف ہوں کہ ان کے دوست مسیحوں کا خیال ان کی نسبت کیا ہے (دیو بندا)۔

"اگرچہ وہابیوں کی جنگی اور ملکی قوت کا چکنا چور ہوگیا، اور سعد کے خاندان کی حکمرانی کی حدود نجد میں محدود ہو کے رہ گئیں مگر پھر بھی جو اصول مذہبی محمد بن عبدالوہاب نے بتائے تھے اب تک مساجد میں نہایت مذہبی جوش میں بیان کئے جاتے ہیں، اور ان پر خوب ہجوم وعام سے دعظ ہوتے ہیں، ان جوشیلے دعظوں کی گونجیں حدود نجد ہی میں مقید نہ رہیں بلکہ انہوں نے ہندوستان کے ایک بزرگ کی بے آرام روح میں مذہبی ولولے کی نئی روح پھونک دی، جب یہ بزرگ مکہ شریف کے حج کو آیا تو اس نے وہابیوں کے بڑے فاضل سے وہابیہ مذہب کی تعلیم حاصل کی، اور محمد ابن عبدالوہاب کے اسلامی اصول کو خوب مانجھا، سید احمد رائے بریلی کے قزاق اور رہزن نے ۱۸۲۲ء حج بیت اللہ کر کے چاہا کہ شمالی ہند کو یک لخت اپنے اسلامی اصول منوا دوں۔ پیغمبر اسلام کے براہ راست

سلسلہ اولاد میں ہونے سے برخلاف وہابیان نجد کے اس نے اپنے میں امیرالمؤمنین بننے کی ضروری صفات ملاحظہ کیں، مسلمانان ہند نے اسے سچا خلیفہ یا مہدی تسلیم کرلیا۔ انگریزی حکام کی لاعلمی میں وہ ہمارے صوبوں میں گشت لگاتا پھرا، اور بے شمار لوگوں کو اپنا معتقد بنایا۔ اس نے اپنے کارندے پٹنہ میں مقرر کئے اور پھر دہلی کی طرف رُخ کیا، یہاں خوش قسمتی سے ایک فاضل اجل محمد اسمٰعیل نامی اس کا مرید ہوگیا، اور آخر میں اپنے پیر کا ایسا دلدادہ و شیدا ہوا کہ اس نے نئے خلیفہ کے اصول مذہبی کی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام صراط المستقیم ہے

۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو اس نے سکھوں کے خلاف جہاد کا جھنڈا بلند کیا اور وسطے ایشیا کو اپنے ساتھ ہمزبان کرنے کی کوشش کی۔ حدود پشاور اور پشاور میں اس نے قیامت برپا کردی، اور رنجیت سنگھ پر رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کردیا۔

جہادی جنگیں چار برس تک ہوتی رہیں، جن میں سید احمدؒ ہی کو متواتر کامیابی ہوتی رہی اب وہابیہ لشکر کی قوت اور بھی خوفناک ہوگئی تھی اور وہ ابھی اور بھی بڑھتی مگر اپنے سردار کے ایک عظیم الشان جنگ میں جو شیر سنگھ سے بالاکوٹ ہزارہ میں ہوئی تھی۔ ماہ مئی ۱۸۳۱ء میں قتل ہونے سے رک گئی۔ ہزیمت یافتہ لشکر کا بقیہ حصہ حدود سے عبور کرکے ستیانا میں جاکے آباد ہوگیا۔ ۱۸۶۳ء کی جنگ میں برٹش گورنمنٹ نے ان کا بالکل فیصلہ کردیا، پھر بھی کوئی تین سو کے قریب انڈس کے کناروں پر پلوسی میں آباد ہیں جن کا سردار مشہور ۱۸۵۷ء کا باغی شیخ عبداللہ ہے جو ایک بہت ضعیف شخص ہے جس نے حال میں اپنی لڑکی کی شادی سابق امام پشاوری سے کردی ہے، اس شادی کی وجہ یہ ہے کہ پلوسی کا وہابیہ اثر حدود پشاور پر بھی محیط ہو جائے۔ ہنوز دیکھنے میں آتا ہے کہ وہابیہ مذہب کے لیڈروں کی غیر موجودگی سے گو جنگی قوت کا ڈھانچہ بالکل توڑ مروڑ ڈالا گیا ہے، تاہم اس مذہب کا اثر ہندوستان اور نجد میں باقی ہے اور جو دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ بہت دھوم دھام سے ہندوستان میں وہابیہ مذہب کی کتابیں طبع ہوتی ہیں، اور انہیں اشاعت کیا جاتا ہے مثلاً تقویۃ الایمان اور صراط المستقیم کتابیں جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں پر اپنا زبردست اثر ڈال رکھا ہے۔

وہابی مذہب بالکل ہمارے مذہب پروٹیسٹنٹ سے مشابہت رکھتا ہے، اس کے عقلی اور قابل تسلیم اصول پروٹسٹنٹ کے ہم پلہ ہیں۔ یہ لوگ اپنا ایمان قرآن وحدیث پر رکھتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں احادیث نبویہ کے مطابق کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اپنے کو اہل حدیث کے لقب سے ملقب کرتے ہیں، اور جہاں تک ان سے ہوتا ہے حدیث کی درس وتدریس میں اپنے دھن اور وقت سے مدد کرتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی سرگرمی رکھتے ہیں۔ وہابی اور بھی اپنے کو موحد اور دوسرے مسلمانوں کو مشرک بتاتے ہیں اور ان کے اصول مفصلہ ذیل ہیں۔

(۱) وہ چار مذہبوں کے اماموں کا فیصلہ نہیں تسلیم کرتے ان کا قول ہے کہ کوئی شخص جو قرآن وحدیث کو پڑھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے اصول مذہب کے معاملات میں اپنا فیصلہ آپ کرسکتا ہے، اس لئے وہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد اجماع کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۲) سوائے خدا کے آدمی کے دل کا بھید کوئی بھی نہیں جانتا، نماز سوائے خدا کے نہ کسی پیغمبر نہ ولی نہ پیر شہید کی جائز ہے، اور نہ کسی پیر شہید کے ذریعہ سے خدا کی جناب میں کسی ضرورت کو پیش کرنا روا ہے۔

(۳) قیامت کے دن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خداوند تعالیٰ سے اپنی اُمت کی شفاعت کرنے کی اجازت یا اذن چاہیں گے۔ مقلدوں کا مذہب ہے کہ اذن رسولؐ خدا کو دیا جاچکا۔

(۴) وہابی خلاف شریعت سمجھتے ہیں کہ کسی پیر شہید کے مزار پر روشنی کی جائے اس کے آگے جھکا جائے یا اس کا طواف کیا جائے، حتیٰ کہ وہ یہ باتیں خود نبی عربی کے مزار کے لئے بھی جائز نہیں قرار دیتے۔

(۵) عورتوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کی قبر پر جائیں اور وہاں روئیں پیٹیں، اپنے بال نوچیں اور اپنے کو نیم بسمل کریں۔

(۶) صرف چار تہوار قابل تسلیم ہیں۔ عید الفطر، عید الاضحیٰ، عاشورہ، لیلۃ المبارک۔

(۷) مولود شریف کی تقریب کو فعل عبث جانتے ہیں جو اور مسلمانوں میں ہوا کرتا ہے۔

(۸) وہ کسی مزار پر کوئی نیاز نذر نہیں چڑھاتے، نہ مراد حاصل ہونے کیلئے کلاوا باندھتے ہیں۔

(۹) وہ خدا کے ننانوے نام اپنی انگلیوں پر پڑھتے ہیں، تسبیح کا استعمال نہیں کرتے۔

(۱۰) وہ خدا کا عرش پر قیام کرنا اور خدا کا ہاتھ ہونا جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے مجازی نہیں سمجھتے بلکہ حقیقی جانتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے یہ کہتے ہیں کہ ہم یہ نہیں حکم لگا سکتے کہ اس کا بیٹھنا ہمارے بیٹھنے کے مساوی ہے یا اس کا ہاتھ ہمارے ہاتھ کی طرح ہے۔ یہ بھید اپنے وہ خود ہی خوب جانتا ہے نقط۔"

یورو پنیس کی اس تحریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ کس قدر اپنے خیال میں دوسرے مذہب کی چھان بین کرتے ہیں مگر پھر بھی بہت سی باتیں بالکل غلط بے تحقیق ہوتی ہیں۔ مولوی اسمٰعیلؒ جو ہندوستان میں فرقہ موحدیہ کا بانی ہے، کبھی کسی نجدی شیخ سے نہیں ملا اور نہ اس نے اُن کی کوئی کتاب دیکھی اس نے وہی تعلیم دی جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتی ہے۔ محمد ابن عبدالوہابؒ کی پیدائش سے پہلے محدیت کی بنا اس کے خاندان میں پڑ چکی تھی اور جو کچھ اس نے اور اس کے خاندان نے حاصل کیا وہ اپنے ہی باپ اداؤں سے۔ اسلامی دنیا میں ایک ہی خاندان ہے جسے غیر کے شاگرد بننے کا افتخار حاصل نہیں ہوا یورو پنیس کا یہ لکھنا کہ محمد بن عبدالوہابؒ نے ہندوستان تک اپنے مذہبی اصول کے خیالات پھیلائے محض لغو اور بے سروپا بات ہے۔

بس بڑے پیرایہ میں محمدیوں کو جنہیں سخت غلطی سے وہابی کہا ہے انگریز مصنفوں نے گورنمنٹ کو دکھایا ہے سخت حقارت انگیز کارروائی ہے۔ گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کس قدر تسلیم کر لیا ہے اور اس کے کیسے فرماں بردار مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں ان پر کیا ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی ان کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔

ہنٹر صاحب نے خصوصاً جو کچھ لکھا ہے اس کا بہت سا حصہ غلط اور خیالی ہے، اگر وہ کچھ بھی اپنے غصہ کا جس میں کسی قدر خوف بھی ملا ہوا تھا ضبط کرتے تو کبھی ایسی بے سر و پا اور پادر ہوا باتوں کے بنانے کا موقع نہ ملتا۔

چودھواں باب

شریعت

لفظ شریعت جس کے سیدھے معنے راستہ کے ہیں ان ہی معنوں میں ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے اسلامی علم الٰہی کی کتابوں کو بھی شریعت کہتے ہیں، اور کتاب کے معنوں میں لفظ شریعت کا استعمال کلام اللہ میں بھی ہوا ہے۔ جہاں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے "ہر ایک کو ہم نے شریعت دی ہے"۔

احادیث اور علم الٰہی کی کتابوں میں لفظ الشرع عام طور پر قانون محمدی کے اظہار کے لئے مستعمل ہوتا ہے قرآن مجید میں اسی لفظ کے ہم معنی تورات کا عبرانی لفظ آیا ہے جس کے معنی قانون موسوی کے ہیں یا جو قانون حضرت موسےٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے علمائے اسلام کے مطابق الشرع یا قانون کے پانچ حصے ہیں۔ (۱) اعتقاد (۲) آداب (۳) عبادات (۴) معاملات (عقوبات۔

(۱) اعتقادات میں وہ چھ باتیں شامل ہیں جن پر دین اسلام قائم ہے یعنے (ا) خدا میں یقین (ب) اس کے فرشتوں میں یقین (ت) اس کی کتابوں میں (ث) اس کے انبیاء علیہم السلام پر (ج) قیامت کے دن پر (ح) تقدیر خدا پر۔ اسلامی قانون میں اسے علم العقائد سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں تمام تفسیری علم الٰہی کی شاخیں شامل ہیں خاص اس مضمون پر موجودہ زمانہ میں جو کتابیں زیادہ مشہور اور مروج ہیں یہ ہیں شرح المواقف مصنفہ سید شرف الدین جرجانی۔ شرح العقائد۔ مصنفہ مسعود سعدالدین تفتازانی۔

(۲) آداب میں تمام وہ تمدنی اور اخلاقی عمدگیاں شامل ہیں جن کا شاہد خود قرآن مجید اور احادیث نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جیسے کہ اخلاص، توکل، تواضع، تفویض،

نبی کے اقوال کے آگے تمام جہان کے فضلا کے اقوال اتنی وقعت بھی نہیں رکھتے، جتنی کوہ ہمالیہ کے آگے اپنی جسامت کے لحاظ سے ایک چیونٹی رکھتی ہے، اس لئے فرض اور سنت کا ترک کرنے والا گنہگاری سے نہیں بچ سکتا۔

قرآن وحدیث کے ساتھ اجماع بھی شریک کیا جاتا ہے۔ اس میں مسلمان باہم مختلف ہیں۔ مقلدین کا تو یہ مذہب ہے کہ چار مجتہدوں (مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، شافعیؒ، حنبلؒ) سے اجماع شروع ہوا، اور ان ہی پر ختم ہو چکا۔ اس کے مقابل میں اہل حدیث کا یہ مذہب ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اجماع کبھی نہیں ہو سکتا

میرا یہ خیال ہے کہ باہمی غلط فہمی صرف تاریخ سے لاعلمی کی وجہ ہے۔ یہ سخت تیرہ چشمی اور اسلام کے ساتھ نازیبا سوء ادبی ہے کہ ہم اس کا علمی جلال جس نے یورپ کی سترہ صدی تک آنکھیں منور کیں، صرف چار نفوس میں محدود کر دیں سے

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

اگر ہم اسلامی دنیا کی تاریخ علما دیکھیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ائمہ موصوف سے کہیں زیادہ فاضل اور عالم امام ہر صدی میں ہوئے، اور کسی نہ کسی اسلامی دار العلوم کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ ان کی کیفیت ہماری کتاب الحمد کی دوسری جلد میں مل سکتی ہے۔ اہل حدیث کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال پر تنویر سے اپنی آنکھیں منور نہیں کیں وہ بھی اس قابل نہیں ہے کہ اجماع کی مسند پر جلوہ فرما ہو۔

اجماع کی تین بنیادیں ہیں (۱) اتفاق القولی (۲) اتفاق الفعلی (۳) اتفاق السکوتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق کچھ بھی مذہب سے ہے۔ صحابائے راشدین ہی کا اجماع قابل تسلیم ہو سکتا ہے۔ اور تمام استنباطی دینی یا تمدنی مسائل میں ہر پڑھا لکھا شخص مجتہد وقت ہے۔ چنانچہ میں مولوی اسمٰعیل کو مجتہد وقت لکھتا ہوں جس کا ثبوت کسی آئندہ باب میں تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا انشاء اللہ۔

یہ دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے کہ مجتہدوں میں ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے اور وہ اختلافات کچھ تو قیاسات کی وجہ سے ہے۔ اور کچھ حدیثوں کا اختلاف سے پہنچنا اس کا سبب ہوا ہے۔

فتاویٰ سراجیہ میں صرف ایک بات ہی ہے کہ اس میں جو خاص فتووں کا مجموعہ ہے وہ اور دوسری کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔ فتاویٰ عالمگیری میں بے شمار قانونی مقدمات کا بیان ہے۔ یہ کتاب اپنی کثیر المعنیٰ اور قلیل اللفظ فطرت میں قریب قریب ہر مقدمہ کے ساتھ جس کی بنا حنفی اصول پر رکھی گئی ہے چسپاں ہوتی ہے اگرچہ متاخرین فقہاء کی آراء کی قیمت متقدمین فقیہوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی اپنی لاثانی نوعیت سے اس نے ہندوستان میں اپنے کو محترم بنا دیا ہے۔ جس کے نام سے یہ پکاری جاتی ہے وہ بادشاہ اورنگ زیب ہے جس کا علم و فضل میں ثانی مغلیہ خاندان میں کوئی نہیں ہوا۔

اس نوعیت کی جتنی کتابیں ہندوستان میں رائج ہیں سب میں یہی کتاب عام طور پر زیادہ پسندیدہ ہے۔ ہندوستان کی طولانی سلطنت اسلامیہ میں صرف زیب النساء نے فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ فارسی میں کرایا تھا یہ وہ زیب النساء ہے جو اپنے باپ اورنگ زیب کی بہت پیاری تھی اور علم ادب میں جو اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔

جب حکومت مغلیہ کا دور ختم ہوا اور شیر انگلستان کا پھریرہ ہند کے جگر میں فرائے بھرنے لگا تو کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی کونسل کے حکم سے فتاویٰ عالمگیری سے دو کتابوں جنایات اور حدود کا ترجمہ فارسی میں قاضی القضاۃ محمد نجم الدین خان نے کیا اور ۱۸۱۳ء میں شائع کیا۔

اسی سال مسٹر ہرنگٹن چیف جج صدر دیوانی عدالت کے حکم سے مولوی محمد خلیل الدین نے الدر المختار میں سے تعزیرات کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اسے چھپوا کے شائع کیا پھر ہدایہ کا ترجمہ عربی سے فارسی میں چار بڑے بڑے علماء نے کیا مگر بدقسمتی سے اس ترجمہ سے ہدایہ کی اصلی قیمت میں فرق آگیا، بجائے اس کے کہ وہ اکثر مسائل کی توضیح جو ترجمہ کی حالت میں کی تھی بطور حاشیہ تحت میں جدا قائم کرتے۔ فاضل مترجموں نے یہ غضب ڈھایا ہے کہ متن ہدایہ میں اپنی آرا کو بھی خلط ملط کر دیا۔ اب نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایہ والا کیا کہتا ہے اور مترجموں نے اس کے قول کی کیا توضیح کی ہے۔ کئی مقام سے ترجمہ اصلی عبارت عربی سے بھی نہیں ملتا۔ یہ ہم کہہ سکتے ہیں اور اس میں اصلاً شک نہیں کہ فارسی کا ہدایہ اصلی ہدایہ کی بالکل ہم صورت نہیں ہو سکتا۔

امام مالکؒ کے نزدیک بغیر استشہاد کے رجعت صحیح نہیں ہے فقط۔	رجعت پر گواہ مقرر کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

مجھے سخت افسوس آتا ہے کہ شبلی صاحبؒ نے بدیہی مسائل کو خواہ مخواہ الجھانے میں اپنی عقل آرائی کی ہے اور سچی باتوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فہرست مسائل جو آپ نے بڑی دلیری سے پیش کی ہے ایک پیمانہ ہے مجتہدوں کے اختلاف آرا کا جس سے ایک سمجھ دار آدمی وزن کر کے دیکھ سکتا ہے کہ کس کی رائے ٹھیک ہے اور کس کی رائے نادرست ہے۔ جب وہ اس پر دل سے توجہ کرے گا تو اُسے معلوم ہوگا کہ بعض مسائل امام ابوحنیفہ کے درست ہیں تو بعض مسائل میں اور ائمہ کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تعجب یہ ہے کہ شبلی صاحب صرف ان دو چار دس بیس مسائل سے امام ابوحنیفہؒ کی فضیلت کیونکر اور ائمہ پر ثابت کر سکتے ہیں۔ اجی حضرت آپ کس خیال میں گئے۔ ہزاروں کتابیں لاکھوں مسائل کے اختلاف سے بھری پڑی ہیں جب تک ان مسائل کی فہرست نہ بنے اور کوئی جج کرنے والا نہ ہو محض ناممکن ہے کہ ایک امام کی رائے کو دوسرے امام پر ترجیح دینے کی سمجھ پیدا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے مطلب کے دو تین اٹکل پچو مسائل لے کے امام اعظم کی فضیلت کا راگ گانے لگے۔ ایسی باتیں کچھ زیادہ وزن کی نہیں ہوتیں۔ اور ان میں سرتاپا چھچھورا پن پایا جاتا ہے بایں ہمہ ہم ان ہی چند مسائل پر بحث کرتے ہیں اور اپنے دوست مولوی شبلی صاحب کو دکھاتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے ثابت کرنا چاہا تھا اس میں کس قدر فیل ہوتے ہیں۔

پہلا دلچسپ مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک نصاب میں متعدد چوروں کا ساجھا ہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک کسی کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ یہ ایک زبردست اجتہادی خطا ہے۔ شریعت اسلام کے مطلق چور کی سزا قطع ید رکھی ہے پھر وجہ کیا ہے کہ ہر شخص کا جس پر چور کا اطلاق ہو ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ اگر امام اعظم کا خیال صحیح ہو تو کیا قباحت لازم آتی ہے میں کہتا ہوں بڑی قباحت لازم آئے گی کبھی کوئی تنہا چوری کرنے کا نہیں جب ان کے دل

ے قطع کا خوف جاتا رہا پھر وہ مل مل کے دھڑا کے سے دن دیوے چوری کریں اور امام ابو حنیفہ
کی بدولت صحیح رہیں گے۔

تمام دنیا کے فوجداری قوانین میں یہ بات ہرگز نہ ہوگی ایک فعل بُرا ہے اگر ایک گروہ
اس کو کرے گا تو اس پر بھی وہی جرم عاید کیا جائے گا جو ایک تنہا فاعل پر کیا جاتا۔ پہلے قوانین
انگریزی میں بھی یہ بات تھی کہ اگر کئی شخص ایک آدمی کو مار ڈالتے تھے تو انہیں پھانسی کی سزا
دی جاتی تھی۔ بلکہ وہ کالے پانی روانہ کر دیئے جاتے تھے۔ حقیقت میں یہ بڑا ظلم تھا مقتول
کے ساتھ ہرگز عدل نہیں ہے کہ اس کے قاتلوں کو چھوڑ دیا جاتے، یہ ظاہر ہے کہ اگر ایک
ہی شخص ایک شخص کو مارے گا تو اس خیال سے کہ یہ بھید کسی پر ظاہر نہ ہو جائے یا اپنی کم طاقتی
کے خیال سے یا کسی اور وجہ سے قتل کرنے میں مقتول کو تکلیف بہت کم دے گا کیونکہ وہ یہ
چاہے گا جس طرح ہو بہت جلد اس کا کام تمام کر دوں مگر جب کئی مارنے والے ہو نگے
اُن کی مجموعی قوت مقتول کی طرف سے بے پروا بنا دے گی اور پھر جس طرح ان کا جی
چاہے گا باطمینان اسے قتل کریں گے۔ اکثر خون کے مقدموں میں دیکھا گیا ہے کہ جہاں
کئی قاتل گرفتار ہوئے ہیں۔ مقتول کی نعش سے ملاحظہ کے وقت یہ معلوم ہوا ہے کہ قتل
کرتے وقت قاتلوں نے اس پر ظلم بہت کیا، ان ان حالتوں پر بھی قاتل سزائے موت
سے بری کیے جاتے تھے مگر جوں جوں عدل اور عقل کو ترقی ہوئی وہ تاریک تر رائے ہمارے
نظام کی جاتی رہی، اور اب یہاں تک ہو گیا ہے کہ اگر ایک شخص کو سو آدمی قتل کرتے پکڑے
جائیں گے تو سو ہی کو پھانسی ملے گی۔

پھر ایسی حالت میں ہم امام ابو حنیفہ صاحب کی رائے کو کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں جو نہ
صرف عقل و نقل کے خلاف ہے۔ بلکہ ایسے قوانین سے امن میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔

دوسرا ایک اور بھی مذاق کا مسئلہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفن چور کا کفن کی
چوری پر ہاتھ نہ کاٹنا چاہیئے۔ مگر اور ائمہ کہتے ہیں کہ کاٹنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ کاٹنا چاہیئے
کیونکہ یہ شرعی چوری ہے اور مال وغیرہ کی چوری دنیاوی چوری ہوتی ہے۔ اگر قطع ید سے
بھی زیادہ سزا ائمہ اس کی تجویز کرتے تو شایان تھا وہ باتیں جو مخرب اخلاق اور خلاف دین اسلام

میں یہ کہتا ہوں کونسا امام اور مجتہد ایسا ہے کہ جس کی رائے میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال نہ ہو یہ خیال کرنا محض فضول اور تحکم ہے کہ فلاں امام نے استنباطی مسائل میں کبھی خطا ہی نہیں کی۔ یہ ایسا بدیہی جھوٹ ہے کہ جس کی کوئی بھی انتہا نہیں۔

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں جب خطا اور صواب کا احتمال باقی تھا اور دینی معاملات میں سوائے وحی کے کوئی ناطق حکم نہیں دے سکتے تھے دنیا کے معاملات میں فرمایا کرتے تھے میری رائے پر نہ رہنا تم خود بھی خوب سمجھ لینا مبادا میری رائے پر خطا ہو اور پھر تمہیں نقصان ہو جب نبی کی یہ کیفیت تھی تو بے چارہ مجتہد یا امام کس گنتی میں ہے۔ ان باتوں کے سمجھنے کے لئے عقل زیادہ اور علم کی کم ضرورت ہے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ تمام جہان کا فاضل ہی اسے سمجھے، نہیں معمولی پڑھا لکھا بھی سمجھ سکتا ہے۔

؎ شرط انصاف ہے ہر بات میں اے بندہ نواز

مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب شہیدؒ جن پر محض تعصب اور حسد سے الزامات قائم ہوتے ہیں یہی فرمایا کرتے تھے اور آپ کا اصلی مذہب یہی تھا ان پر نہ مقلد کا لفظ عائد ہو سکتا ہے، نہ غیر مقلد کا وہ بجائے خود ایک مجتہد تھے پھر انہیں ان استنباطی مسائل کی تقلید اور غیر تقلید کرنے سے غرض کیا تھی۔ صحاح ستہ جو ائمہ مجتہدین کے زمانہ میں مدون ہوئی تھیں۔ ہمارے مجتہدِ وقت کے سامنے کھلی ہوئی رکھی تھیں جو کتابیں فقہ کی ہم نے اوپر بیان کیں ان میں مجتہدین کے اختلافی مسائل اور مختلف آرا کا ایک پیچیدہ بھنور پایا جائے گا اور صحاح ستہ میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال مبارک ملیں گے گو اختلاف کے ساتھ سبھی پھر بھی ہر قوم پر قول نبی کا خیال ہوگا اور اس کے بعد درجہ تیقن پر ناظر پہنچ جائے گا۔ صدہا مسائل جو فقہ کی کتابوں میں لکھے گئے ہیں صحاح ستہ میں موجود ہیں پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ صحاح ستہ پر جن میں آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال جمع ہوں مجتہدوں کی تصنیف کی ہوئی کتابوں کو فضیلت دیں یہ سخت نا انصافی اور سوء ادبی ہوگی یہ خیال حد سے زیادہ رکیک ہے کہ امام اعظم کو ہم تمام احادیث کا حافظ بتادیں استغفراللہ یہ محض ناممکنات سے ہے

[illegible] تو نہلی صدی کے اختتام پر پیدا ہوئے تھے جنہوں نے مشکل سے نبی عربی

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے شاید کسی کو دیکھا ہوگا مگر وہ صحابہ جو مدتوں تک اپنے مفخر موجودات اور رحمت عالم کے ہمرکاب رہ چکے تھے اُنہیں خود صدہا حدیثیں یاد نہ تھیں، چنانچہ جب حضرت صدیق اکبرؓ سے دادی کے حصّہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو کونسا حصّہ دلوایا ہے۔ میں نے کبھی اس کی بابت نبی اکرم کی زبان مبارک سے کچھ نہیں سُنا، پھر آپ نے ظہر کی نماز کے بعد لوگوں سے دریافت کیا کہ اگر کسی کو دادی کے حصّہ کے بابت معلوم ہو تو بیان کرے یہ سُن کے مغیرہؓ بن شعبہ نے کھڑے ہو کے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصّہ دیا ہے حضرت ابو بکرؓ صدیق نے فرمایا تیرے سوا اور بھی کوئی اسے جانتا ہے محمدؓ بن سلمہ نے اس کی صداقت پر شہادت دی، حضرت ابوبکر صدیق کو اطمینان ہوا، اور دادی کو چھٹا حصّہ دلوا دیا۔ جب یار غار کا یہ حال ہوا کہ اُسے بہت سی حدیثیں یاد نہ ہوں تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ چار مجتہدوں میں سے فلاں مجتہد کو تمام حدیثیں یاد تھیں۔

اس خیال ست ومحال است وجنوں

مولانا شہید جنہیں خود مجتہد ہونے کا فخر حاصل تھا کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑے نہ اُنہیں تقلید و غیر تقلید سے غرض تھی اور نہ وہ قوم میں فساد برپا کرنا چاہتے تھے ان کا منشاصرف یہ تھا کہ ہر مسلمان موحد بن جائے اور شرک و بدعت مسلمانوں میں سے نکل جائے۔ اس عجیب جوش اور نتھرے ہوئے اصلاح کے خیال نے اپنا اثر کیا اور جس قدر تھوڑی مدت میں اصلاح ہوئی وہ اپنا نظیر دلّی کی تاریخ میں تو نہیں رکھتی۔

ناحق آپ کی ذات والا پر الزام قائم ہوتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا اور انہوں نے یہ کہا وہ مقلد تھے اور وہ غیر مقلد تھے یا وہ وہابی تھے نافہم اور الزام دینے والے اگر ذرا غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ تینوں الفاظ اس والا ذات پر عاید نہیں ہو سکتے جس نے امام ابو حنیفہ سے زیادہ دین کی مدد کی اور خونخوار سکھوں سے اپنے بھائیوں کے خون کا عوض لیا یہ باتیں کوئی معمولی اور سرسری نظر سے دیکھنے کے لائق نہیں ہیں ان پر مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ کی والا شان ذات ان بیہودہ الزامات سے بہت دُور ہے جو شخص آپ کی سوانح عمری بغور

پڑھے گا اُسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ کس پایہ کا شخص تھا اگر کسی سلطان کے ہاں پیدا ہوتا تو دنیا میں اشاعت اسلام کہاں تک کرتا اور اب بھی ہم تو یہی کہتے ہیں کہ توحید پرستی کی زبردست بنیاد وہ ہندوستان میں جما گیا اگر خدانخواستہ وہ پیدا نہ ہوتا تو خبر نہیں مسلمانوں کی کیا حالت ہوتی اور وہ دین خدا میں کہاں تک رخنہ ڈالتے۔

مولانا شہید کی تصنیفات میں شاید ایسی ایک آدھ کتاب کوئی ہوگی جس میں تقلید غیر تقلید کا اشارتاً بھی کہیں ذکر ہو اور نہیں، کل کتابیں اصلاح مسلمین میں لکھی گئی ہیں اور بُت پرستی سے مسلمانوں کو بچایا گیا ہے۔

تقلید وغیر تقلید کا ایک ایسا بھنگم مسئلہ ہے کہ اس پر کوئی سمجھ دار آدمی تو گفتگو نہیں کرنے کا سوائے وقت ضائع ہونے کے اور کچھ نتیجہ ہی نہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اجتہاد امام ابو حنیفہ رح امام مالک رح امام شافعی رح امام حنبل رح پر تمام ہو گیا اور ان میں ہر ایک مجتہد بجائے خود حق کا بازگشت بنا ہوا ہے یعنے ہر امام کا گروہ یہ کہتا ہے کہ ہمارے امام صاحب خطا سے بالکل پاک ہیں ایسے مجنون لوگوں کو ان ہی کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے اور خدا سے دعا مانگنی چاہیئے کہ ان پر رحمت نازل ہو اور اس جنون سے ان کی خلاصی ہو۔ ایسی عقل کے لوگ بحث کرنے اور گفتگو کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

مولانا شہید رح نے سبقاً سبقاً حدیث وفقہ کی کتابوں کو پڑھا تھا ان پر غور کیا تھا اور اس کی مصلحت کو بخوبی جانتے تھے ایسے شخص کی نسبت مقلد یا غیر مقلد یا وہابی کا لفظ استعمال کرنا کتنے غضب کی بات ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ آپ اپنے وقت کے ایسے ہی مجتہد تھے کہ جیسے اور گزر گئے۔ دوسری حیثیت آپ میں مصلح ہونے کی تھی، اس لحاظ سے وہ جہان کے مصلحوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اور مورخوں نے آخر ان کا شمار مجبوراً کیا ہے۔

جب تک ہمارے علماء میں سے یہ بساندی تقلید وغیر تقلید کے جھگڑے نہ اُٹھ جائینگے اور سب ذاتی اغراض کو برطرف کر کے قومی منفعت کا خیال نہ کریں گے کبھی اصلاح قومی اور ترقی نہیں ہو سکتی۔

پندرھواں باب

دینِ اسلام میں سہولت

دنیا کے مذہبی تواریخ میں یہ نظارہ بھی عجیب وغریب فیکٹس سے پر ہے کہ مذہب اسلام میں جس قدر سہولت ہے کسی مذہب میں بھی نہیں ہے جہاں صاف صاف یہ حکم ہے " اپنے نفوس کو تکلیف نہ دو مگر جہاں تک ان کی وسعت ہو۔" پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان پر فرائض دینی ادا کرنے کا اسی قدر بوجھ نہیں رکھا گیا جتنی کہ اس کی طاقت ہے۔ اسلام کی پابندی عین آزادی ہے اور مذہبوں کی آزادی عین پابندی ہے۔ نہ اسلام نے دولت مندوں کو جہنمی ٹھہرایا ہے۔ نہ راہبانہ حیات کی تعریف کی ہے نہ دنیا سے کنارہ کشی کرنا افضل بتایا ہے نہ اپنے کسی عضو کو خدا کی نذر کر دینا سکھایا ہے نہ کسی کنوئیں میں الٹا لٹک کے عبادت کرنی سکھائی ہے وہ ان تمام فضول باتوں سے ان کو بچاتا - اور ہمیشہ اس نے ایسا ہی کیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے علماء دین اسلام کو ایسی مہیب صورت میں پیش کر رہے ہیں جسے دیکھ کے خود مسلمانوں کے دل کانپے جاتے ہیں بھلا غیر مذہب والے تو کیوں خوف کے مارے قریب آنے لگے۔

وہ پیچیدہ اور قریب قریب لاینحل مسائل جو بیچارے مسلمانوں کے آگے پیش کئے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ تم اُن کے پابند ہو قرآن اور اسلام کی نفس تعلیم سے انہیں کچھ علاقہ نہیں۔ اسلام ان فضول باتوں سے بہت دُور ہے۔ اسلام کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ پڑھے چڑیا کی کہانیوں میں پابند رہے اور معمولی طرز معاشرت میں زبردستی بیٹھا چلا جائے۔ ایک شخص وضو کرنے بیٹھا اُس نے کلّیاں کرنے سے پہلے ناک میں پانی دے لیا اور اس پر فتوے دے دیا گیا کہ تیری نماز اگر اسی وضو سے پڑھے گا تو ناکارہ جائے گی اس

کا یہ مطلب ہوا کہ جو شخص کلیاں کرنے سے پہلے ناک میں پانی دے وہ خدا کی درگاہ میں حاضر ہونے کے قابل نہیں ہے یا جس نے تین دفعہ منہ پر پانی کے چھپکے مارنے کے بجائے چار دفعہ مارئے وہ شخص بھی خدا کے دربار میں حاضر ہونے کے قابل نہیں ہے۔ یا جبتک ٹخنے سے اونچا پائجامہ نہ ہو نماز درست ہی نہیں ہو سکتی یا اگر لبیں نہ کتری ہوئی ہوں تو وہ شخص مسلمان نہیں یا اگر اُس نے کسی مجتہد کے استنباطی مسئلہ پر نکتہ چینی کی یا اپنا شبہ ظاہر کیا وہ فوراً کافر بنا دیا گیا پہلے زمانہ میں تو یہ کیفیت تھی کہ غیر اسلام کو مسلمان بنانے کے لئے لاکھوں روپیہ اور جانیں ضائع ہوتی تھیں یا اب وہ زمانہ ہے کہ ہمارے علماء پُرانے مسلمانوں کو دھکے دے دے کے نکال رہے ہیں اور کافر بنائے جاتے ہیں۔ غضب خدا کا ہوا شہید جیسا پاک نفس اور اس پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے صرف اتنی سی بات پر کہ اُس نے یہ کہا تھا خدا کے جلال کے آگے کسی کی بھی کچھ اصل نہیں خواہ نبی ہو یا غیر نبی وہ آخرالزمان نبی جیسے ہزاروں پیغمبر پیدا کر سکتا ہے مگر یہ اس کی عادت نہیں جو وعدہ کر چکتا ہے پورا کرتا ہے صرف اس قدر لکھنے پر ایک ونددمچ گیا اور ہر طرف سے کفر کے فتوے دینے شروع کر دیئے اگر یہی شعار ملت اسلامیان ہیں تو سلام ہے ایسے مذہب پر اور مذہبی گروہ سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ ایسے ہی شعار ملت اسلامیان پر یہ شعر موزوں ہوتا ہے۔

شعار ملت اسلامیاں بگذار اگر خواہی   کہ در دیر مغاں آئی و اسرار نہاں بینی

اس کے مقابل میں پیارے شہیدؒ کو دیکھا جائے کہ جب آپ عیدگاہ جانے لگے ہیں تو دوستوں نے منع کیا۔ وہ شخص یعنے امام سخت بدعتی ہے بت پرستی کرتا ہے اور تمام افعال شنیعہ کو بہتر جان کے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اس کے پیچھے نماز کیونکر درست ہوگی آپ نے یہ جواب دیا ہے تو مسلمان بس اس کے پیچھے نماز ہو جائے گی۔ میں کبھی تفرقہ مسلمین کا باعث نہ ہوں گا۔ آپ نے کبھی کسی شخص کو بددین نہیں کہا کافر اور فاسق بتانا تو کجا یہ طبیعت تھی یہ انصاف پسندی تھی اور اسلام پر یہی فدائیت تھی ایسے برتر نفوس کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہندی مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے ان میں ایک ایسے شخص کا ظہور

ہوا جو اسلامی ہندی آٹھ صدی کی سلطنت کا خلاصہ یا خوش آئندہ نتیجہ تھا۔

آؤ ایک نظر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور صحابہ کے اعمال اور ہدایات پر ڈالیں اور دیکھیں آیا اسلام ایسا ہی سخت اور دشوار تر تھا جیسا علماء آج پیش کر رہے ہیں یا اس سے کہیں زیادہ سہل تھا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بیجا بیجا بحثوں اور غیر نتیجہ جھگڑوں سے بالکل پاک تھا، آپ نے کبھی ایسی تعلیم نہ دی جو گراں گزرتی ہو، آپ کے زمانہ سعود میں فقہا کی بحث کی طرح احکام میں بحث نہ ہوتی تھی، اور حقیقت میں اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ روحانی تعلیم جس نے عربوں کی تعلیم بدل دی اس کی کج بحثی سے بہت دور تھی جو فقہا کے زمانہ میں کی جاتی تھی۔ کوئی شخص ارکان شروط۔ آداب کو دلیل کے ساتھ جدا جدا ثابت نہ کرتا تھا۔ نہ صورتیں فرض کرتا تھا۔ نہ فرض کی ہوئی صورتوں پر کلام کرتا تھا، نہ قابل تعریف کی تعریف بیان کرنے کی انہیں فرصت تھی۔ نہ قابل حصر کا حصر کرنا جانتے تھے۔ یہ ساری باتیں ان کے منشار عالی میں خلل انداز تھیں۔ نبی اکرمؐ وضو فرماتے تھے صحابہ دیکھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے وہاں یہ بیان نہیں کیا جاتا تھا کہ وضو میں یہ فرض ہے یہ مستحب ہے۔ یہ فرضی باتیں اسلام سے بہت دور ہیں۔ مثلاً امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ وضو میں چار فرض ہیں اور امام شافعی ان چار میں دو اور بھی اضافہ کرتے ہیں یعنی نیت اور ترتیب۔ امام مالک بجائے ان کے موالاۃ کو فرض کہتے ہیں۔ امام احمد حنبل کا مذہب ہے کہ وضو کے وقت بسم اللہ کہنا ضرور ہے اور اگر قصداً نہ کہا تو وضو باطل ہے یہ کج بحثیاں نفس اسلام میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔

صحابہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے تھے اور خود بھی اسی طرح پڑھنے لگتے تھے۔ کیا مجال تھی ایسی جو کوئی بات دریافت کرتے جس سے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوتا اور وقت ضائع ہوتا۔ نبی اکرمؐ نے حج کیا۔ صحابہ نے بھی اسی طرح ارکان حج ادا کئے نبی اکرمؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ وضو کے چھ فرض ہیں یا چار نہ آپ نے یہ فرمایا کہ انسان بلا موالاۃ وضو کرے یہاں تک کہ اس پر فساد یا صحت کا حکم کیا جائے۔ صحابہ اس قسم کی غیر نتیجہ چیزیں دریافت ہی نہیں کرتے تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں میں نے کوئی قوم ایسی نہیں دیکھی

جو رسول اللہؐ کے اصحاب سے بہتر ہو۔ اُنہوں نے تمام زمانہ نبوت میں صرف رسول اللہؐ سے تیرہ مسئلے دریافت کئے اور وہ سب مسئلے قرآن مجید میں موجود ہیں۔ ان ہی میں سے ایک یہ مسئلہ ہے تجھ سے شہر حرام میں قتال کرنے سے سوال کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس نے فرمایا ہے "اصحاب کبھی نبی اکرمؐ سے ایسا سوال نہ کرتے تھے کہ جو اُنہیں منفعت نہ بخشے۔"

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں "ہم نے کبھی ایسا سوال نہیں کیا جس کا نفع دائمی نہ ہو" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص پر نفرین کی ہے جو ایسی چیز کا سوال کرے جو ناپید ہو۔ قاسم نے کہا "تم ایسی چیزیں دریافت کرتے ہو کہ ہم نہیں دریافت کرتے تھے اور تم ایسی چیزوں سے کاوش رکھتے ہو جن کی حقیقت ہم نہیں جانتے تھے اور اگر ہم اُنہیں جانتے تو ہم پر اُن کا چھپانا جائز نہیں تھا۔"

عمر بن اسحٰق نے کہا "جن اصحاب رسول اللہ سے میں ملا ہوں وہ ان اصحاب رسول اللہؐ سے اکثر ہیں جو پہلے گزر چکے تھے۔ میں نے خوب خوب غور کے بعد بھی کوئی قوم ایسی نہیں دیکھی کہ اُن سے سہولت میں زیادہ اور شدت میں کم ہو۔" عباس بن الکندی سے ایک مری ہوئی عورت کے باب میں سوال کیا گیا کہ اس کا کوئی ولی نہ تھا اس نے آزردہ ہو کے جواب دیا "میں ایسی قوموں سے ملا ہوں کہ وہ تمہاری طرح شدت نہیں کرتے تھے نہ ایسے مسائل دریافت کرتے جیسے تم دریافت کرتے ہو۔"

نبی اکرمؐ جب مسلمانوں کو نیکی کرتے دیکھتے تھے تو اس کی تعریف کرتے تھے اور اس خوش منظر سے پھولے نہ سماتے تھے، اور جب آپ بدی کرتے دیکھتے تھے تو عام۔۔۔ عام طور پر سب کو مخاطب بنا کے بیان فرما دیا کرتے تھے۔ یہاں یہ غضب ہے اگر کسی بھائی مسلمان سے کوئی خطا ہو گئی، اس پر فوراً کفر کا فتویٰ دیا جائے گا چاہے وہ بدبخت توبہ ہی کرے، ایک دفعہ تو اُسے کافر بنا دیا جائے گا مگر بانئ اسلام نے اپنی پیاری بیٹی بی بی رقیہ کے قاتل کو جب وہ مکہ فتح ہونے کے بعد گرفتار ہو کے آیا رحم کھا کے چھوڑ دیا اور ایک بھی حقارت انگیز کلمہ نہیں کہا۔

مسلمانوں کو ایسے جلیل القدر نبی کی تقلید کرنا چاہیے یا موجودہ زمانہ کے غصیلے اور بات بات پر منہ میں کف بھر لانے والے علمار کی۔

مولانا شہیدؒ نے ان مشکلات کو جو دین کے بارہ میں پڑ گئی تھیں دور کر دیا تھا اور مسلمانوں کو خدا کے احکام کا سچا پابند بنا دیا تھا۔ گور پرستی، تعزیہ پرستی، پیر پرستی کی شرمناک اور روحانی مضرت دہ تکلیفوں سے نکال کے اس ایک خدا کی پرستش سکھا دی تھی جس کا مصدق قرآن مجید ہے۔ آپ نے اس بیہودہ تعظیم و تکریم کو اڑا دیا تھا جو ہندوستان خصوصاً دہلی میں زیادہ رائج تھے اور سلام علیکم کہنے والے کے منہ پر پھپڑا لگا کرتا تھا۔

ممکن ہے کوئی آداب تسلیمات کورنش کے سوا کچھ اور کہہ سکتا۔ امیروں کے آگے دست بستہ کھڑے رہنا اور بات بات پر جھکنا ایک عبث اور ناجائز امر تھا جس سے شریعت غرانے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ اس کی تلقین مولانا شہید بھی کرتے تھے اور دن بدن بیہودہ تعظیم کی تقیدے لوگوں کو آزاد کرتے جاتے تھے۔

کل مومن آپس میں بھائی ہیں جہاں یہ حکم ہو وہاں پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے آگے دوسرا شخص دست بستہ اس طرح کھڑا ہو جیسے وہ خدا کے آگے کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔ "قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من سرہ ان یتمثل له الرجال قیاماً فلیتبوأ مقعدہ من النار" یعنے رسول اللہؐ نے فرمایا جس شخص کو یہ خوش آوے کہ لوگ اس کے آگے تصویر کی طرح کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں قرار دے۔"

یہ اسلامی ہدایتیں اور روشن باتیں ہیں جو مولانا شہیدؒ نے لوگوں کو تعلیم کی تھیں وہ والا شان آخرالزمان نبی جس کی پرجلال ذاتؐ نے تمام جہان کو اس کو نہ سے اس کو نہ تک منور کر دیا جس کی عظمت کے آگے دنیوی شہنشاہ پہاڑوں کے برابر ہیں ایسے جلیل القدر نبیؐ نے یہ حکم کر دیا تھا کہ جب میں آیا کروں کوئی کھڑا نہ ہوا کرے جیسا کہ اس حدیث میں آیا ہے (وقال لم یکن شخص احب الیھم من رسول اللہ صلعم وکانوا اذا راوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیۃ لذالک) کہ اصحاب کے نزدیک پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا۔ پھر بھی جب حضرتؐ کو دیکھتے تھے تو کھڑے نہ ہوتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں حضرتؐ کی

نا تونسی تھی‘‘۔ یہ صریح باتیں جب مولانا شہید بیان فرماتے تھے تو نافہم یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ رسول اللہ کا ذرا ادب نہیں کرتے، اس نافہمی اور کوڑھ مغزی نے یہاں تک ترقی کی کہ مولانا شہید پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا اور بہت دھوم دھام سے اسے شائع کیا گیا، اور اب تک اسی دماغ کے لوگ اُس پر بغلیں بجاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے کچھ بھی تعجب نہ کرنا چاہیئے وہ اگر اس سے بھی زیادہ کفر بکیں تو تھوڑا ہے یہ خوب سمجھ لیا جائے کہ جیسے آفتاب کی روشن کرنیں ہاتھ لگانے سے میلی نہیں ہوتیں۔ اسی طرح مولانا شہید کی ذات والا کی تابانی میں ایسے ایسے بے معنی الزامات سے کچھ دھندلا پن نہیں آتا۔ ہاں الزام قائم کرنے والوں کی ناتراشیدہ طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اسلام کو اگر سب ادیان پر فخر ہے تو اس بارہ میں کہ اس میں سہولت بہت ہے اور جب تک صحابہ اور خلفاء کی حکومت کا دور دورہ رہا۔ سہولت جوں کی توں بنی رہی، اور جب سے کوڑھ مغز مولویوں کے ہاتھوں میں دین کی باگ آئی ہے انہوں نے کوشش کر کر کے اور جان لڑا لڑا کے اس کو مشکل سے بھی زیادہ مشکل بنا دیا بلکہ اس سے بھی کئی درجہ آگے بڑھا دیا جس پر یہ شعر صادق آسکتا ہے۔

ملنا ترا نہیں اگر آسان تو سہل ہے　　　دشوار تو یہ ہے کہ وہ دشوار بھی نہیں

یعنے ہر شخص آج اسلام کو مخاطب بنا کے یہ کہتا ہے اے اسلام اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا تو یہ بات سہل تھی اور ہم اسے حاصل کر لیتے یعنے جب آسان نہ ہوگا تو مشکل ہوگا اور مشکل بات کوشش اور جانکاہی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر دشواری یہ آپڑی کہ وہ دشواری کے درجہ سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے پھر بھلا اس تک کون پہنچ سکتا ہے جو لوگ مسلمان ہیں اور پشتینی مسلمان ہیں ملانوں کی نوک جھوک سے ان کا دم ناک میں آگیا ہے صورت دیکھی اور کانپ گئے انہوں نے اول دن سے یہ سبق پڑھایا ہے کہ اگر وضو میں چار فرض تسلیم نہ کروگے تو کافر ہو جاؤ گے اور اگر حیلہ شرعی نہ کروگے تو فاسق ہونے میں تو شک ہی نہیں ہے یا اگر امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھی تو قطعی جہنمی ہو گئے یا پکار آمین کہی تو اشد کفر کے دائرہ میں آگئے یا رفع یدین کر لیا تو جہنم کا ساتواں درجہ رہنے کے لئے ملے گا۔ اس کے

علاوہ اور بہت سے قیود ہیں جن کی پابندی انسانی فطرت سے تو بہت بعید ہے۔ پھر کون خیال کرسکتا ہے کہ اسلام ترقی کرسکتا ہے اور پھر اسے ابتدائی صدیوں کا سا زمانہ حاصل ہو جائے گا۔

مولانا شہیدؒ نے اول ہی اول جب مسلمانوں کو ان بیہودہ قیود سے آزاد کرنا چاہا تو پہلا غضب ناک اور کریہہ الزام جو ان پر لگایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کرتا ہے اس لئے یہ شخص کافر ہے کیا نبی اکرم کا یہی ادب ہے کہ نبوتؐ اور بعثتؐ کی اصل حقیقت کو مٹا کے ہم کیا تو ناپاک جلسوں سے آپ کو یاد کریں اور ایک وہمی دلبر کی طرح ناک بھووں زلف گردن رخساروں وغیرہ کی تعریف کریں یا ایسے جملے استعمال کریں جو خدا ہی کی ذات کے لئے خصوصیت رکھتے ہیں ایسے ایسے ناپاک اور دائرہ کفر میں لانے والی باتوں سے مولانا شہید نے روکا تھا ہم کہتے ہیں اگر اسی کو کفر کہتے ہیں تو ہمیں ایسے کفر پر ناز ہے خدا کرے ہمارا دنیا سے اسی قسم کے کفر میں خاتمہ ہووے (آمین)۔

جہاں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بڑی شدومد سے خود منع فرمایا ہے کہ مجھے دیکھ کے میری تعظیم کو نہ اٹھو وہاں یہ غضب کیا جاتا ہے کہ مولود کی مجلسوں میں یہ خیال کر لیا جاتا ہے نبی اکرم قدم رنجہ فرما رہے ہیں اور معاً لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں حقیقت میں اگر غور کیا جائے کا تو نبیؐ عربی سے یہ زبردست ضد ہوئی کہ آپ تو سخت تاکید فرما رہے ہیں کہ میری تعظیم کو نہ اٹھو اور ہندوستان میں ہر جگہ زبردستی آپ کو ہر محلہ اور ہر ناپاک مکان میں ایک مولوی کے ذریعہ بلایا جاتا ہے، اور پھر سرتاپا کھڑا ہوا جاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی کھڑا نہ ہو اگر ایسا کیا بس اسی وقت سے کافر مطلق ہو جاتا ہے۔ تمام ہندوستان میں ایک ہی آن میں بیسیوں جگہ مولود ہوتا یہ بڑے تماشہ کی بات ہے کہ آن واحد میں رسول اللہ کو سب جگہ پہنچایا جاتا ہے یہ سخت گستاخی اور بے ادبی نہیں تو اور کیا ہے، اگر ہم ذرا بھی اپنے گریباں میں منہ ڈالیں تو دیکھیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اپنی جانوں پر کیا غضب ڈھا رہے ہیں۔ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ ہم ایک معمولی رئیس کو ہر بار بے تکلیف اپنے گھر پر نہیں بلاتے، کیونکہ ہمیں دو باتوں کا لحاظ ہے۔ اول تو ادب اور دوسرے اس کی ناراضی جب ایک دنی

دنیا کے کتے کا ہم اتنا ادب کرتے ہیں سخت غضب اور ماتم کا مقام ہے کہ شہنشاہ دنیا و دین کا ذرا بھی ادب نہ کریں۔ ہماری عقلوں پر افسوس بھلا ان افعال شنیعہ پر ہماری نجات کیونکر ہو سکے گی۔ کیا اسی منہ سے ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے امیدوار ہیں حیف ہے کہ ہم مفخر موجودات رحمت عالم کا ذرا بھی ادب نہیں کرتے جب جی چاہا اپنے دو تین فاسق اور سخت ناپاک دوستوں کی دعوت کی جن دوستوں میں کسبیاں بھی شامل ہوتی ہیں اور ایک کمبخت نابکار مولود کہنے والے کو آٹھ آنہ اور کھانا کھلانے کی خوشخبری دے کے بلا بھیجا اور پھر اس نے گدھے کی طرح ادھر اُدھر منہ پھاڑ کے کریہہ آواز نکالنی شروع کی اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی والا شان ذات میں ایسی ایسی باتوں کو آمیز کرکے دکھایا اور وہ وہ سخت تہمتیں اٹھائیں کہ سچے مومن کا زہرہ شق ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے نبی اکرمؐ جب معراج میں تشریف لے گئے ہیں تو آپ کے ساتھ چالیس ہزار فرشتے کافوری مشعلیں لئے ہوئے تھے کبھی عرش کی دوری گزوں اور پھر میلوں سے ناپی جاتی ہے کبھی خدا کو معطل بنا کے تمام کاروبار کی کنجیاں رسول اللہؐ کے ہاتھوں میں دی جاتی ہیں، کبھی شاہ عبدالقادر جیلانی کو رسول اللہؐ کا کارکن بنایا جاتا ہے ہمارا زہرہ نہیں ہے کہ ہم ان الفاظ کو خود بھی رسول اللہؐ کی شان میں استعمال کریں جو مولودیے اکثر کیا کرتے ہیں وہ کھانا جو مولود میں رسول اللہؐ کے نام پر پکایا جاتا ہے خدا کے نام پر اس کھانے میں سے ایک دانہ بھی نہیں دیا جاتا بلکہ جو شخص آٹھ آنے خرچ کرکے مولود کہلواتا ہے وہ اپنے حرام کار دوستوں کو بہت شوق سے کھلاتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اتفاقیہ ایسی ایک مجلس میں میرا ایک دوست جا پھنسا تھا اس نے ایک خون آلود نظارہ کا جو مجھ سے بیان کیا روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی، اور زہرہ شق ہونے لگا وہ بیان کرتے تھے کہ ایک شخص شریف صورت سفید لباس پہنے ہوئے دسترخوان پر آبیٹھا کہیں صاحب خانہ نے اسے دیکھ لیا اپنے دو منتظموں سے کہا اسے اٹھا دو وہ سخت بونگے پنے سے اسے اُٹھانے لگے اس نے آبدیدہ ہو کے کہا میں سید ہوں آج مجھ پر تیسرا وقت گزر چکا ہے میں نے سُنا ہے کہ مرتے وقت سُور کا گوشت بھی حلال ہو جاتا ہے۔ چلو اسی مجلس میں چل کے اپنا پیٹ بھر

ہے۔ پولیس اس تحقیق میں تکلیف برداشت نہ کرے کہ اس کو کسی نے مار ڈالا یا کسی بیماری سے مر گیا۔ فقط"

یہ چٹھی دیکھ کے خود افسر پولیس جو لندن نژاد تھا آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور اس پر جس نے ایسے باحمیت شخص کو دسترخوان پر سے اٹھایا تھا سخت نفرین کرتا رہا اس حکایت سے یہ اندازہ ہوجائے گا کہ نبی اکرمؐ کی ان مسلمانوں کے دلوں میں جو اپنے آگے دوسرے مسلمان بھائیوں کو کافر مطلق خیال کرتے ہیں کتنی محبت ہے اور وہ کہاں تک اس میں خدا کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔ یہی لوگ نبیؐ عربیؐ سے سچا فدایانہ عشق رکھتے ہیں، اور اسی منہ سے یہی رسولؐ اللہ کے سچے عاشق بنے ہیں پہلے تو یہ فرض تھا کہ خدا کو واحد جاننا۔ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کو برگزیدہ آخرالزمان نبیؐ تسلیم کرنا، نبیوںؑ اور ان کی کتابوں پر اعتقاد رکھنا، روز جزا کا یقین، فرشتوں کو ماننا بس جہاں کسی نے ان باتوں کو تسلیم کر لیا وہ مسلمان ہوگیا پھر چاہے وہ جو کچھ کرے گا اس کے ایمان میں کچھ فرق نہیں آسکتا گو وہ گناہ گار ضرور ٹھہرے گا، اور اس گناہ کی اسے سزا ضرور ملے گی۔ مگر اس زمانہ میں اور بھی بہت سی باتیں بڑھانی پڑینگی تاکہ کامل مسلمان ہوسکے، کسی پیر کا مرید ہونا، کسی قبر سے حسن اعتقاد رکھنا قبروں کا طواف کرنا برسویں دن کسی بڑے عرس میں شریک ہوکے پھولوں کی چادر یا دو ایک کھانے کی دیگیں چڑھانا، ایک نہ ایک قوالی کی مجلس کرنا۔ قوالوں کی اے وائے اسے وائے پر مٹکنا، گیروا کپڑے پہننا، لمبی لمبی زلفیں بڑھانا، مولانا روم کی مثنوی کا قرآن کی طرح حفظ یاد ہونا، شمیدی کا سراپا رسول مقبول کا برزبان یاد ہونا، ہر قبر کو دیکھ کے اس کے آگے سجدہ کرنا، جمعرات کو مُردوں کی فاتحہ دلوا کے کسی ملانے کی نذر کرنا۔ برسویں دن ضرور اپنے گھر میں مولود کہلوانا، اہل حدیث پر ہر نماز کے بعد دو تین تبرّے بھیج دینا، رسول اللہؐ کی ذات اقدس پر نئے نئے بہتان قائم کرکے ان کا درجہ خدا تک پہنچا دینا، جھوٹی اور مردود حدیثوں کو جنہیں بالاتفاق سب مردود ٹھہرا چکے ہیں رسول اللہؐ کی طرف عائد کرنا، اور بار بار زور دے دے کے یہ بیان کرنا رسول اللہؐ یہ فرماتے ہیں۔ ہر پیر، شہید، ولی کو شفیع روز آخر اور عالم غیب سمجھنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ آنحضرت کی طرح یہ بھی معجزہ دکھا سکتے ہیں۔ پیر کے

ہاتھ پر بیعت کر کے تمام مذہبی باتوں سے آزاد ہو جانا، شاہ عبدالقادر جیلانی کی نماز پڑھنا، ہر پیر کو رسول اللہ سے زیادہ درجہ عطا کر دینا جیسا نور الابصار والے نے اپنے پیر کی مدح میں اشعار لکھے ہیں اور یہ ظاہر کر دیا ہے کہ حقیقت میں یہی بات ہے اسے شاعرانہ مبالغہ کبھی نہ سمجھا جائے ان میں سے چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں۔

فروغ مشرب و ملت تمہاری ذات عالی سے
بڑھا جلوہ تمہارے فیض سے شرع محمدؐ کا
مسیح چرخ عرفان ہے کلیم طور وحدت ہے
تعالی اللہ کیا رتبہ ہے اس ذات مفرد کا
بنائے دین و ایمان ہاتھ سے تیری ہوئے محکم
کیا معمار حق نے تم کو ارکان مشید کا
تیرے کوچہ (کوچہ) کے پتھر سے کسے امکان دعوی ہو
لبوں تک نام دشواری سے آیا سنگ اسود کا
پڑا گردش میں وہ جس سے نظر تیری پھری شاہا
ٹھکانا ہی نہیں لگتا ہے اس کے اختر بد کا
جو منکر ہے ولایت کا تری وہ منکر حق ہے
بعینہٖ ماجرا یہ ہے ابو جہل اور محمدؐ کا
لکھا ہے وصف میں نے جو مری نظروں سے گزرا ہے
نہ انداز خیالی ہے نہ مضمون ہے خوشامد کا
تلطف سے عنایت کی نظر مجھ پہ ہو اے شاہا
بھروسا ہے فقط مجھ کو ترے الطاف بیحد کا
غلام بارگاہ آسمان رفعت عمر عاجز
بحمد اللہ مجاور میں ہوا قصر زمرد کا

(از نور الابصار مطبوعہ نصرۃ المطابع دہلی صفحہ ۲۶۹)

اب میں عام مسلمانوں کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ آیا ان مذکورۂ بالا اشعار کے ہر ہر مصرع سے کفر پایا جاتا ہے یا نہیں - اگر کچھ بھی حمیت اسلام باقی ہے اگر ذرا بھی اُمی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی شرم آنکھوں میں ہے اگر کچھ بھی اثر ہاشمی گرم گرم مصفا خون کا رگوں میں باقی ہے اگر قرآن مجید اور اس کے احکام کی کچھ بھی عزت کرتے ہو تو بول اُٹھو، اے دکھن اور اُتر کے رہنے والو بول اُٹھو، اے پورب اور پچھم کے رہنے والو بول اُٹھو، اے بوڑھو جوانوں، بچو بول اُٹھو، اے وہ لوگو جو دین اسلام کو حق سمجھ کے مسلمان ہوئے ہو قسم ہے تمہیں اس خدائے بزرگ کی جس نے تمہاری ہدایت کے لئے اپنا پیارا نبی مبعوث فرمایا کہ یہ مذکورۂ بالا اشعار کیا محض معمولی مسجد کے ملا نے سوکھی جھگڑی کی تعریف میں موزون ہو سکتے ہیں میں کہتا ہوں تمام جہان کا بھی فاضل اجل اور ولی کامل ہو پھر بھی اس پر ان شعروں کے ایک مصرع کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً پہلے ہی شعر میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے ع

بڑھا جلوہ تمہارے فیض سے شرع محمدؐ کا

شریعتِ محمدی کا جلوہ بڑھانے والا سوائے ذات خدا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، ایک کامل نور کامل روشنی کا جلوہ دوسری چمک سے کیا بڑھ سکے گا آفتاب کے آگے سب کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے یہ آج تک کسی کی زبانی نہیں سنا کہ آفتاب کی روشنی کی زیادہ ترقی کے باعث ستارے یا سیارے وغیرہ بھی ہیں جو اپنی دھیمی دھیمی شعاؤں سے اسے کچھ نہ کچھ فیض پہنچاتے ہیں - استغفراللہ توبہ توبہ اس طرح شریعت محمدی کی کبھی کی تکمیل ہو چکی اس میں ہرگز کوئی کسی قسم کا نقص نہیں ہے اس کی تابانی یا درخشانی کامل ہو چکی ہے بھلا اسے کوئی کیا جلوہ دے گا؟ قرآن میں یہ تو فرمایا گیا ہے ہم تیرے دین کی تکمیل کر چکے اور اپنی نعمت تجھے دے چکے وہاں تیرہ صدی تک شریعت محمدی تاریک گڑھے میں پھنسی رہی جب ایک صاحب مسجد میں پیدا ہوئے تو انہوں نے شریعت محمدی کا جلوہ اپنے فیض سے بڑھایا۔ ہائے کتنی زبردست نبی عربی کی توہین ہوئی ہے پھر اور لو ع

بنائے دین وایماں ہاتھ سے تیرے ہوئی محکم

اب میں کہاں تک اس سخت کفر پر ریمارک کر کے اسے اور چمکاؤں صرف سمجھدار اور

منصف مسلمانوں کے انصاف پر چھوڑتا ہوں۔

غرض جو جو قیود کہ آج کل مسلمان ہونے کی پیش کی جاتی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ مولانا شہیدؒ نے چاہا تھا کہ ان تمام قیود سے مسلمانوں کو آزاد کر دوں جن قیود میں کتنی بڑی سختی یہ ہے جو ہمارے پیر جی صاحب نے لگائی ہے اور وہ مفصلہ ذیل ہے "جو منکر ہے ولایت کا تیری وہ منکر حق ہے، بعینہٖ ماجرا یہ ہے ابوجہل اور محمدؐ کا" اب بڑی مشکل آپڑی ہے کہ مسلمان ہونے میں ایک یہ بھی شرط ہے کہ آخوند جی صاحب کی ولایت کا قائل ہو ورنہ اس کی نسبت رسول اللہؐ سے ایسی ہو جائے گی جو ابوجہل سے نبی کو تھی جو لوگ پہلے گزر گئے دیکھئے ہمارے پیر جی انہیں بھی مسلمان تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔

میں دریافت کرتا ہوں اگر ان اشد کفریات پر مولانا شہیدؒ نے فرمایا اور لوگوں کو اس تاریک زندگی سے نجات دی تو اس کا صلہ وہ کفر کا فتویٰ ہو گا جو مولانا شہیدؒ پر لگایا گیا ہے اور مدت تک اس کی خوب اشاعت دی گئی گو اب مخالف بھی سر جھکاتے اور مانتے جاتے ہیں اور ان کے فاسد خیالات کی بہت کچھ اصلاح ہوتی جاتی ہے۔ پھر بھی ابھی اس قسم کے لوگ باقی ہیں جن کے اشعار اوپر نقل ہوئے اور یہ کوئی معمولی صاحب نہیں ہیں بلکہ ان کے مرید پانچ چار ہزار آدمی ہوں گے جو ان کے ہر ہر قول پر جان دیتے ہیں اور نور الابصار کا ہر ہر لفظ قرآنی الفاظ کے ہم پلہ سمجھتے ہیں۔

بھائیو! اسلام ان تمام بیہودگیوں سے پاک ہے۔ توحید اسلام کا بہت بڑا رکن ہے جو پابندیاں اور قیدیں کہ اور مذہبوں میں لازمی قرار دے دی گئی ہیں اور یقین کر لیا گیا ہے کہ بغیر ان کے نجات ہی ممکن نہیں، اسلام ان تمام باتوں کو ناکارہ بتاتا ہے۔ وہ انسان کی فطرت کے موافق اسے ہدایت کرتا ہے۔ اس کے توانین قوانین قدرت کے بالکل مشابہ ہیں اور ذرا بھی فرق نہیں ہے نفس اسلام نہیں کہتا کہ ابوحنیفہ کی اگر تقلید نہ کی تو میں اپنے میں سے خارج کر دوں گا یا شافعی، حنبلی، مالکی نہ بنے تو میرے فرزند نہیں ہو بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ خدا کو واحد جان لو، اسی کو مشکل کشا سمجھ لو، محمدؐ کو اس کا آخر الزمان نبیؐ مان لو بس بیڑا پار ہے۔ جو احکام قرآن مجید میں آگئے ہیں اور جن کا بیان حدیث نبوی میں موجود ہے اس کی پابندی کرو کیونکہ

یہ پابندی عین آزادی ہے۔ نجات کے لئے نہ کسی پیر سے بیعت کرنے کی ضرورت ہے نہ کسی وظیفہ پڑھنے اور کسی قبر پر جانے نہ کسی سے دعا کرانے کی ہر مسلمان بجائے خود ایک شخ ہے کہ اسے مذہبی ارکان اداکرنے میں کسی مولوی، عالم، پیر کی ضرورت نہیں ہے وہ اور مذہب کے پنڈتوں اور پادریوں کی طرح مولویوں کا مقید نہیں ہے وہ خود قرآن کے موافق اپنا جج بن سکتا ہے، اور خود ہی اپنے کو سزا دے سکتا ہے۔ یہی مولانا شہیدؒ کی تلقین تھی جن لوگوں نے سمجھ لیا یا جو لوگ سمجھتے جاتے ہیں وہ تو آرام اور اطمینان سے ہو گئے اور جنہوں نے نہیں سمجھا وہ گھبرائے ہوئے ادھر اُدھر قبروں اور پیروں کے پاس پڑے پھرتے ہیں اور پھر ان کی تشنگی نہیں بجھتی۔ اسلام اور کفر کے دو راستے کھلے ہوئے ہیں جس کو جو بھلا معلوم ہو اس پر چلے کوئی منع کرنے والا نہیں ہے مگر آئندہ زندگی میں جو کچھ جزا و سزا اس کی ملے گی وہ اپنی ہی ذات پر اٹھانی پڑے گی، اور وہی سخت عذاب درد دینے والا ہے۔ خدا ہر متنفس کو اس سے بچائے بدگمانی کو دل سے نکال ڈالو، اور اسلام کے سچے متبع بن جاؤ۔ اب میں یہاں سے پیارے شہیدؒ کی تصانیف کا ذکر نہایت اختصار کے طور پر کرتا ہوں۔

سولہواں باب

مولانا شہیدؒ کی تصنیفاتؒ، اور بعض خط!

مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحبؒ کی تصنیفات جو خاص خاص موقعوں پر نہایت ضرورت کے وقت لکھی گئیں بے نظیر یادگار شہید کی ہیں۔ آپ کی سوانح عمری کا دیکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی جو خیال آپ پر غالب آگیا اور جس کی دھن میں آپ نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صرف کر دیا اور آخر اسی میں شہید ہو گئے، ایسا نہ تھا کہ چوبیس گھنٹے روز و شب میں کوئی اطمینان کا وقت نکلتا، اور آپ کسی حجرہ میں بیٹھ کے تصنیف کی کارروائی شروع کرتے۔

فطرت نے پیارے شہیدؒ کو تصنیف و تالیف کرنے ہی کے لئے پیدا نہ کیا وہاں کام ہی ایک عظیم الشان لینا تھا جو اور کسی سے کبھی نہ ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ تحصیل سے فارغ ہو کے مولانا شہیدؒ کا تفسیر قرآن لکھنے کو جی چاہا تھا اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے چچا جان کی خدمت میں عرض بھی کیا تھا کہ میں تفسیر لکھنا چاہتا ہوں شاہ صاحب نے فرمایا تھا بیٹا تفسیریں تو بہت سی موجود ہیں اگر تفسیر لکھنے کا ارادہ ہو تو کوئی نئی بات پیدا کرو اور اگر نئی بات نہ ہو سکے تو بے فائدہ ہے۔ مولانا شہیدؒ نے عرض کیا تھا کہ وہ کونسی بات قابل لحاظ ہو جس سے تفسیر میں نیا رنگ پیدا ہو جائے۔ شاہ صاحب نے ارشاد کیا بیٹا کچھ پرانی ادب کی کتابیں شعرائے متقدمین کا کلام اور محاورۂ عرب دیکھو اور پھر قرآنی محاورہ اور ہمعصروں کی تحریروں سے اسے تطبیق دے کے دیکھو، اسی طرح کی بہت سی نئی نئی باتیں جب تفسیر لکھنے بیٹھو گے نکل آئیں گی۔ مولانا شہیدؒ نے اسی دن سے شاہی کتب خانہ سے جتنی کتابیں ادب وغیرہ کی مل سکیں انہیں بغور پڑھا اور ان کے مطالب اور محاورات کو دل میں جگہ دی یہ سن کے تعجب ہوگا کہ آپ کو دو ہزار اشعار شعرائے عرب کے نوک زبان تھے۔

مگر یہ بیت درست ہے ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ فطرت نے پیارے شہیدؒ کو بنی نوع کی اصلاح اور ظالموں سے انتقام لینے کے لئے پیدا کیا تھا اسے منظور نہ تھا کہ ایسا جوہر فرد حجرہ میں بیٹھ کے تصنیف کی دھن میں کبھی ڈاڑھی نوچنے لگے اور کبھی کسی مطلب کے سوچنے کے لئے منہ پیٹنے لگے، کبھی زچ ہو کے دوات وقلم اٹھا کے پھینک دے۔ حقیقت میں مصنفوں کی حالت جب وہ تصنیف کرنے بیٹھتے ہیں بالکل مجنوں کی سی ہوتی ہے۔ مولانا شہید نے پانچ چھ مہینے تو اس میں صرف کئے مگر آخر کار جس رستہ پر چلنے کے لئے فطرت نے بنایا تھا وہ ہی راہ اختیار کی اور تصنیف وتالیف کا خیال تک بالکل چھوڑ دیا۔

پھر بھی جو کتابیں حسب ضرورت مولانا نے لکھی ہیں یا یہ کہو کہ ان کے بعض وعظوں کا خلاصہ ہے وہ مفصلہ ذیل ہیں۔

تقویۃ الایمان:۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ عجیب دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے وہ باتیں جو اُس وقت مسلمانوں میں رائج تھیں اور جس سے اسلام شرک، میں کھچڑی ہو رہا تھا انہیں اس طرح علیحدہ کر کے دکھا دیا اور قرآن وحدیث سے ان کی ایسی تردید کی کہ ہوا کا رُخ ادھر سے اُدھر پھر گیا۔

یہ لاجواب رسالہ جس کی شہرت دریائے جمنا سے فرات تک بہت مقبولیت سے پھیلی ہے ایک عجیب جوہر ہے جس میں سچا اسلام اور ایمان اپنی تابانی دکھا رہا ہے۔ سوائے قول خدا اور حدیث رسول اللہ کے نہ کسی امام کا قول نقل ہے اور نہ کسی مجتہد کا نہ اپنا مطلب ظاہر کرنے کے لئے کچھ منطق وفلسفہ کا خرچ کیا گیا ہے نہ شاعرانہ جامہ عبارت کو پہنایا گیا ہے۔ سادی سادی عبارت اور چھوٹے چھوٹے جملے اور عام فہم الفاظ معمولی بول چال کے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا بھی بآسانی سمجھ کے اپنے دینی خیالات اس سے درست کر سکے۔ ملائی پیچیدہ اور قریب قریب لاینحل عبارت جس سے بالکل مطلب خبط ہو جاتا ہے اس میں کہیں نام کو نہیں پائی جاتی ہے بہت بڑا کمال جو اس کتاب میں رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ چھوٹے رسالہ میں تمام وہ مطالب جن سے دین اسلام صاف ہو کے اور نتھر کے شرک وبدعت میں سے نکلتا ہے بالتفصیل درج کر دئے گئے ہیں جن کا یہ مطلب ہے کہ اگر ان پر عمل کر لیا تو دونوں جہان میں بیڑا

پار ہے ہیں خیال کرتا ہوں کہ کوئی بات بھی ایسی نہیں چھوڑی کہ جو ہندی مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا نہ ہو اور اس سے اخلاق نہ بگڑتے ہوں اور دین میں رخنہ نہ پڑتا ہو۔ تمام وہ مکروہ بدعتیں جنہوں نے مسلمانوں کا ستیا ناس کر دیا تھا اور ان کی گھٹی میں پڑ گئی تھیں اور تمام وہ شرکیں جنہوں نے قرآن و حدیث کے منشا کو بالکل پلٹ دیا تھا۔ اس خوبصورتی سے ان کی قرآن و حدیث سے تردید کی گئی جس کی مثال کوئی اور کتاب نہیں معلوم ہوتی۔ صدہا کتابیں اِن مضامین میں دیکھنے میں آئیں وہ ایسی طول طویل اور ادق ہیں کہ اول تو ان کا مطلب مشکل سے کھلتا ہے اور دوسرے عام ہدایت ان سے نہیں ہو سکتی کیا ہوا اگر فی ہزار ایک شخص دشواری سے اس کی تہ تک پہنچا ایسی کتاب کا اسلامی دنیا میں عدم وجود سب برابر ہے یہ بہت درست ہے کہ اگر تقویۃ الایمان نہ ہوتی تو جو اصلاح مسلمانوں کی معاشرانہ زندگی میں ہوئی ہے کبھی نہ ہوتی اور خبر نہیں مسلمانوں پر کتنی آفتیں نازل ہوتیں اور کیا کیا غضب الٰہی اُن پر اُترتا۔ جو کچھ روشنی اس وقت ہندوستان میں دکھائی دیتی ہے اور جس سے اسلام اسلام معلوم ہوتا ہے سب اس ہی کتاب کا صدقہ ہے اب تک اس کی اشاعت چالیس پچاس لاکھ کے قریب ہو چکی ہے اور دن بدن ہوتی جائے گی۔ یہاں سے اس کی مقبولیت کا پورا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بڑے بڑے معرکہ کے مضامین چند ہی الفاظ میں اس طرح ادا کر دیئے ہیں اور انہیں صاف کر کے دکھا دیا ہے کہ سخت تعجب آتا ہے اور زیادہ حیرت یوں ہوتی ہے کہ جب ملّا نے ان مضامین پر کچھ لکھتے ہیں تو صدہا صفحے سیاہ کر جاتے ہیں مگر مطلب ہی نہیں کھلتا کہ لکھ کیا رہے ہیں آئندہ کیا لکھیں گے بحث طلب کونسا امر ہے۔ مثلاً ایک مشہور و معروف مسئلہ کو پیارا شہید سادے لفظوں اس آیت قرآنی کے تحت میں یہ لکھتا ہے۔

قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللہ لا یملکون مثقال ذرۃ فی السمٰوٰت ولا فی الارض وما لھم فیھما من شرک وما	"کہہ بھلا پکارو تو اُن لوگوں کو کہ خیال کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے سو وہ تو ایک ذرہ برابر بھی آسمانوں اور زمین میں اختیار نہیں رکھتے اور نہ اُن کا اُن دونوں میں کچھ ساجھا ہے اور نہ اُن میں سے

له منهم من ظهير ٭ ولا تنفع الشفاعة عنده الا لمن اذن له حتی اذا فزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربکم قالوا الحق وهو العلی الکبیر۔
(سُوْرَةُ النَبَا)

اللہ تعٰ کا کوئی بازو ہے کسی کی سفارش اس کے رُوبرو کام نہیں آتی مگر جسے وہ خود سفارش کرنے کی پروانگی عطا فرمادے یہانتک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا کہتے ہیں کہ حق اور وہی ہے بلند بڑا۔"

کسی قسم کی شفاعت پر بحث فرما کے آپ یہ تحریر کرتے ہیں (دھو ھذا)

"جو کوئی کسی نبی یا ولی کو یا امام اور شہید کو یا کسی فرشتہ کو یا کسی پیر کو اللہ تعٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے سو وہ اصل مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے معنے کچھ بھی نہ سمجھے اور اس مالک الملک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی، اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُنْ سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن و فرشتہ جبرئیل اور محمد صلعم کے برابر پیدا کر ڈالے اور ایک اور ہی عالم اس جگہ قائم کرے کہ اس کے تو محض ارادے ہی سے ہر چیز ہو جاتی ہے کسی کام کے واسطے کچھ اسباب اور سامان جمع کرنے کی کچھ حاجت نہیں۔" (از تقویۃ الایمان)

اس لکھنے پر کہ خدا محمد صلعم جیسے اور بھی نبی پیدا کر سکتا ہے خر دماغ ملانوں میں طوفان بے تمیزی برپا ہو گیا، اور انہوں نے اپنی بھونڈی عقلوں کے صدقہ میں جو کچھ ان کی بونگی طبیعت نے گواہی دی، الٹے سیدھے رسالے لکھ ڈالے اور خدا کی عظیم الشان قدرت کو توڑ مروڑ کے اپنے تنگ و تاریک مسجد کے حجرہ میں مقید کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے اس رب کو جس کا قرآن شاہد ہے اتنی قدرت ہے کہ اگر چاہے تو آن کی آن میں موجودہ دنیا کے ہر متنفس کو محمد صلعم کے برابر رتبہ دے سکتا ہے۔ پھر بھی اس کی لاانتہا عظمت اور لازوال شوکت میں ذرا بھی تفاوت نہیں آسکتا۔ اگر اسلام مٹ جائے اور ہر شخص ابوجہل بن جائے تاہم اس کی عالیشان عزت اور لامحدود رفعت میں ایک تل برابر بھی فرق

نہیں آسکتا نظامی کی یہ سخت اس جبار قہار کے ساتھ سوء ادبی اور خیرہ چشمی ہے کہ وہ اپنے سکندرنامہ میں خالق کون و مکان کو مخاطب بنا کے یہ کہتا ہے ؎

گناہ من از نامدے در شمار　　ترا نام کے بودے آمرزگار

اس سے شاعر کا کچھ ہی مطلب کیوں نہ ہو مگر ظاہر الفاظ سے سراسر بے ادبی پائی جاتی ہے۔ اگر انسان ذرا بھی غور کرے تو اسے ادنیٰ توجہ کے بعد خود ہی معلوم ہو جائے کہ پانی کی جو صفت ہے یعنی پیاس بجھانا وہ اس میں ہر حالت میں باقی رہے گی خواہ تمام جہان اس کا استعمال کرنا چھوڑ دے اگر کوئی پانی کو مخاطب بنا کے یہ کہے کہ تیری یہ پیاس بجھانے کی صفت جب تک مسلم ہے کہ ہم استعمال کرتے ہیں اگر ہم نہ کریں تو تیری یہ صفت کبھی بھی نہ رہے۔ بے جا بحتر اور نا ملایم نازہ ہے۔ اسی طرح یہ سمجھنا کفر ہے کہ خداوند تعالیٰ میں یہ قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ محمد عربی جیسے نبی پیدا کر سکے استغفر اللہ لاحول ولا قوۃ اس سے زیادہ کفر بلکہ اشد تاریک تر اور غلیظ کفر ہو نہیں سکتا، ایسے ہی کم عقل لوگوں کے بہک جانے کے لئے قرآن کریم میں نبی عربی کی صاف طور پر حقیقت نبوت کھول دی گئی ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے "نہیں ہے محمد مگر رسول یا قاصد" دوسری جگہ فرمایا ہے "کہہ اے محمدؐ میں تمہاری طرح ایک آدمی ہوں" پھر ارشاد ہوا ہے "میں صرف ایک بشیر اور نذیر ہوں" ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے نبی اور نبوت کی حقیقت صاف طور پر کھلتی ہے۔ ان بیّن آیتوں پر نظر کرنے کے بعد بھی اپنی ناکارہ عقول کے صدقہ میں اگر ہم نبی کو معاذ اللہ خدا کے ہم پلہ ٹھہرادیں تو ہمارا ٹھکانا سوائے جہنم کے اور کہاں ہو سکتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے جو قوانین قدرت منضبط کئے ہیں ان کے خلاف کرنے کی اُسے عادت نہیں ہے مثلاً اس میں قدرت ہے کہ بغیر شوہر کے ہر کنواری کے پیٹ سے بچہ پیدا کر سکتا ہے اور بغیر بادل کے پانی برسا سکتا ہے اور بغیر پانی کے ڈبو سکتا ہے اور بغیر آگ کے جلا سکتا ہے اور بغیر زبان کے بلوا سکتا ہے اور بغیر پیروں کے چلا سکتا ہے اور بغیر تلوار کے کاٹ سکتا ہے مگر یہ ساری باتیں اس کی عادت میں نہیں ہیں وہ اپنے قوانین قدرت کے خلاف جو اس نے اول دن سے مقرر کئے ہیں کبھی نہیں کرتا نہ اُس نے آج تک کیا۔ کیا

اس میں یہ قدرت نہیں ہے کہ بغیر انبیاء علیہم السلام کے مبعوث کئے دنیا کو ہدایت کا رستہ دکھا دیتا اور جہان میں کسی متنفس پر شیطان کا غلبہ نہ ہوتا مگر اس کے قوانین قدرت کے خلاف یہ ساری باتیں پڑتی ہیں، اس لئے اُس نے سب قسم کے اسباب جمع کر دیئے اور ایک ایسا باغ لگا دیا جہاں گلاب اور موتیا کے تختے بھی ہیں تو ستیا ناسی کے بھی درخت ہیں جہاں بُلبلیں چہچہا رہی ہیں، بوم بھی نوبت زنی کرتا ہے، اسی طرح پیغمبر آخر الزمان کی مثل پیدا کرنے کی اس میں قدرت باقی ہے مگر عادت نہیں ہے جب اس نے نبوت کا خاتمہ ایک مقدس معصوم نفس پر کر دیا اب اسے ضرورت نہ رہی کہ پھر بھی ایک اور نبی اپنے وعدہ کے خلاف ایسا پیدا کرے اس صورت میں یہ سمجھنا کہ اس میں مثیل محمدؐ پیدا کرنے کی قوت نہیں ہے صریح کفر میں پڑنا ہے۔ یہی مراد مولانا موصوف کی ہے جس پر سخت رد و قدح کی گئی یہاں تک کہ بعض کوتاہ اندیش دور از اسلام ملانوں نے آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اس پر بھی ہمیں کچھ افسوس اور استعجاب نہ کرنا چاہیئے۔ جہاں خدا کو نہ بخشا اور اس کی بیوی اور بیٹا ٹھہرا دیا جہاں نبیؐ پر فریبی اور جادوگر ہونے کا الزام قائم کیا گیا جہاں صحابائے کبار کو غاصب ٹھہرایا گیا۔ جہاں علمائے اسلام مثلاً امام غزالیؒ اور اور علماء پر فتویٰ کفر لگایا گیا وہاں بیچارے شہید کی کیا اصل ہے۔

الحمدللہ کہ موجودہ زمانہ کی رفتار نے پُرانے ڈھکوسلوں کی جو کسی زمانہ میں وحی سمجھے جاتے تھے بہت کچھ قلعی کھول دی ہے اور دن بدن ان کی عقدہ کشائی ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مسجد کے تنگ و تاریک حجروں اور باڑوں کی غلیظ کوٹھریوں میں بیٹھ کے ہم جہاں کا فیصلہ کیا کریں اور ایک طرفی ڈگری دیا کریں۔ ملانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اب ان کی اتنی ہستی بھی نہیں مانی جاتی جتنی ادنٰے سی ادنٰے خدا کی مخلوق کی ہو، اگر مسلمان اپنی اولاد کی بہتری چاہتے ہیں اور انہیں مشرک اور بدعتی بنانا نہیں چاہتے تو انہیں فرض ہے کہ قرآن کے بعد وہ معصوم بچوں کو تقویۃ الایمان پڑھائیں۔ اگر اب اُنہوں نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا چند روز کے بعد زمانہ خود انہیں مجبور کرے گا کہ وہ ایسا ہی کریں لاکھوں کتابیں عربی میں ترجمہ ہو کے عرب میں بھیج دی گئی ہیں جن کو عرب سوسائٹی میں چاہت سے پڑھا جاتا ہے۔

اور دلچسپی سے اس کے مطالب کو دل میں جگہ دی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں زیادہ زور توحید پر دیا گیا ہے مگر قرآنی توحید میں ملانوں نے شرک کی ایسی آمیزش کردی تھی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا یا علیحدہ کرنا مشکل پڑ گیا تھا مگر خدا مولانا موصوف کو جنت میں مدارج اعلیٰ عطا فرماوے کہ انہوں نے صاف صاف کھول دیا اور توحید و شرک کو بالکل علیحدہ اور جدا جدا کر کے دکھا دیا۔

تقویۃ الایمان کے دو حصے ہیں ایک تو مولانا شہیدؒ نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور دوسرا حصہ آپ کی وفات کے بعد محمد سلطان خاں صاحب نے ترتیب دیا ہے مگر مطالب وہی درج ہیں جو پیارے شہیدؒ کے ہیں یہ سمجھنا چاہیئے گویا پیارا شہید لکھواتا گیا اور محمد سلطان خان لکھتے گئے۔ اس سے بہتر نبی، ولی، پیر شہید کی حقیقت اور کسی کتاب میں کم ملے گی جیسی تقویۃ الایمان میں پائی جاتی ہے۔ ایک انمول گوہر ہے جس کی تابان شعائیں جمنا سے فرات تک پڑ رہی ہیں اور امید ہے کہ آئندہ باسفورس تک اسلامیوں کی فصیلوں کی سنہری قبوں اور شاخ زرین یا گولڈن ہارن کے طلائی کنگروں پر پڑیں گی۔

دوسری کتاب تنویر العینین ہے یہ کتاب دراصل اس بیہودہ شور و شر مٹانے کے لئے لکھی گئی ہے جو ملانوں میں رفع یدین کی بابت پڑا ہوا تھا ایک گروہ صرف اس فرعی اختلافی مسئلہ میں ایک دوسرے کو کافر کہتا تھا جو شخص رفع یدین کرتا تھا وہ اپنے اس بھائی مسلمان کو جو رفع یدین نہ کرتا ہو مسلمانی سے خارج جانتا تھا اس طرح نہ کرنے والا شخص کرنے والے کو کافر سمجھتا تھا۔ مولانا شہید نے اس بیہودہ شورشیں اور ہولناک غلط فہمی کو اڑا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ کوئی شخص رفع یدین نہ کرے تو اس پر کچھ بھی گناہ نہیں ہے اور اگر کرے تو ثواب ہے کیونکہ طرفین کے دلائل اس مسئلہ میں قوی ہیں۔ اس سے زیادہ فیصلہ کرنے والا اور کون منصف جج ہو سکتا ہے؛ بھلا صریح حدیثوں کی جو مولانا نے لکھی ہیں تردید کیا ہو سکتی ہے مگر ملانوں نے اسے بھی نہ بخشا جب وہ اسلام کے برباد کرنے کے لئے آستین چڑھا بیٹھے ہوئے ہیں پھر وہ احادیث نبویہ کی تردید کیوں نہ کریں گے۔ مولانا شہید نے حدیثوں سے ثابت کیا ہے کہ افضل رفع یدین ہی کا کرنا ہے اور نہ کرنے والا گناہ گار نہیں ہیں نہیں جانتا

کہ اتنا لکھنا وہ غضب ہو گیا کہ اس کی تردیدیں ہونے لگیں اور ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ اس افسوس ناک نظارہ سے ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اسلام کی ملانوں کے ہاتھوں کیا بُری گت بنی ہے اور یہ لوگ کیسے بدنام کنندہ نیکو نامے چند ہیں۔ اب ہم رفع یدین کے بارے میں تنویر العینین سے نقل کر کے ناظرین کو دکھاتے ہیں کہ مولانا کی دین کے معاملہ میں کیسی دھیمی طبیعت ہے اور وہ رفع یدین کے بارے میں کن انقطائی سموئے ہوئے انصاف پسند الفاظ میں فیصلہ کرتے ہیں چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

الحق ان رفع الیدین عند الافتتاح والرکوع والقیام منہ والقیام الی الثالثۃ سنۃ غیر مؤکدۃ من سنن الہدیٰ فیثاب فاعلہ بقدر ما فعل ان دائما فبحسبہ وان مرۃ فبمثلہ ولا یلام تارکہ۔

”حق یوں ہے کہ دونوں ہاتھوں کا اٹھانا تکبیر تحریمہ رکوع سے کھڑے ہونے دو رکعتوں سے تیسری کی طرف کھڑے ہونے کے وقت سنت غیر موکدہ ہے یعنی ایسی سنت ہے جس کی تاکید نبی عربیؐ نے نہیں فرمائی، سنن ہدیٰ سے پھر بقدر کرنے کے اس کا کرنے والا مستحق ثواب ہوگا اگر ہمیشہ کرتا رہے گا تو اسے ہمیشہ کا ثواب ملے گا اور اگر ایک مرتبہ کرے تو ایک مرتبہ کا ثواب پاوے گا اور اس کے تارک پر ملامت نہ ہوگی“

اس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا شہید نے صاف طور پر انصافاً لکھ دیا اس میں جھگڑا ہی نہیں رہا نہ کرنے کو جی چاہے رفع یدین نہ کرے عذاب نہ ہوگا ہاں اگر مولانا شہید یہ لکھتے کہ نہ کرنے والے کی نماز نہ ہوگی یا وہ جہنم واصل ہوگا تو اعتراض کرنے کی بھی جگہ ہوتی اور جب مسلمانوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا پھر کیوں اتنا غل و شور مچاتے ہیں اور ناحق دریدہ دہنی کر کے اپنی شرافت کے بترے کھولتے ہیں۔

خدا نے ہمیں اس لئے علم نہیں دیا ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کی تکفیر کے فتوے خواہ مخواہ مرتب کریں، اور اپنی علمی تلوار سے ان کے گلے کاٹیں بلکہ ہمارے یہ علمی ہتھیار غیر اسلام کے لئے ہیں۔

میں دریافت کرتا ہوں آج تک کسی ملّانے نے عیسائیوں کے مقابلہ میں بھی کتاب

تصنیف کیں اور ان کی زہریلی تصانیف کا بھی رد لکھا؟ سوائے مسلمانوں کی تردید کرنے کے انہیں کچھ آتا ہی نہیں جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ پادریوں نے بہت سی کتابیں مسلمانوں کے خلاف تصنیف کی ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری ایسے بُرے پیرایہ میں جھوٹی جھوٹی باتوں کے ساتھ طبع کئے ہیں جن کے دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جاہل مسلمان اپنے دین میں مشتبہ ہو جاتے ہیں ان کی تردید بھی آپ نے لکھی تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم انہیں قابل خطاب نہیں سمجھتے وہ اجہل من الناس ہیں ملانوں سے ایسی اُمید ہی رکھنی فضول ہے وہ آمادہ ہیں اور بہت مستعدی سے آمادہ ہیں صرف قرآن وحدیث کی تردید کرنے میں کوئی مسلمان کتاب لکھے ضرور اس کی تردید کریں گے اور اگر حمیت نے زیادہ زور مارا تو کفر کا فتویٰ اس پر دے دیں گے یہ مسلمانی رہ گئی ہے۔ اور یہ ایمان ہے۔ ادھر تقویۃ الایمان کے رو چھپ رہے ہیں اور ادھر تنویر العینین کے مگر یہ توفیق نہ ہوگی لاؤ ان الزاموں کو بھی اُٹھا دیں جو عیسائی لاعلمی یا ہٹ دھرمی یا تعصب سے رسولؐ عربی کی معصوم ذات پر قائم کرتے ہیں ایسی تردید کو جہالت سمجھ رکھا ہے۔ قرآنی تردید کو علم خیال کر رکھا ہے ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ دارد حافظ   وائے گر از پسے امروز بود فردائی

مجھ سے ایک بوڑھے شخص نے خدا اس پہ رحمت کرے یہ روایت بیان کی تھی کہ جب محمد اسمٰعیل نے تنویر العینین لکھی ہے تو آپ پہلے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں لے کے حاضر ہوئے اور عرض کیا چچا جان آپ اسے ملاحظہ فرمالیں تو پھر میں اس کی اشاعت دوں۔ شاہ صاحب نے بغور اس چھوٹے سے رسالہ کو ملاحظہ فرمایا، آپ فرط انبساط سے بیخود ہوگئے، اور مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے اسی سرخوشانہ حالت میں اپنے نوجوان پیارے بھتیجے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا تو نے جو کچھ لکھا وہ بالکل درست اور صحیح ہے۔ کوئی شخص اس کی تردید نہیں کر سکتا، حقیقت میں اس چھوٹے سے رسالہ کی عمدگی میں شک نہیں جو شخص مسلمان بن کے اس رسالہ کو دیکھے گا اسے طرفین کے قوی دلائل کو وزن کرنے اور ان سے ایک نتیجہ اپنے لئے پیدا کرنے کا اچھا موقع مل جائے گا۔

تیسری کتاب آپ کی صراط مستقیم ہے گو وہ سید احمد صاحبؒ کے نام سے منسوب ہے مگر دراصل پیارے شہیدؒ ہی کی لکھی ہوئی ہے جیسا کر ہنٹر اپنی کتاب دی انڈین مسلمان صفحہ ۶ میں لکھتا ہے کہ "مولانا اسمٰعیلؒ نے اس کتاب کو فارسی میں تالیف کیا اور مولوی محمد عبدالجبار کانپوری نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا یہ کتاب یا رسالہ جس میں سید احمد صاحبؒ کے مقولے ہیں، تصوّف اور نصائح سے بھرا ہوا ہے۔ عبارت کی عمدگی پر مؤلف کو جس قدر ناز ہو وہ کم ہے جس مقام سے کتاب کو اُٹھا کے دیکھو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کا دریا بہہ رہا ہے الفاظ کی بندش اور عبارت کی چستی سے جس قدر عالمانہ پن برستا ہے اسی قدر مطالب کی عمدگی سے مؤلف کی شان معلوم ہوتی ہے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ اس رسالہ کے ہر مضمون سے میں متفق ہوں تاہم اس کا بہت سا حصہ قابل مدح اور عمل ہے جس کا اختصار ہم درج ذیل کرتے ہیں (وھو ھذا)

دعائے محبت و اُلفت باخدائے عزوجل ہر کس میکند لیکن حقیقت آں کم یاب است بلکہ نایاب حقیقت محبت اُلفت آنست کہ باوجود کمال ایمان و اعمال وعلم وعقائد او در ہر باب و اجتناب از معاصی و سیئات بر تبہ علیا اگر اورا مصائب و بلیات آں چناں رسد کہ جان و مال و اولاد و زوجہ و قوم و آبروی او را فرا گیرد و بہ بدترین امراض مبتلا گردد و دریں بلیات جان دادہ بعذاب شدید آن عالم گرفتار شود ہرگز پارہ از حرفِ شکایت در خاطر خطور نکند آرے التجا و زاری و نیایش و بیقراری از عدم تحمل آن مصائب بحضور خداوندی بسبب فرط اعتقاد و عموم رحمت و مغفرت ہر قدر کہ کند وہتر و بجا بلکہ مقتضائے کمال ایمان آنست فاما مفہوم شکایت را نسبت بآن ذات پاک در وہم و خیال جا ندہد بلکہ آنرا بالکل بقصور حال مآل و نقصانیکہ در استعداد ازلی اوست نسبت کند۔ وما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن نفسك وما اصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم ويعفو عن كثير را بعین حال خود شمارد وہمیں امر باعث حصول مقام صبر و منصب رضا بالقضا میباشد و یقین کند کہ وی مستحق سخت تر عذابے بود از انچہ بوی رسید و موافق استحقاق وی نیست و عفو آن عفو غفور است کہ بآن درجہ عذاب کہ ممکن تصورش باشد ابتلا نفرمودہ وہمیں امر باعث صدور اعلائے انواع شکر کہ

غیر خوش آئندہ اور ناروا الزام جو پیارے شہید کی بابرکت ذات پر مفسدین دین اسلام نے قائم کئے ہیں کہ یہ انبیار کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا اور انہیں اپنی طرح ایک آدمی کہتا ہے اس رسالہ سے سب کے دندان شکن جواب مل سکتے ہیں بشرطیکہ معترض ہاتھ میں لے کے اس بیش بہا رسالہ کو دیکھیں اور سمجھیں کہ جس جلیل القدر شخص کی نسبت ہم بے بنیاد بہتان جوڑتے ہیں اس کی مرتفع ذات اس سے بہت دُور ہے اس میں شک نہیں کہ نبوت و خلافت و امامت وغیرہ کی حقیقت جہلار کبھی نہیں جان سکتے وہی نفوس جانتے ہیں جنہیں خداوند تعالےٰ اپنی ودیعت سونپتا ہے جاہل کٹ ملاّ کیا جانیں کہ حقیقت نبوت کیا ہے۔ ان کا اعتراض کرنا سراسر نادانی اور کج فہمی ہے۔

ہم رسالہ منصب امامت پر خود کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے جب کتاب ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے پھر ضرورت کیا ہے کہ ہم اٹکل پچو رائے زنی کریں جس سے خصم کی ہرگز کامل تشفی نہ ہو۔ مناسب ہے کہ بعض مقام ہم منصب امامت کے نقل کرکے اس بات کا انصاف کہ انبیار علیہم السلام کی نسبت مولانا شہید کا کیا خیال تھا ناظرین پر چھوڑتے ہیں اور انہیں بے جا اور نامعقول اعتراضوں اور پیارے شہید کے روشن عقائد میں جو وہ معصومین کی نسبت رکھتا تھا حکم بناتے ہیں اُمید ہے کہ آئندہ سے پھر کوئی ایسی نابکار اور دور از عقل نکتہ چینیاں کرنے کی جرأت نہ کرے گا۔

ماخوذ از رسالہ منصب امامت

در بیان حقیقت وجاہت

باید دانست کہ انبیار علیہم السلام را در معاملات روحانی و کمالات انسانی بہ نسبت عموم ناس اعتباری باشد کہ حضرت رب الارباب قابل خطاب اند و حامل کتاب باشارات غیبی مامور اند و بشارات لاریبی مسرور پرورش یافتہ بستان تکریم اند و تربیت یافتہ دبستان تعلیم سربلندان مجالس تعظیم اند۔ دوانش مندان مجالس تفہیم مخزن اسرار احکام اند و مورد انوار الہام منور بنور بوارق

یہ ولایت کے حاصل کرنے کا افتخار حاصل ہو چکا ہے اُس پر واجب ہے کہ ترک مناجات کر کے گمراہوں کی ہدایت میں مصروف اور بنی نوع کی ہمدردی میں اپنا دھن من تن قربان کر دے۔ اور ہر دم اس کی زبان پر یہ جاری ہو نہ صرف زبان پر بلکہ اس کی عملی زندگی میں ہر ہر قدم پر یہ پایا جاتا ہو۔

وقف ست ہمہ بہر ہواخواہی احباب   علم و ہنر و سیم و زر و جان و دل ما

کسی زمانہ میں ولیوں اور بڑے جیّد صوفیوں اور بڑے بڑے مولویوں کو چھوئی موئی کا درخت بنا رکھا تھا کہ ادھر کسی کا سایہ پڑا یا ذرا کسی نے ہاتھ لگا دیا بس وہ مُرجھا کے گر پڑا لوگوں نے کیا سمجھ رکھا تھا انہوں نے خود ہی اپنے کو چھوئی موئی بنا رکھا تھا بنی نوع کی صحبت سے اُنہیں سخت نفرت تھی اور وہ اپنی عظمت ایسی قابل نفرت فعل سے جانتے تھے۔

یہ اب تک غلط فہمی سے مشہور ہے کہ مولانا اسمٰعیل ولیوں وغیرہ کو کچھ نہ سمجھتے تھے مگر تحریر بالا کی شہادت سے تمام وہ اعتراضات جو ناحق اس ذات والا پر کئے جاتے ہیں دُور ہو جائیں گے اور اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ پھر کسی کو خیالی اعتراضات کرنے کی پُرغلط دلیری نہ ہوگی۔

منصب امامت کی نسبت ہنٹر لکھتا ہے کہ سیّد احمد صاحب کی امامت منوانے کے لئے مولانا شہید نے تصنیف کی تھی مگر میں کہتا ہوں اگر وہ منصب امامت کو بالاستیعاب دیکھتا تو اسے اس کہنے کا موقع نہ ملتا یہ بیش بہا رسالہ درحقیقت کوئی خصوصیت اپنے میں نہیں رکھتا عام طور پر نبوت خلافت ولایت کے ادق مضامین پر کوئی بحث کرتا تو اسے صدہا اجزا سیاہ کرنے پڑتے پھر بھی شاید مطلب صاف طور پر نہ کھلتا۔ مولانا شہید نے چند اجزا میں طولانی مضامین اور غیر محدود مباحث کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس طرح ادا کر دیا گویا کچھ بڑا کام ہی نہ تھا ہر جملہ جو تین چار الفاظ سے زیادہ کا نہ ہوگا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل سے ڈھل کے نکل رہا ہے۔

منصب امامت کو لو اور اسے بغور دیکھو۔ فکر کرو اگر درحقیقت تمہیں ان مضامین سے کچھ بھی مذاق ہوگا تو سمجھ جاؤ گے کہ یہ چھوٹا سا رسالہ اپنی نوعیت میں اپنا ثانی نہیں

رکھتا۔

یہ نہایت کمال کی بات ہے کہ جہاں نبی کی صفات بیان کی ہیں وہاں اس کے فرائض منصبی سے بھی اطلاع دے دی ہے۔ تاکہ صفات کی فرائض منصبی کے ساتھ تطبیق ہو سکے۔

پانچویں کتاب ہنٹر نے اپنے رسالہ صفحہ ۶۷ میں مولانا موصوف کی تصنیف سے تذکرۃ الاخوان لکھی ہے میں نے ہر چند اس کتاب کو تلاش کیا مگر مجھے نہیں ملی خبر نہیں ہنٹر صاحب کے ہاتھ یہ کتاب کہاں سے لگ گئی تھی بہر حال اگر اس کتاب کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس میں کچھ نصیحتیں ہوں گی۔

چھٹی کتاب ایضاح الحق نامی مولانا موصوف کی تصنیف سے بیان کی جاتی ہے۔ ہنٹر نے اس رسالہ کا اپنی کتاب میں کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ ان رسائل کے علاوہ آپ کی خاص تصوف میں اور بھی کئی کتابیں ہیں جن میں سے بعض کی میں زیارت کر چکا ہوں اور بعض کو میں نے دیکھا بھی نہیں خیر اب میں اس بحث کو ختم کر کے ایک نہایت دلچسپ امر کی طرف ناظرین کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہنٹر صاحب نے ایک کتاب اس نام کی " ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر ازروئے ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنی فرض ہے " تصنیف کی تھی اور جس کے شافی اور دندان شکن جواب سر سید نے لندن کے انگریزی اخبارات میں طبع کرائے اور پھر وہ کل مضامین ایک رسالہ کی صورت میں جو ۱۱۵ صفحے کا ہے دو کالموں میں جس میں ایک کالم انگریزی کا اور دوسرا اُردو کا ہے طبع ہو گیا جسے دیکھ کے ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے اور خیالات کو واپس لیا اور اپنی تحریر پہ پشیمانی ظاہر کی۔ میرے خیال میں اب اس قسم کی بحث کرنے کا زمانہ ہی جاتا رہا۔ ۱۸۷۲ء میں ذرا لوگ ان باتوں کو غور سے پڑھتے تھے نیا نیا غدر ہو چکا تھا، اور بدقسمتی سے بے گناہ مسلمانو پر الزام لگایا گیا تھا اس لئے بعض صاحب بہادر بھی اپنی گورنمنٹ میں اپنی مشرقی واقفیت اور مشرقی تجربہ عظیم کا ڈپلومہ لینے کے لئے نئی نئی باتیں گھڑ کے گورنمنٹ کو دکھاتے تھے اس سے انہیں بحث نہ تھی کہ مخلوق خدا کا ایک بہت بڑا حصہ تباہ ہو جائے گا۔ ان کو تو صرف

یہ غرض تھی کہ لندیوں کی آنکھوں میں ہم ایک بہت بڑے مشرقی علم و ہنر اور زبان اور حالات سے واقف کار کہلائے جائیں ۔ گورنمنٹ پوستین نہیں ہے جب چاہا لٹا دیا اور جب چاہا اٹھا کے بٹھا دیا وہ ان باتوں کو خوب سمجھتی ہے اسے ایسے زہریلی تحریروں کا کامل علم ہے ۔ میں پرانے جھگڑے کو چھیڑنا اور بے نتیجہ تقریر کرنا پسند نہیں کرتا صرف اتنا ضرور لکھوں گا جب ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا یہ حال ہے کہ تنویر العینین کو جو رفع یدین کے بارے میں لکھی گئی ہے اور تقویۃ الایمان کو جو شرک و بدعت کے رد میں لکھی گئی ہے ۔ صراط مستقیم کو جس میں سوائے ایک جگہ کے ہر جگہ ترک دنیا کا ذکر ہے ۔ جہاد کی روح مسلمانوں کے تنوں میں پھونکنے والی کتابوں کی فہرست میں اپنے رسالہ مذکور صفحہ ۶۷ میں درج کر دیا ۔

ایں کار از تو آید و عالم چنیں کند

تقویۃ الایمان اور تنویر العینین میں ایک جملہ بھی جہاد کی طرف نہیں اشارہ کرتا اب اس تعصب اور اندھے پنے کا کیا علاج کہ ان مذہبی کتابوں کو بھی جہاد کی کتاب کہا جاتا ہے اور جہاں آپ سخت تحیر سے لکھتے ہیں " اب تک برٹش عملداری میں یہ کتاب عام طور پر بکتی ہیں " میں کہتا ہوں اگر ایسی ہی سمجھ کے لوگوں کے ہاتھ میں مظلوم مسلمانوں کی جانیں ہوتیں تو یہ تو کبھی کا پیس ڈالتے خدا ہماری روشن دماغ گورنمنٹ کو اس کے کاموں میں برکت دے کہ جب تک وہ ایک معاملہ کی خوب تحقیقات نہیں کر لیتی اس میں ہاتھ نہیں ڈالتی ورنہ ایسے آتشیں عنصر تو کبھی کے اسلامی پرانے شکستہ ڈھانچہ کو توڑ مروڑ ڈالتے ۔

اتنا بڑا محقق اس اولوالعزمی سے تو اتنے بڑے اہم مسئلہ میں رائے دینے اٹھا مگر اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ جن رسائل کو میں جہاد کے رسالے کہتا ہوں اگر خود پڑھا ہوا نہیں ہوں تو کسی نابالغ مسلمان بچہ سے پڑھوالوں ، گھنٹہ دو گھنٹے میں مضامین رسائل کے بارے میں صحیح ہو جاتی ۔ وہاں تو غرض گورنمنٹ کو مسلمانوں کی طرف سے بھڑکانے اور صریح دھوکا دینے کی تھی اس لئے ہر حق بات سے عمداً چشم پوشی کی الحمد للہ کہ سرسید کی زبردست تحریر نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا دیا اور ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمی تعصب یا دھوکا دہی کی نیت گورنمنٹ اور تقریباً تمام تعلیم یافتہ حصہ لندن میں ظاہر ہو گئی ، اب مجھے کیا

ضرور ہے کہ میں نئی طرز پر بحث کروں ڈاکٹر صاحب پشیمان ہو چکے گورنمنٹ ڈاکٹر صاحب کی غلطیاں تسلیم کر چکی پھر اب زیادہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا رہی - اس قدر جو میں نے لکھا بھی تو صرف اس لئے کہ مولانا شہید کی جن کتابوں کی بابت میں نے لکھا اور ان پر مختصر ریمارک کیا ہے اس کا ذکر ہنٹر صاحب نے بھی کیا ہے اس لئے مجھے ضرور ہوا کہ میں اپنے ناظر سوانح کو ہنٹر کی فاش غلطی پر بھی مطلع کروں اور دکھا دوں مغربی بعض محققوں کی یہ شان ہے کہ جو کچھ ان کے جی میں آتا ہے - اپنی غلط منطق و پیچیدہ عبارت میں اٹکل پچو لکھ مارتے ہیں اور واقعات کو ایسی عمدہ عبارت آرائی میں بیان کرتے ہیں کہ محض کذب بھی صدق بن جاتا ہے ہاں بصر کی نگاہ چاہے وہ کذب کا کذب ہی رہے -

بزیر جامہ نہاں کردۂ برص لیکن   بچشم اہل بصیرت برہنہ می آئی

اس کے بعد میں مولانا شہیدؒ کے بعض خطوط بعینہ درج کرتا ہوں گو میرے پاس خطوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا مگر انہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور صرف ان ہی چند خطوط پر اکتفا کیا جو ناظر سوانح کی کچھ نہ کچھ دلچسپی کا باعث ضرور ہوں گے جتنے خطوط کہ مختلف سرداروں، حکمرانوں اور مولویوں کو سید احمد صاحب کی طرف سے لکھے گئے وہ کل خطوط دراصل مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب ہی کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور وہ ابھی ایک کتاب میں طبع بھی ہو گئے ہیں مگر میں دو خط وہ ہی نقل کرنا چاہتا ہوں جن میں اول یہ جملہ ملتا ہے از اسمٰعیل بخدمت فلاں میرے خیال میں دو ہی خط کافی ہوں گے - پہلا خط یہ ہے - (وھو ھذا) -

از مولانا محمد اسمٰعیلؒ بنام میر شاہ علی صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم - از بندہ ضعیف محمد اسمٰعیل بخدمت معدن غیرت ایمانی منبع حمیت اسلامی مقبول بارگاہ رب قوی مخدومی میر شاہ علی سلمہ اللہ تعالی بعد از سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح آنکہ - نامۂ نامی ورقیمہ گرامی متضمن بر کلامیکہ فیما بین صادقین و منافقین واقع گردیدہ رسید مضامین مندرجہ واضح گردید جزاکم اللہ خیرا - آنچہ نگارش

رسوم باطلہ بالکلیہ برافتد و دین محمدی اعزاز پذیرد و تا بلاد ہائے دیگر خلق انتباہ شود و مسلمانان دیگر کہ ازین نوع میکردند تنبیہ شوند و ازاں باز مانند۔ آن بادشاہ قاہر باہر دریں کار مثاب باشد عنداللہ العظیم یا نہ۔ اجابوا جواب باشد واللہ اعلم دستخط و مہر عبدالرشید ابن قطب الدین الہروی محمد بن ظاہر البخاری الماورار النہری۔ عبدالعزیز بن قطب الدین الہروی علی بن عبدالکریم الاصفہانی شیخ بن جنید الکوفی۔ ابوبکر بن ابی القاسم البغدادی من کتاب الفج العمیق عبدالجبار بن یوسف النجار۔ یوسف بن محمد السمرقندی۔ احمد الہروی مظفر بن منصور البلخی نظام الدین بن تاج الہروی۔ فقط۔

ہمارے مولانا ممدوح کے ان دو خطوں اور اس استفتار سے جو آپ نے اپنے دلائل جہاد قوی کرنے کے لیے پیش کیا ہے صاف ہویدا ہوتا ہے کہ آپ کا عملی زندگی احکام شریعت کے دائرہ میں گزارنے کا خیال کتنا واثق اور کس درجہ استوار تھا۔ کن کن باتوں کو ناجائز اور کن کن اعمال کو جائز قرار دیتے تھے جو پیارے شہید کی سوانح عمری کو بغور دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ بچپن سے وقتِ وفات تک جس شخص کی زندگی بالکل احکام نبی کی متابعت میں گزری وہ شخص اسمٰعیلؒ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا پوتا تھا۔ ہم نے جس غرض سے یہ سوانح لکھے ہیں گو اس کے سمجھنے والوں کے لیے وہ عمیق تر ہے مگر ظاہراً ہمارا منشا بہت بڑا یہ ہے کہ اس بزرگ قوم اور رکن اسلام کی نسبت بعض مسلمان اپنی نادانی یا غلط فہمی یا ہٹ دھرمی یا بیجا تعصب سے جو سوء ظن رکھتے ہیں وہ بالکل مٹا دیا جائے اور پبلک کے سامنے اس کے ذاتی جوہروں کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جائے کہ پھر اس کے قبول کرنے میں دشمن کو بھی چارہ نہ ہو۔ اور اس برتر نفس کی سچی شان عالم پر ظاہر ہو جائے۔

میں نے جہاں تک ممکن ہوا اس بزرگ کے حالات کو اختصار کا جامہ پہنایا ہے ورنہ اگر اس کے حالات اور بھی زیادہ مفصل لکھے جاتے تو اس جیسی چار کتابیں تیار ہو جاتیں بہرحال ناظرین کی طبع کا خیال کر کے یہ سوانح عمری نہایت اختصار سے لکھی گئی ہے۔ اور اس کا انصاف پبلک پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے میری غرض واہ واہ سُننے اور اپنی تعریف میں لوگوں کو رطب اللسان دیکھنے کی ہرگز نہیں خدا گواہ ہے اور اسی کی گواہی کافی ہے۔ صرف غرض یہ ہے کہ ہمیں اس بزرگ قوم کی سوانح عمری سے پورا علم ہو جس نے اپنا دھن من تن قوم پر قربان کر دیا اور اس پر ایسا احسان کیا کہ وہ قیامت تک اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

خوف تھا کہ اگر ایسے جلیل القدر واجب الاحترام شہید کی کوئی یادگار قائم نہ ہوئی تو ضرور ایک نہ ایک دن زمانہ اسے بھلا دے گا۔ پھر سے نئی زندگی پیارے شہید کو ملی اور قرآن کا وہ فیصلہ کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے بالکل صادق آگیا۔ مجھے اپنی اس جانکاہی پر نہ کچھ فخر ہے نہ ناز ہے، نہ میں قوم سے اس کا کچھ صلہ چاہتا ہوں کیونکہ یہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میرا فرض تھا میں نے پورا کر دیا پھر قوم پر یا کسی پر احسان ہی کیا ہوا خدا سے اگر ہے تو صرف یہ دعا ہے کہ قوم میں یہ کتاب مقبولیت کا جامہ پہنے اور مسلمان اسے دلچسپی سے پڑھیں آمین ثم آمین۔

اس کے بعد دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں عالی جناب حضرت سید احمد صاحبؒ کی مختصر سوانح عمری ہیں۔ چونکہ دونوں پیر و مرید کا زندگی کا بہت سا زمانہ یکساں اور ایک ہی حالت کا گزارا ہے یعنے ابتدائے جنگ سے شہادت تک جو حالات قلمبند ہو چکے ہیں وہ دونوں ہی پیر و مرید پر صادق آتے ہیں اس وجہ سے یہ دلچسپ نہ ہوگا اگر بہ تبدیل الفاظ سید صاحب کی سوانح عمری میں بھی وہ ہی باتیں درج کی جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے حالات زندگی میں وہ باتیں درج کی جائیں جو نہایت عجیب و غریب ہیں اور جن سے اس محترم سید کی روشن ضمیری اور لاثانی شرعی زندگی کا سچا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا سیّد احمد صاحبؒ کی سوانح حیات

پیدائش — طفولیتؒ — تعلیمؒ

مولانا سید احمد صاحب بریلوی جنہوں نے سرحدی جنگی تاریخ میں بہت بڑا نام پایا بماہ محرم الحرام ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان بہت بڑا نامور اور عام مشہور تھا۔ سید محمد عرفان صاحب آپ کے والد بزرگوار تھے جن کی شرافت ایمان داری اور علم کی اہل بریلی قدر کرتے تھے۔ آپ کے نانا سید ابو سعید ایک فقیر طبیعت بزرگ تھے جن کی محتاط زندگی اور اتقا پرہیزگاری نے نہ صرف ان کی شہرت کو بریلی کی چار دیواری یا حدود میں بند رکھا بلکہ دور دور آپ کے تقدس اور پاکی کی ناموری نے آپ کے خاندان سادات کی بزرگی میں اور بھی جان ڈال دی۔ دہلی میں شاہ عبد العزیز صاحبؒ سید ابو سعید سید احمد صاحب کے نانا کو خاص اور اصلی سید اور واجب الاحترام جانتے تھے۔ اسی طرح بزرگ سید کے حقیقی چچا سید ابو النعمان نے قرب و جوار کے مسلمانوں کی تسخیر قلوب میں سب سے زیادہ ناموری حاصل کی تھی۔ غرض بزرگ سید جس پر ہمیشہ تاریخ کی روشنی پڑے گی اس معزز خاندان میں پیدا ہوا۔

روایت مؤرخین کے مطابق جب آپ کی عمر کچھ مہینے اوپر چار برس کی ہوئی حسب معمول

مکتب میں قرآن شریف پڑھنے کے لئے بٹھا دیا گیا مگر یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ اس بچّہ نے تعلیم کی طرف اپنی توجہ مطلق مبذول نہیں کی۔ بچپن کے حالات گو کسی ایسے سلسلے ہمیں نہیں پہنچے کہ ہم انہیں بے دکاست یقین کر لیں پھر بھی ہمیں جو کچھ تحقیق ہوا ہے جس کے صدق و کذب کا خدا کو علم ہے۔ ہم یہاں درج کرتے ہیں امید ہے کہ ہمارے ناظر سوانح کو دلچسپی ہوگی۔

سید احمد صاحبؒ کا بچپن معمولی کھلنڈرے بچوں کی طرح نہیں تھا گو کوئی نئی بات ہمیں نہیں معلوم ہوتی۔ پھر بھی دہشت آمیز تفکر بچپن ہی سے آپ کو لاحق رہتا تھا۔ مسکینی غریبی، کم بولنا، آہستہ سے بات کرنا۔ یہ تمام صفتیں جو بچہ میں بہت کم دیکھی جاتی ہیں بزرگ سید میں موجود تھیں۔ واجب الاحترام سید یتیم نہ تھا مگر اس کی غیر معمولی مسکینی اور ہر بات پر بجا و درست کہنے اور گردن نیچی کر کے جواب دینے نے اس کو ناظر کی نگاہ میں یتیم بچوں کی طرح ثابت کر دیا تھا۔

عموماً وہ ناز بھرے جملے جو چھوٹے بچے اپنے والدین سے کرتے ہیں وہ بات بات میں مچل جانا۔ قدم قدم پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے چلنا، اپنے والدین کو ناز بردار سمجھ کے ان کی گودی میں لوٹ جانا۔ ہر خواہش کو بہت آزادی بلکہ خود احسان رکھ کے اُن کی خدمت میں پیش کرنا اور اگر ان سے پوری نہ ہو سکے تو ضد کر کے اس کی تعمیل پر مجبور کرنا۔ کھلنڈرے بچوں کی طرح بستہ کو ادھر اُدھر چھپا کے اپنے ہم عمروں کے ساتھ باغوں کی سیر کو نکل جانا وہ ناز بھری خوشنما ہٹیں جو عموماً بچے والدین سے کرتے ہیں ان پر مصر ہونا۔ غرض یہ تمام معمولی باتیں جنہیں عموماً ہر بچہ غیر معمولی رنگ میں اپنی ٹوٹی ہوئی زبان اور اپنی بھولی بھولی صورت سے پیش کیا کرتا ہے۔ بزرگ سید میں کوئی بات بھی ایسی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتا تھا اور اس کی یہ خاموشی کوئی ربانی نکات اپنے میں مضمر نہیں رکھتی مگر اس کی حلیمی مزاج کی صاف شہادت دیتی ہے۔ اس نے کبھی کسی بات پر مچل کے اور ضد کر کے والدین سے کوئی چیز نہیں مانگی۔ اور نہ کبھی بستہ اپنی نانی دادی کے ہاں رکھ کے پڑھنے سے کبھی رفو چکر ہوا۔ جہاں تک ہم

اس لئے بچپن کے حالات پر غور کرتے ہیں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں معلوم ہوتی - ہاں یہ ضرور خیال میں آتا ہے کہ اس کی زندگی سو دو سو بلکہ ہزار دو ہزار بچوں میں نئی طرز کی تھی یہ تعجب سے نظر کیا جاتا ہے کہ بزرگ سید بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ سے پرلے درجہ کا غبی مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا اسے تعلیم دینا بے سود ہے کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں میں ذہن کی بابت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا - صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ سید کی بچپن میں کیا پوری عنفوان جوانی میں بھی لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع نہ تھی - آپ کا خاندان گو کسی زمانہ میں اعلیٰ درجہ کا دولت مند اور صاحب اقتدار تھا مگر زمانہ کی نابکار اور خوش آئندہ رفتار نے دولت کے لحاظ سے بہت ہی محدود کر دیا تھا - بزرگ سید کی پیدائش اور بچپن میں پھر بھی غنیمت تھا کہ عزت سے گھر بیٹھے روٹیاں کھاتے تھے مگر جوں جوں بزرگ سید بڑا ہوتا گیا دولت کی کمیاب تصویر آنکھوں کے آگے گردش لگاتے لگاتے غائب ہونے لگی، اور شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ صرف ایک پرچھائیں سی نظروں کے سامنے رہ گئی اور باقی خیال ہی خیال اصلی صورت کا دل و دماغ میں جاگزین رہا -

سید کی لکھنے پڑھنے کی طرف اس قدر بے توجہی اس کے بزرگ باپ کے دل میں اپنی فلاح اور معزز کنبہ کے نام کو برقرار رکھنے نے مایوسی کی طرف پھیر دیا - والدین خواہ غریب ہوں یا امیر ان کی بوڑھی آرزوئیں اپنے ہونہار نوجوان بچوں کی کوششوں پر موقوف ہوتی ہیں - اگر وہ دولت مند ہوئے تب بھی اپنا نام بلند ہونا اپنے بچوں سے چاہتے ہیں، اور جو وہ امیر نہ ہوئے تو پھر یہ خواہش رہتی ہے کہ جب ہمیں ہمارے ہاتھ پیر جواب دلا دیں گے تو ہمارے نوجوان بچے پرورش کریں گے - اور جب بوڑھے والدین اپنی ہونہار اولاد کے اطوار اس قسم کے دیکھتے ہیں جن سے کسی بات پر مطلق امید نہیں بندھتی تو ان کی حرمانی و مایوسی اور شکستہ خاطری سخت آفت ناک ہوتی ہے اکثر بارِ غم نہ اٹھا کے قبل از وقت جان بحق تسلیم ہو جاتے ہیں اور بعضے سسکتے رہتے ہیں مگر ان کی زندگی نہایت دردناک طریقہ سے کٹتی ہے - یہی کیفیت بزرگ سید کے

والدین چچا وغیرہ کی تھی انہیں کچھ اس بات کی تو پروا نہ تھی کہ یہ بڑا ہو کے ہمارا کفیل بنے گا بلکہ انہیں یہ خیال تھا کہ جو نام ہم نے پیدا کیا ہے اور ہمارے بزرگوں نے علمی عزت حاصل کی ہے اس کی بدلیاقتی کہیں اُسے خیرباد نہ کر دے ضرور تھا کہ بزرگ سیدؒ کے والدین اور چچا ماموں کو یہ خیال ہو یہ عام مسلمہ مسئلہ ہے کہ بچے کے پیر پالنے ہی میں نظر آتے ہیں گو پیارے اور معزز سید کی پیشانی بچپن سے تاباں تھی اور ایک قیافہ شناس نظر کے لئے ایک عظیم الشان واقعہ کی پیشین گوئی کرتی تھی مگر ایسے نظر باز کہاں تھے جو بزرگ سید کی طفولیت کی سکوت خیز صورت سے کوئی پیش گوئی کر سکتے۔

غرض جب پیارا سیدؒ مکتب میں بٹھایا گیا ہے تو اس نے قرآن مجید عمدہ طور پر پڑھ لیا اور بہ نسبت اور بچوں کے اسے یاد بھی خوب تھا استاد بہت خوش تھا اور تعریف کیا کرتا تھا کہ کبھی یہ بچہ اپنے سبق یاد کرنے پر گھرکی اور مار نہیں کھاتا۔ گھر میں ہر متنفس خوش تھا اور سید کو ذہین طباع اور پڑھنے کا شوقین سمجھتا تھا مگر جب قرآن ختم ہو چکا اور کریما خالق باری وغیرہ کی نوبت آئی تو بارہ حکم نادار کا مضمون تھا۔

کریما کا پہلا مصرع خاصہ دعائیہ ہے مگر یہ بھی بزرگ سید کو تین دن میں یاد ہوا تھا اس پر بھی کبھی کریما بھول گئے تو کبھی برحال ما کو دل سے محو کر دیا۔ اب تو میاں جی کے ہوش اڑے کہ قرآن پڑھنے میں تو یہ بڑا ذہین تھا کتاب میں اسے کیا ہو گیا۔ بہتیرا سر پٹکا اور مغزپچی کی بزرگ سیدؒ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔

یہ نہیں تھا کہ پیارا اور واجب الاحترام سیدؒ سبق یاد کرنے میں محنت نہ کرتا ہو اور شرارت سے ڈھیٹ بنا خاموش بیٹھا رہتا ہو نہیں وہ بخوبی محنت بھی کرتا تھا۔ میاں جی کے کہنے کے موافق مکتب کے وقت کی بھی پابندی کرتا تھا اس پر بھی اسے یاد نہ ہوتا تھا اس کے ذہن اور یادداشت کا یہ اتار چڑھاؤ دیکھ کے یہ خیال آتا تھا کہ جیسے چلتی گاڑی میں کوئی روڑا اٹکا دیتا ہے اور پھر وہ بیلوں کی طاقت سے بھی نہیں چلتی سوائے اس کے اس پہ انتہا درجہ کا زور لگایا جائے تو پہیہ دو چار انچ زمین سے رگڑا کھاتا ہوا بمشکل آگے بڑھے گا یہی کیفیت بعینہ بزرگ سید کی تھی جب وہ ایک ایک جملہ کو گھنٹوں جپے جاتا تھا

تب کہیں کسی قدر یاد ہوتا تھا اور دوسرے دن تماشا یہ تھا کہ وہ بھی چوپٹ جب یہ کیفیت ہوئی تو والدین اور میاں جی کی تنبیہ بڑھنے لگی اور گھر کی جھڑکی آنکھیں نکالنے سے گزر کے مار پیٹ پر نوبت پہنچ گئی۔ اس سے بھی والدین کی آرزو پوری نہ ہوئی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ قدرتی طور پر اس کے دماغ میں قفل لگ گیا ہے اور یہ کسی طرح کی تنبیہ سے بھی نہیں پڑھ سکتا تو ناچار ہو کے پڑھنے سے اُٹھا لیا اور زیادہ جبر کر کے معصوم جان کو گھلنے نہ دیا۔ کیونکہ اس چند مہینے کے عرصہ میں پیارا سید دبلا اور زرد رو بہت ہو گیا تھا اسے خود ہی اپنی طبیعت کی اس غنچہ دہنی کا بڑا رنج تھا اور تنبیہ والدین وغیرہ کو بہ نسبت اور بچوں کے زیادہ معلوم کرتا تھا۔ جس بچہ میں قوت ممیزہ زیادہ ہوتی ہے وہ ماں باپ کی یا اُستاد کی معمولی گھرکی کی بھی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کے دل پر خافی اثر ایسا پڑتا ہے کہ بعض وقت ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ قانون عقل کے بموجب عقلا نے اس امر کا فیصلہ کر دیا ہے کہ بچہ کو کبھی سزائے بدنی نہ دے اس کی پرورش اس ڈھنگ پر کرے کہ وہ اپنے کسی بزرگ کا خوف اور ادب ملحوظ رکھے ورنہ جھڑکی گھرکی تو اسے بے غیرت بنا دے گی اور مار پیٹ اسے ڈھیٹ کر دے گی جہاں یہ دو عیب بچہ میں آ گئے بس پھر وہ کسی کام ہی کا نہیں رہا اب اگر اسے تعلیم بھی دی جائے گی پھر بھی وہ اخلاقی اور تمدنی ترقی نہیں کر سکتا۔ الحمدللہ کہ بزرگ سید کے ہوشیار اور عقلمند والدین نے چند روز کے بعد ناگوار تنبیہ اور ناروا تقیید سے مطلق آزاد کر دیا اور اسے طبیعت پر چھوڑ دیا کہ چاہے جو کچھ کرے اسے اختیار ہے۔

بزرگ سید جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں کھلنڈرا نہ تھا جب اسے کامل آزادی مل گئی اپنے گھر میں رہنا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا اختیار کیا، کئی برس یوں ہی گزر گئے گو وہ قرآن سمجھتا نہ تھا کیونکہ اسے بامعنی قرآن ملکی دستور کے موافق نہ پڑھایا گیا تھا پھر بھی بچپن کی معصوم طبیعت پر کلام اللہ کے ہر ہر لفظ کا ایسا زبردست اثر پڑتا تھا کہ وہ بعض وقت بے اختیار رونے لگتا تھا جب سید ابو النعمان صاحبؒ نے یہ دیکھا کہ میرے کم عمر بھتیجا کو قرآن پڑھنے اور اس سے موثر ہونے کا بہت کچھ مذاق ہے۔ اور اس کے دل پر ربانی کلام کا

بہت بڑا اثر پڑتا ہے تو انہوں نے قرآن شریف کے معنے پڑھانے شروع کئے۔ پڑھانے کے ارادہ کو انہوں نے چند روز کے لئے ملتوی کر دیا۔ انہیں خیال تھا ناحق میری مغز پچی ہوگی وقت الگ ضائع ہوگا اور کچھ نتیجہ نہ نکلے گا۔ یہی اور لوگوں نے بھی کہا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ معصوم سید کی طبیعت میں ربانی کلام سمجھنے کا پورا پورا مذاق حاصل ہے اور دوسری کتابوں کو اس کی طبیعت قبول نہیں کرتی یہ حکمت کا بھی ایک مسئلہ ہے کہ جب ایک جگہ پر ایک چیز رکھی ہوئی ہے اس کی جگہ دوسری نہیں آسکتی مثلاً جہاں چھاؤں ہے۔ وہاں دھوپ نہیں آسکتی جہاں نور ہے وہاں تاریکی دخل نہیں پا سکتی اور علیٰ ہذا القیاس پیارے سید کی طبیعت پر قرآنی نقوش اپنے پورے ضبط اور زور سے منقش ہو چکے تھے پھر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ خالق باری اور کریما کے اشعار اس کے لوح دل پر نقش ہوتے۔ ہماری ان باتوں کو سرسری طور پر پڑھ کے ناظر خلجان میں پڑ جائے گا اگر کوئی منصف مزاج ہوا تو اپنی سمجھ کی کوتاہی سمجھ کے اپنی ڈاڑھی نوچنے لگے گا یا جلدی جلدی منہ پر ہاتھ پھیرنے لگے گا اور جو کوئی غیر منصف ہوا تو منصف پر تبرّے بازی کرے گا اور کہے گا اسلام میں بڑے بڑے علماء گزر گئے انہیں علاوہ قرآنی علم کے بہت کچھ علوم دینی اور دنیوی سے حصہ ملا تھا پھر یہ کلیہ غلط ہوگیا مگر میرا مطلب یہ نہیں ہے میں یہ کہتا ہوں کہ جس طبیعت میں صرف ربانی الفاظ قبول کرنے کی قابلیت ہو وہ دوسرے الفاظ قبول نہیں کر سکتی۔ خدا کی بخششیں ہیں اپنی مخلوق کو طرح طرح کے ہنروں اور علوم سے سربلند کرتا ہے کسی کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے اور کسی کو کسی بخشش سے سرفراز کرتا ہے اس میں کون دم مار سکتا ہے اور کس کا زہرہ ہے جو اُس کی حکمت بالغہ پر نکتہ چینی کرنے کا خیال بھی لائے۔ اور کبھی سرسری طور پر کسی قسم کا وہم اپنی طبیعت میں پیدا کرے۔

یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ بزرگ سید کا جوہر کن کن آسمانی عنصروں سے بنا ہوا تھا ہاں یہ ہم اس کی لائف دیکھ کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا خیر اندیش بھولا محتاط زندگی رکھنے والا اور مسلمانوں کی ہر بات پر اعتبار کرنے والا تھا۔

یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کے ضمیری جوہر بچپن سے ایسے ہی چمک دار اور

والدہ ماجدہ ہنوز زندہ تھیں اور آپ کے ماموں بھی موجود تھے جو گھر کے اخراجات اور انتظامات کے کفیل بن سکتے۔ جوش ہمدردی نے تمام کنبہ کی غیر معمولی محبتوں کو دل سے محو کر دیا۔ اور اب نوبت بایں جا رسید کہ آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا جس طرح ہو سکے کچھ تحصیل کروں اور اپنے بھائیوں کو اس سے مدد پہنچاؤں۔

سفرِ لکھنؤ

اس عرصہ میں آپ مختلف شرفا کے حلقوں میں ملتے ملاتے رہے ایک دن چند ہم عمروں میں یہ مشورہ ہوا کہ کچھ تحصیل علمی اور زری کے لئے باہر چلنا چاہئیے۔ وطن میں پڑے رہنے سے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا ان کے دل میں یہ خیال سفر غیر معمولی طریقہ سے اٹھا ؎

وطن میں سست اور کاہل پڑے رہنے سے ہے خوشتر
کہ چل کے دیکھیں دنیا کے ذرا حیرت فزا منظر

وہ آمادہ ہوئے کہ ادھر اُدھر پھر کے کچھ تلاش معاش کریں اور دنیا میں سربلندی پیدا کریں اس مشورہ میں سید صاحب بھی شریک تھے۔ آپ روزگار کے تو خواہش مند نہ تھے ہاں صرف یہ چاہتے تھے کہ ایک غیر معمولی آگ جو میری طبیعت میں بھڑکی۔ اس کی کسی طرح تسکین ہو۔

سید صاحبؒ کے سوا اور جتنے آپ کے دوست تھے اپنے زمانہ کے موافق لکھنے پڑھنے اور دو چار ہنروں میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ سید صاحب حافظ قرآن نہ تھے گو بہت سی آیتیں آپ کو یاد ہو گئی تھیں، اور آپ نہایت خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔

اٹھارہ انیس برس کی عمر ہوگی کہ آپ اول ہی بار بریلی سے روانہ لکھنؤ ہوئے، اس سے محض بے خبر تھے کہ شیعہ سنیوں سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں، اور ان کے بے جا تعصب کی کیا کیفیت ہے۔

ابھی تک سید صاحب کو شیعہ اور سنی کے تمام و کمال جھگڑے کا بھی علم نہ تھا، وہ

جانتے ہی نہ تھے کہ شیعوں کے اصول مذہبی کیا ہوتے ہیں اور سنیوں کے ارکان مذہبی کیا ہیں صرف نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا، قرآن پڑھنا، نبی اور اُس کے چار صحابہ کو برحق سمجھنا اسی طرح اور بھی دو چار باتیں یاد تھیں جو معمولی لکھے پڑھوں کو یاد ہوتی ہیں اور وہ بیچارے زیادہ مذہبی پیچیدگیوں سے نہ خود واقف تھے نہ ان کے اور دوست۔

غرض بخیر و عافیت سید صاحب معہ اپنے پانچ چھ ساتھیوں کے لکھنؤ پہنچے، اس وقت لکھنؤ پورے عروج پر تھا۔ شیعوں کی قوت سلطنت اور قوت تعصب کا پورا اتنت تھا اور تمام ان کی مذہبی باتیں خوب چمک مار رہی تھیں۔

جب یہ چھ سات آدمی لکھنؤ پہنچے ہیں تو انہوں نے پہلے سرائے میں قیام کرنا بہتر سمجھا۔ سید احمد صاحب کے والد اور چچا کے کئی دوست یہاں موجود تھے مگر آپ نے گوارا نہ کیا کہ کسی پر جا کے ڈھیا دوں۔

سید صاحب کو ذاتی طور پر روزگار کی ذرا بھی خواہش نہ تھی آپ کی غیر محدود آرزوئیں اور ضمیری غیر معمولی جوش نوکری سے مسو نہ ہو سکتے تھے، ان کے لئے ایک ایسے ہی معلم کی ضرورت تھی جو انہیں اطمینان کا جامہ پہنا کے دوسرے عملی راستہ پر لگادے۔ سید صاحب نے فی الحال اپنے دوستوں کو تلاش روزگار میں جانے کی اجازت دی اور آپ بھی لوگوں سے ملنے اور سیر دیکھنے کے لئے ادھر اُدھر پھرنے لگے۔

افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ بیچارے ساتھیوں کو سخت ناکامی ہوئی جس جگہ وہ جاتے تھے پہلے ان سے یہ سوال کیا جاتا تھا کہ شیعہ ہو یا خارجی (خارجی شیعوں کے ہاں سنیوں کو کہتے ہیں) اگر اس نے کہہ دیا کہ میں شیعانِ علی میں سے ہوں اور اپنے بزرگوں پہ دو تین تبرے بھی اس نے بھیج دئے تو اس پر یہ سوال کیا جاتا تھا کہ تمہیں گانا ناچنا کیسا آتا ہے۔ کہاں تک ایک ہیجڑے سے پھکڑ بازی کر سکتے ہو، اور کہاں تک ایک برہنہ زمانے کے ساتھ سر بازار ننگے پھر سکتے ہو۔ مسخرے پن میں کیا صفت رکھتے ہو آیا روتے کو ہنسا دوگے اگر یہ سب باتیں آتی ہیں تو اپنے استادوں کا نام بتاؤ تاکہ اطمینان خاطر ہو اور پھر زمرہ ملازمین میں نام لکھ لیا جاوے۔

عموماً ہر خواہان ملازمت سے زیادہ تر یہی سوالات کئے جاتے تھے اگر کوئی شخص ان
فنون بے غیرتی اور طبلہ سارنگی میں اول نمبر ہوا وہ تو مصاحب خاص بنالیا گیا اور جو اس میں
کوتاہی ہوئی تو اُسے یہ کہہ کے ٹال دیا جانور پیدا ہی کیوں ہوا جب یہ باتیں نہیں آتیں مسخرے
سے کہو کہ زندہ ہی کیوں رہتا ہے جناب امیر کی قسم جس میں یہ صفتیں نہیں وہ مُنہ دیکھنے کے
قابل نہیں ہے۔

یہ خیالات تھے جہاں سید احمد صاحبؒ اور آپ کے دوستوں نے پہلے پہل قدم رکھا
شیعان لکھنؤ کی جو کچھ کیفیت تھی ہم کسی طرح بھی صاف نہیں لکھ سکتے۔ ہماری تہذیب اور
قانون انگلش اجازت نہیں دیتا کہ شیعان لکھنؤ کی معاشرت کا سو میں ایک حصہ بھی بیان
کیا جائے۔ لطف یہ ہے کہ جتنی ان کی حالت اخلاقی، تمدنی، مذہبی لحاظ سے خراب تھی اسی
قدر ان کا تعصب سُنیوں کے پامال کرنے اور ان بیچاروں کو الٹی چھری سے ذبح کرنے کے
لئے بڑھا ہوا تھا۔ جب سید صاحب ایک امیر کے ہاں گئے ہیں تو اس امیر نے پہلا سوال یہ
کیا تھا کہ آپ خارجی ہیں یا شیعان علی میں سے ہیں یہ دونوں الفاظ آپ کے کانوں میں اجنبی
تھے خارجی کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا گو شیعہ کے لفظ سے پوری شناسائی تھی مگر شیعان علی
کا جملہ ابھی تک کان میں نہ پڑا تھا۔ آپ بڑے پریشان ہوئے کہ جو کچھ اس نے سوال کیا
ہے خبر نہیں اس کے کیا معنے ہیں بہرحال یہ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ لغات میں مذہب
کی بابت دریافت کرتا ہے آپ نے صاف جواب دیا میں مسلمان ہوں نبی عربی صلی اللہ علیہ
وسلم پر میرا پورا ایمان ہے۔ قرآن کو کلام الٰہی سمجھتا ہوں اور شب و روز میری تلاوت میں رہتا
ہے۔ امیر نے سید احمد صاحب کی جب یہ تقریر سنی تو وہ اپنے دل میں بہت خوش ہوا۔ اور وہ
یہ سمجھ کے کہ یہ بھولا بھالا نوجوان ہے ضرور مومن یعنی شیعہ بن جائے گا اس نے یہ کہا کہ میاں
صاحبزادہ اگر تم اپنی نیک چال چلنی کی ضمانت دو تو ہم تمہیں اپنی مصاحبت میں ملازم رکھتے ہیں
سید صاحب کو یہ سن کے کچھ مایوسی سی ہوئی اور امیر کی ناتراشیدہ طبیعت پر افسوس کر کے
کہا کمبخت تو بڑا نا سمجھ ہے مسلمان اور وہ بھی سید کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہم پردیس میں کس کی
ضمانت لائیں خدا ہمارا سچا ضامن ہے۔ سید احمد صاحبؒ کی یہ سرگرم اور انقطاعی تقریر سن

اپنے بزرگ سید کی یہ محبت آمیز اور نصیحت سے بھری ہوئی باتیں سید احمدؒ نے بغور سنیں اور اپنے دل سے سوال کیا کیا تو راضی ہے کہ ایسے کفرستان میں جہاں کی آب و ہوا میں ارتداد فسق و فجور کی بو آتی ہے تجھے رکھا جائے یا تو جب خوش ہوگا کہ تجھے یہاں کی آب و ہوا سے نجات دی جائے گی؟" دل نے جواب دیا مجھے ایک ایک گھڑی ایک ایک دن اور ایک ایک دن ایک ایک سال ہو رہا ہے جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چل دو۔" جب دل نے بہت زور شور سے یہ شہادت دی تو آپ اپنے دوستوں کو اس بزرگ سید کے حوالے کرکے اور ان کی ناخن بندی کی سفارش کرکے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

سفرِ دہلی

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سید صاحب میں اول دن سے خدا کی مخلوق سے ہمدردی کرنے کا مذاق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کچھ بیان نہیں کیا جاتا۔ اپنے بھائیوں کی بری حالت اور ناروا معاشرت پر بزرگ سید نے ہمیشہ خون کے آنسو بہائے ہیں اور حتی الوسع ان کی مدد بھی کی ہے۔ ساتھ ہی اس ہمدردی کے عزت بھی بہت بڑی تھی آپ کبھی نہ چاہتے تھے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں یا اپنے کو پیرزادہ مشہور کرکے کسی سے کچھ اینٹھوں یا اپنے آباؤ اجداد کی بزرگی اور پیری بیان کرکے کسی کا مال ماروں اگر کوئی ذرا بھی احسان کر دیا کرتا تھا تو آپ تمام عمر اس کے مطیع بن جاتے تھے اور اس سے ایسے محجوب رہتے تھے کہ کبھی آنکھ ملا کے بات نہ کرتے تھے۔

یہ زمانہ جب آپ نے اپنا وطن چھوڑ کے لکھنؤ کا غضبناک منظر دیکھا ہے اور اب دہلی کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ انتہا درجہ کا پُر شباب تھا۔ بایں ہمہ بزرگ سید کی پاک روح عنفوان جوانی کی بھول بھلیوں سے ابھی بہت دور تھی جوانی کے زمانہ کی وہ تاریکی جس میں کچھ نہیں دکھائی دیتا اور انسان بالکل اندھا ہو جاتا ہے۔ بزرگ سید کو نور بن گئی تھی۔ غیر معمولی اُمنگیں اور غیر خوش آئندہ جوش جو عین عنفوان جوانی کا جزو اعظم اور اصل الاصول ہیں بزرگ سید کی ذات مقدس سے بہت دور تھے گو یہ کسی کو نہ معلوم تھا نہ اور کوئی امید کر سکتا تھا کہ عمر

نوجوانی کے وعدے وعید ایک نہ ایک دن پورے کرے گی اور ان عجیب ولولوں کا خاتمہ خوش آئندہ دکھائی دینے لگے گا یہ وہ ولولے تھے جو خاص خاص طبائع میں اُٹھتے ہیں اور انہیں ملکہ انسانیت کہتے ہیں۔ انسانیت کے مدارج اعلیٰ پر پہنچنے کے لئے یہ ایک سیڑھی ہے جسے غلطی سے علی گڑھ والے سر سید ملکہ نبوت کہتے ہیں اور آخر اس غلطی نے انہیں یہاں تک گمراہ کیا کہ وہ نبی عربی کے مقابلہ میں یہ کہنے لگے بشپ چندر سین پیغمبر ہندوستان ہے (معاذ اللہ) اس کے معنے یہ ہیں کہ جب ایک بد دین پیغمبر ہند بن گیا تو میں اپنے کو مسلمان نبی کہتا ہوں اور خاندان سیدات سے بھی بعض اوقات نسبت کر لیتا ہوں میں کبھی نہ کبھی زمانہ میں زندگی میں یا بعد ازاں پیغمبر ہند ضرور بن جاؤں گا۔

غرض سید احمد صاحب میں نوعمری ہی سے ایک ایسا ملکہ تھا کہ جس نے انہیں قوم کی اصلاح کی طرف پورا رجوع کر دیا تھا اور وہ اس حالت میں بھی کہ نہایت بے سر و سامان تھے غربا کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔

جب آپ لکھنؤ سے روانہ ہونے لگے ہیں تو آپ کے والد کے دوست نے ایک گھوڑا سواری کو اور کسی قدر زر نقد دیا، آپ نے صاف انکار کر دیا کہ میں تکلیف دینے نہیں آیا ہوں فقیر آدمی ہوں مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں سفر میں گھوڑا رکھوں مگر اس بوڑھے شخص نے منت ہاتھ باندھ کے گھوڑا اور زر نقد حوالہ کیا۔ سید احمد صاحب اس پر سوار ہو کے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نے کانپور تک پہنچ کر ابھی قیام نہ کیا تھا کہ گھوڑا اور روپیہ چار مصیبت زدہ اشخاص کو دینا پڑا جن میں ایک مریض ایک زخمی اور دو بہت بوڑھے تھے اور جن پر تین دن بے آب و دانہ گزر گئے تھے۔

سید احمد صاحب اپنا کل سامان دے کے بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھ کے کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ میری یہ چیزیں ان کے کام آئیں اپنی بے سر و سامانی اور پیادہ پائی کا کچھ بھی خیال نہ تھا۔ اور آپ نہایت سرخوشانہ حالت میں دہلی کی طرف قدم زن تھے جب آپ دہلی روانہ ہوئے ہیں پوری بیس برس کی عمر تھی۔ اس عمر کی ناپختگی اور ناتجربہ کاری جو انسانی فطرت کا اس زمانہ عمر میں لازمی جوہر ہے کس بدنما صورت

میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتا ہے اور کیسے کیسے جھٹکے دے دے کے ایک قابل اور تجربہ کار انسان بناتا ہے۔ اس عمر میں معمولی خوشی ایک عجیب وغریب شادمانی ظاہر ہوتی ہے اور خفیف سی تکلیف کا مہیب اثر طبیعت پر خوفناکی سے پڑتا ہے بے سوچے سمجھے ہر بات کرنے کو جی چاہتا ہے اور اگر کوئی باز رکھنا چاہتا ہے تو سخت ناگوار گزرتا ہے۔ طبیعت میں خودپسندی اور تکلم بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اپنی ہر بات تمام جہان سے بہتر دکھائی دیتی ہے کبھی دل گوارا نہیں کرتا کوئی بوڑھا شخص نصیحت کرے یا دل کی کسی خواہش سے باز رکھے خودنمائی اور بے جا تجفر سن بلوغ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور تیس برس تک اس کا زور بہت رہتا ہے۔ اور آخر چالیس برس میں کم ہوتے ہوتے بالکل جاتا رہتا ہے یہ خاص نوجوانی کے زمانہ کی خاصیتیں ہیں۔ جو بالعموم انسانی طبائع میں ایک حد تک اُٹھتی ہیں اور اس سے کم طبائع منزہ ہوتی ہیں ان کم طبائع میں سید احمد صاحب کی بھی یہ طبیعت تھی آپ میں مسکینی سلیمی، رقت، کسی بزرگ یا بچہ کی عمدہ بات کو فوراً تسلیم کر لینا کسی بے نوا کی خدمت کرنا خدا کے غضب سے ہر وقت ڈرنا ہر ایک سے جھکنا خود فروشی کی بو بھی نہ ہونی اپنے کو ناچیز اور ہیچ جاننا یہ ساری باتیں موجود تھیں۔ اپنا گھوڑا اور زر نقد دینے کے بعد پاپیادہ اور وہ بھی برہنہ پا سفر کرنا پڑا کبھی ایسا اتفاق پڑا نہ تھا سخت تکلیف سید احمد صاحب کو ہوئی چند پیسے بچے تھے جو کسی قدر بھوک میں مدد کر سکتے تھے ورنہ پیارے اور محترم سید کی تو یہی خواہش تھی کہ اگر ان پیسوں اور کمبل کا بھی کوئی حاجت مند مل جائے تو ابھی اس کے حوالہ کر دوں۔

عموماً سنا گیا ہے کہ رستہ میں آپ مسافروں کی خدمت کرتے جاتے تھے اور ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ نے ایک ضعیف شخص کو تیرہ میل اپنے کندھے پر بٹھا کر اس کے گھر پہنچایا تھا۔

جس کی یہ عجیب وغریب فطرت ہو اس کی نسبت ہنٹر جیسا مغربی عالم ناشائستہ الفاظ استعمال کرے، افسوس ہے ان باتوں سے قائل کی نہیں بلکہ اس قوم کی تہذیب و شائستگی معلوم ہوتی ہے۔

رستہ طے کرتے کرتے پیر چھلنی ہو گئے تھے اور ٹھوکروں سے خون بہنے لگا تھا جب یہ

کیفیت ہوئی تو آپ نے ایک سرا میں قیام کر کے کچھ دن وہاں رہنا چاہا اور ارادہ کیا جب تک پیر اچھے نہ ہو جائیں گے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھاؤں گا۔

سرائے کی مہترانی نے نوجوان سید کو اس بے سروسامانی کی حالت میں دیکھا شرافت سے سیادت کے آثار نمایاں دیکھے۔ طباق سے چہرہ اور سرخ و سفید گورے رنگ اور فراخ نمایاں پیشانی سے جو آئینہ کی طرح چمک دیتی تھی وہ پہچان گئی کہ یہ نوجوان ہے تو امیر زادہ شاید والدین سے ناراض ہو کے چلا آیا ہے۔ مہترانی کو یہ کامل یقین ہو گیا از خود اس کے دل میں آیا کہ اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ تلووں سے خون بہتا دیکھ کے وہ آبدیدہ ہو گئی اور سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے اس نے یہ عرض کیا۔ حضرت اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے تلووں کے زخموں پر دوائی لگا دوں، یہ کل تک بالکل اچھے ہو جائیں گے آپ نے انکار کیا اور کہا آپ ہی اچھے ہو جائیں گے جب اس نے بہت اصرار کیا تو مجبور ہوئے اور اس سے دوائی لگوائی، حقیقت میں وہ دوائی ایسی مجرب تھی کہ لگاتے ہی ٹھنڈک پڑ گئی اور شام تک وہ زخم پھریرے ہو گئے، پھر مہترانی نے کھانا پکا کے حاضر کیا سید احمد صاحب نے فرمایا بی مہترانی میرے پاس پیسہ بھی نہیں ہے کہ میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گا میں ایک غریب الوطن شخص ہوں تم ایسے شخص کی خاطر مدارت کیوں کرتی ہو کہ جس سے تمہیں کچھ بھی وصول نہ ہو۔ مہترانی کے دل پر اس تقریر نے اثر کیا وہ بلائیں لے کے کہنے لگی واری جاؤں اس حقیر مہمان داری کو قبول کر لینا ہی میرے شرف کا باعث ہو گا میری کوٹھری میں آپ کا خوش و خرم رہنا میرے ہاتھ دولت لگنے کا حکم رکھتا ہے۔ سچ ہے خدا اپنے پیارے بندہ کو تکلیفیں دے دے کے آزماتا ہے مگر ان تکلیفوں میں اسے ہلاک نہیں ہونے دیتا نہ ایسی مصیبت میں پھنساتا ہے کہ اس کے کامل یقین میں کچھ فرق آوے۔

سید احمد صاحبؒ نے مہترانی کی یہ ہمدردانہ تقریر سن کے خدا کا شکر ادا کیا اور دعا کی کہ اے اس قدر ہمدرد پیرا اس کے توس میں عطا کیجو کہ یہ نہال ہو جائے یہ دعا فوراً قبول ہوئی رات کی شب کو اس کی اندر والی کوٹھری کی دیوار گری اور ایک ہنڈیا اشرفیوں سے بھری

ہوئی برآمد ہوئی۔ مہترانی نے کبھی اشرفیاں خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ اتنی دولت ہاتھ آنے سے پھولی نہ سمائی وہ سیدھی وہ ہنڈیا لے کے سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا ماجرا عرض کیا۔ اشرفیوں کی ہنڈیا دیکھ کے اور اس کی کیفیت سن کے آپ کو دو خوشیاں ہوئیں ایک اپنی دعا کی مقبولیت کی اور دوسری مہترانی کی نیک نیتی کی آپ نے نہایت اولوالعزمی سے وہ ہنڈیا اسی مہترانی کو اٹھا کے دے دی، اور کہا جا خدا تم تجھے نصیب کرے۔ ہر چند اس نے اصرار کیا آپ نے صاف کہہ دیا اس سے زیادہ اگر تو کہے گی تو تیری سرائے میں سے چلا جاؤں گا۔ آخر وہ ناچار ہوئی اور خاموشیانہ ایک محفوظ جگہ پر وہ ہانڈی رکھ آئی۔ بعد ازاں جب آپ دوبارہ لکھنؤ کو آتے ہیں اور راہ میں یہ سرائے آئی ہے تو مہترانی معہ اپنے دو جوان جوان بیٹوں کے جو سفر اول میں نوکری کے متلاشی کہیں نکل نکل کے چلے گئے تھے مرید ہو کے ہمراہ قافلہ ہو گئی اور جس دن سید احمد صاحب معہ اپنے جلیل القدر مریدوں کے شہید ہونے ہیں وہ بھی ایک خونخوار سکھ کی تیغ براں کی شکار ہو کے سید صاحب کی پہلو بہ پہلو پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

القصہ یہاں بآرام پانچ چھ دن تک سید احمد صاحبؒ رہے اور بعد ازاں دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ پیشتر اس کے کہ میں آپ کا دہلی پہنچنا لکھوں اوپر والی بات پر مختصر سا ریمارک کرتا ہوں جو وساوس اور بے نتیجہ شبہات کو دل سے دھوئے گا مہترانی کے لئے سید احمد صاحبؒ کا دعا کرنا اور فوراً اس کا مقبول ہو کے ایک نتیجہ پیدا کر دینا ایک ایسے شخص کو جو قوانین قدرت کا سبق شب و روز جپتا رہتا ہے خلجان میں ڈال دے گا بہتر ہے اس کا اطمینان اسی کے خیال کے مطابق کر دیا جائے۔ دیوار میں سے اشرفیوں کی ہنڈیا کا نکل آنا نہ عجیب بات ہے نہ کوئی غیر ممکن امر ہے۔ کسی نے رکھی ہوگی اب دیوار ٹوٹی نکل آئی چنانچہ ایسا ہر شہر میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اب دعا کا قبول ہونا ایک باریک بات سوانی رہ گئی، میں کہتا ہوں اگر نوجوان سید احمد دعا بھی نہ کرتے جب بھی وہ ہنڈیا وقت معینہ پر دیوار ٹوٹنے سے گر پڑتی مگر طبیعت میں ایک قوت اور مقناطیسی کشش ایسی ہوتی ہے کہ غائبانہ اس کا تعلق فوراً اس سے ہو جاتا ہے کہ کسی چیز کے حدوث کا زمانہ اس کے باطنی قوی فوراً اسے

بتادیتے ہیں گو اس سرگوشی کی خبر اسے مطلق نہ ہوتی پھر بھی اس کے مُنہ سے وہ ہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے یہ انسان کی ہر حالت میں نہیں ہوتا کہ کسی دور دراز غائبانہ چیز کے حدوث کی خبر بہ سبب کشش قلبی کے اس کے باطنی قوی کو ہوا اور ان باطنی قویٰ کی خبرت کا اثر اس کے دل پر ایسا پڑے کہ اسے یہ تو نہ معلوم ہو کہ کوئی مجھے آگاہ کرتا ہے بلکہ از خود بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ فلاں چیز ہونے والی ہے اور وہ قطعی ہو جاتی ہے اسی کو پیش گوئی کہتے ہیں اور یہی الہام ہے مگر ایک وہ پیشین گوئی ہے جسے انگریزی میں پروفیسی کہتے ہیں یہ خاص پیشگوئی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور ان میں عام آدمیوں سے یہ ملکہ زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام باطنی قوئے کے افعال کا پورا علم رکھتے ہیں اور جس طرح ظاہری دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسی طرح باطنی عالم کو بھی اپنی آنکھوں سے نظر کرتے ہیں اور اس کے دیکھنے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں کرنا پڑتا مجھے امید ہے کہ سید احمد صاحب کی قبولیت دعا کے اظہار کے لئے یہ فلسفیانہ ریمارک کافی ہوگا۔

غرض خدا خدا کر کے آپ دہلی میں داخل ہوئے۔ دہلی کا یہ زمانہ گو دین اور شریعت محمدی کے لحاظ سے سخت بدتر حالت میں تھا پھر بھی مسافر نوازی غربا پروری بہت تھی اور خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھر تو ہر مسافر کے لئے وقف تھا۔ یہاں تک کہ پادری یعنی مسیحی فرقہ کے پیشوا بھی یہیں آکر قیام کرتے تھے۔ اور ان کی خاطر و مدارت ایک قابل تسکین طریقہ پر ہوتی تھی۔

جب آپ فرحاں و شاداں دہلی میں داخل ہوئے تو اسی سفری حالت سے سیدھے شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کا سارا روشن چہرہ غبار آلود ہو رہا تھا۔ سیاہ بالوں پر خاک پڑی ہوئی تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے ہو گئے تھے۔ پیر برہنہ تھے، بایں ہمہ سرخوشانہ حالت کی تازگی چہرہ پر جلوہ دکھا رہی تھی۔ لبوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ پھر بھی دم خم وہ ہی باقی تھا۔ سفر کے ناگوار مصائب جب آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کی صورت دیکھی بہ یک لخت شادابی میں بدل گئے تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ جنہیں زمانہ بھر کے علوم و فنون کا ایک کامل مجموعہ کہنا چاہیے

صفائی باطن ص ۲۲

صورت دیکھتے ہی تاڑ گئے کہ اس چہرہ پر جس رنگ کی تابانی ہو رہی ہے وہ غیر معمولی ہے
آپ اس نوجوان بچہ کی تعظیم کو اُٹھ بیٹھے اور معانقہ کرکے اپنے پاس بٹھایا اور تمام حالات
دریافت کئے۔ جب سید احمد صاحب کے والد اور چچا کا نام سُنا آپ نے دوبارہ سید احمد
صاحب سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ اب تو میرا تم سے تعارف نکل آیا تم ایسے شخص کے بیٹے
ہو جو اپنے وقت کا غوث اور قطب تھا۔ اس کا دنیا سے بے علاقہ ہو کے زندگی بسر کرنا
اور زہد و غنا میں اپنی تمام عمر گزارنا ہنوز لوگوں کو یاد ہے، اور وہ اسے اسی سبب سے
زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان معمولی باتوں کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب نے آرام کرنے
اور کھانا تناول کرنے کا حکم دیا۔ اور اپنی مسجد میں قیام کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔

جب کئی دن سید احمد صاحبؒ کو دہلی میں آئے ہوئے گزر گئے اور سفر کی تکان بالکل
اُتر گئی تو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا میاں صاحبزادہ بہتر ہوگا اگر آپ درس وتدریس
کا سلسلہ شروع کر دو گے۔ سید احمد صاحبؒ اپنی طبیعت کا مذاق بخوبی جانتے تھے انہیں علم
تھا کہ مجھے ہرگز کتابی سبق یاد نہ ہوگا مگر اس خیال سے انکار نہ کیا، شاید شاہ صاحب اس
طریقہ سے پڑھائیں جس سے سمجھ میں آنے لگے اور خود بخود طبیعت میں سمجھنے اور کتاب کے
پڑھنے کا مذاق آجائے۔

سید احمد صاحبؒ کا عین منشا یہی تھا کہ کسی طرح میں لکھ پڑھ کے فاضل اجل بن
جاؤں مگر طبیعت کے رجحان کو کیا کرتے کہ اس طرف رجوع ہی نہیں ہوتی تھی۔ یہ سید احمد صاحب
کی اول درجہ کی خاطر منظور تھی کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے خود درخواست کی ورنہ تمام عراق
عرب اور عراق عجم۔ ایران شام وغیرہ سے اسی اشتیاق میں لوگ چلے آتے تھے۔ کسی طرح
شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے کچھ پڑھیں، سید احمد صاحبؒ نے اپنی خوش نصیبی جانی اور آرزو
کی کہ میرا دل کتاب خوانی کی طرف رجوع ہو تاکہ میں بھی شاہ صاحب ممدوح کے زمرۂ تلامذہ
میں گنا جاؤں مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا وہ کچھ اور سامان کر رہی تھی اور کسی اور چیز کی
تیاری میں مشغول تھی اسے یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ بزرگ سید اپنے کئی بیش قیمت سال
کتابی حروف شناسی میں صرف کرے بلکہ جو مادہ یا جوہر فطرت نے سید احمد صاحب کو بخشا

تھا وہ مطالب ربانی اور مقاصد نبوی سمجھنے اور انہیں اپنے ذہن میں نشین کرنے کے لئے کافی تھا۔

جب سید احمد صاحب نے شاہ صاحب ممدوح کی درخواست کو قبول کر لیا تو آپ نے ایک ایسا تخلیہ کا وقت تجویز کیا جس میں کوئی دوسرا طالب علم نہ ہو اور بخصوصیت سے تعلیم دی جائے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے وقت کے فرد اکمل تھے، اور ان کا فرد اکمل ہونا ڈاکٹر ہنٹر نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کیا تمام عرب روم اور قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ شاہ عبدالعزیز جیسا اپنے باپ شاہ ولی اللہ کے بعد کوئی دوسرا ماہر علوم و فنون پیدا نہیں ہوا۔ آپ کو جیسا علوم دینیہ پر عبور تھا اسی طرح علوم عقلیہ مروجہ پر پوری دستگاہ حاصل تھی۔ قیافہ شناسی میں جس کا موجد سقراط حکیم ہے۔ شاہ صاحب کو کامل دخل تھا اور آپ صورت دیکھتے ہی اس قدر ضرور پہچان جاتے تھے کہ یہ طالب علم غبی ہے یا ذہین ہے اور اس کا کس قسم کا مذاق ہے۔ طبیعت میں صلاحیت ہے یا کرخت پن ہے یہ ملکہ عموماً ان ہی اشخاص میں ہوتا ہے جن میں فطرت کی باطنی قوتوں میں رک اور اس کے پوشیدہ یا ان دیکھے جوہروں کا کسی قدر علم ہو۔

یہ باریک باتیں اور ادق مضامین سرسری طور پر عبارت کو پڑھنے اور لفظی بحث میں پڑ جانے سے سمجھ میں نہیں آنے کے جب تک ان علوم سے کسی قدر واقفیت نہ ہو جن کی بابت ہم ذکر کر رہے ہیں۔

اسی بنا پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے پہچان لیا تھا کہ اخذ مطالب اور ان سے از خود متاثر ہونے کی سید احمد میں غیر معمولی قوت ہے، ایسا شخص اگر باقاعدہ تعلیم پائے تو اس کے علم و فضل کا کیا ٹھکانا ہے۔ اور گزشتہ زمانہ میں جن لوگوں نے ایسا جوہر ذاتی رکھ کے تعلیم پائی ہے انہیں آج حکیم کے نام سے یاد کرتے ہیں اور انہیں اپنے وقت کا بہت بڑا ریفارمر دمصلح، تسلیم کرتے ہیں۔

ایسی طبائع جن میں مطالب ربانی اخذ کرنے اور ان سے موثر ہونے کا کامل مادہ ہوتا ہے۔ کتاب خوانی کی طرف رجوع نہیں ہوتیں۔ ہر چند کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا مذاق

کتاب خوانی کسی طرح بڑھ جائے مگر وہ ایک ایسی زنجیر میں جکڑی ہوتی ہیں کہ اسے توڑ کے باہر نکل آنا اور خلاف عادت کرنا ایک کٹھن کام ہے۔

عموماً لوگ یہ خیال کریں گے کہ جن میں کتابی تعلیم نہ دی گئی وہ لاکھ کچھ معاملہ فہمی کی قابلیت رکھتے پھر بھی وہ ایسا لائق نہیں بن سکتا جیسا کتاب خواں مجھے اس خیال اور ایسی کج دلوں پر تاسف آتا ہے میں اس بات کا ہرگز قائل نہیں ہوں میں کبھی اس شخص کو فاضل نہیں کہہ سکتا کہ جس نے تمام جہان کی کتابیں تو پڑھ لی ہیں مگر جو کچھ پڑھا تھا اس سے کچھ حاصل کیا نہ پڑھی ہوئی باتوں سے اپنی ذاتی یا قومی فائدہ بخش تدابیر کا ایک سلسلہ پیدا کیا۔ ایسا شخص جس نے معمولی تعلیم پا کے بہت کچھ حاصل کر لیا اور بہبودی قوم کی وہ صورتیں قائم کیں کہ جن پر ایک زمانہ عش عش کر گیا۔ سابق الذکر سے کہیں افضل ہے۔ اس کے علاوہ فیثاغورث سقراط اور اس کے شاگرد افلاطون وغیرہ حکما پر خیال کیا جائے کہ ان حکما نے کونسی کتابی تعلیم پائی تھی اور کونسی الف بے تے شروع سے پڑھی تھی اور کب الف کے ابن ابی ابی حرمت ابن ابی بابچا تھا انہیں صرف زبانی تعلیم ملی تھی۔ انہیں جانے دو اپنے اسلامی علماء کو لو مثلاً امام ابو حنیفہ امام اعظم، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل کونسی کتابی تعلیم حاصل کئے ہوئے تھے جن کے علم و فضل کا آج تک ڈنکا بج رہا ہے۔ اور صدیوں کے گزر جانے کے بعد بھی ان کے نام لیوا کروڑوں مسلمان موجود ہیں یہ سب زبانی تعلیم پائے ہوئے تھے کتابی تعلیم نہ انہیں نہ ان کے بڑے بڑے اساتذہ کو ملی تھی گو شاہ عبدالعزیز صاحب پہچانتے تو بخوبی تھے کہ سید احمد میں کتاب خوانی کا مذاق بہت کم ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی خیال تھا اگر میری وجہ سے مذاق بڑھ گیا تو یہ اپنے وقت کا شیخ الکل ہوگا۔ اسی خیال سے آپ نے کتابی تعلیم دینی شروع کی کئی مہینے تک پڑھایا مگر کچھ حاصل نہ ہوا، سید احمد صاحب کی طبیعت بھی زچ ہو گئی اور شاہ عبدالعزیز صاحب بھی بولا گئے نتیجہ یہ ہوا کہ جب سید احمد صاحبؒ کتاب لے کے بیٹھتے تھے تو حروف آنکھوں میں پھرنے لگتے تھے جیسا اکثر ضعیف دماغ والوں کو یہ مرض عارض ہوتا ہے مگر ہم سید احمد صاحب کی دماغی بیماری یا ضعف کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ ناظر سوانح کی توجہ اس ناقابلیت دماغ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سید احمد صاحب کو اول

دن سے حاصل تھی ۔ ہزار طرح کی کوشش کی کہ سید احمد صاحب کو کچھ آجائے مگر دل ہی نہ لگا۔
آخر شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی کتابی تعلیم سے رخصت دی اور بزرگ نوجوان سید کو زیادہ
مجبور نہ کیا۔

پھر آپ نے اجازت دے دی کہ قرآن خوانی اور حدیث کے پڑھنے کے وقت آپ موجود
ہوا کریں، سید احمد صاحب نے اس کی بھی بجا آوری کی، اور آپ ان طلبہ کے حلقہ میں جو تفسیر
و حدیث پڑھتے تھے شریک ہونے لگے بر خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا ہوا، اور
آپ کو اکثر حدیثیں اور تفسیر قرآن کا بہت سا حصہ نوک زبان ہوگیا۔

اس سے زیادہ کتاب خوانی سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے یہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ آپ
میں مقاصد ربانی سمجھنے اور ان سے موثر ہونے کی امتیاز یہ قوت حاصل تھی پھر جو کچھ حدیث و
قرآن سمجھ کے آپ کو فائدہ حاصل ہوا وہ معرض تحریر میں نہیں آسکتا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب بہت خوش ہوئے اور محترم نوجوان سید کی قرآنی اور نبوی مطالب
کا یہ مذاق دیکھ کے پھولے نہ سمائے اور کہنے لگے الحمدللہ تمہیں یہاں آنے سے اس قدر تو
فائدہ ہوا کہ آج تم اپنے ہم وطنوں میں بآزادی پند و نصائح کر سکتے ہو چند سوانح نویسوں
نے افسوس ہے کہ سید احمد صاحبؒ کی وہ وہ باتیں بیان کی ہیں جس سے ان کی اصلی شان
بھی مٹ گئی ان کے سوانح کا دیکھنے والا کبھی کسی انسانی صفت پر خیال نہیں جما سکتا کہیں
تو اس پارسا نیک مرد کو نعوذ باللہ نبی بنا دیا ہے۔ کہیں اس کی تمام حرکات سکنات کو
مافوق الفطرت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کہیں ان میں وہ قوت بخشی گئی ہے جو ایک دیو میں
بھی نہیں ہوسکتی۔ کہیں ان کے بول سے ایک عظیم الشان کھیت کو جلایا گیا ہے۔ کہیں ان کے
لئے آسمان سے حلوے کا طباق اتروایا گیا ہے۔ کہیں میلہ ہنود میں لے جا کے انہیں بیہوش
کیا گیا ہے اگر خود سوانح نویس خیال کر لیتے اور دین اسلام کے واجب الاعتصام بانی کے
انہیں سوانح عمری یاد ہوتے تو وہ کبھی ایسی مضحکہ خیز اور طفلانہ باتیں اس بزرگ سید پر ماید
کرکے اس کی اصلی ذاتی لیاقت اور اصلی جوہر کو نہ مٹا دیتے۔

جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سنگ دل قریشیوں کے خوف سے غار ثور میں پوشیدہ

ہوئے تھے۔ اور آپ کے ساتھ آپ کا پیارا محترم ساتھی صدیق اکبر تھا تو وہاں تین دن تک خلیفہ اعظم کی صاحبزادی دونوں نبی اور آپ کے صحابی کو کھانا پہنچا آتی تھیں۔ کسی حدیث یا اثر یا آیت یا روایت یا تاریخ میں ہم نے تو دیکھا نہیں کہ حلوے مانڈھے کا کوئی طباق غیب سے اترا ہو یا ہمارے ہادی برحق ہادی حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو عین بت پرستی اور کفر و ارتداد کی رسوم دیکھ کے کبھی غش آیا یا اگر غش آنا عصمت اور اذعان قلبی ہے جیسا کہ ایک سوانح نویس نے لکھا ہے تو انبیاء علیہم السلام کو بدرجہ اولے ہونا چاہیئے اگر ایک اُمتی بسبب اپنی عصمت یا اذعان قلبی کے بت پرستی کی رسمیں دیکھ کے بیہوش ہو سکتا ہے تو اس کے مقابلہ نبی کو تو مر جانا چاہیئے۔ اس لئے وہ سرتاپا معصوم ہوتا ہے۔

کبھی سید احمد صاحب کی ٹوپی سے بقعۂ نور اڑایا جاتا ہے حالانکہ نہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نہ آپ کے چار صحابہ میں سے کسی صحابہ کے عمامہ یا کلاہ سے نور کا بقعہ کبھی اڑا۔ اگر یہ فوق الفطرۃ باتیں ایک ادنیٰ امتی کی وجہ فضیلت ہو سکتی ہیں تو خود نبی اور اس کے صحابہؓ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے اور بھی درجہ فضیلت ہو سکتی ہیں۔

مگر مذہب اسلام ان فرضی فوق الفطرت باتوں کی تردید کرتا ہے۔ اس نے رہبانیت اور اس کے باطل کرشموں کا بطلان کیا ہے وہ ان مداری کے کھیلوں کو بُرا بتاتا ہے جن سے جاہل اور سادہ لوح بدمعاشوں کے پھندہ میں پھنس کے اپنا روپیہ اور عزیز وقت صرف کر دیتے ہیں اور سوائے پشیمانی کے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔

میں کہتا ہوں اگر سید احمد صاحب کے سوانح عمری میں صرف ان مذکور الصدر باتوں کا تذکرہ ہو جن سے نبی آخر الزمان کی ذات مقدس بہت مستبعد تھی تو پڑھنے والا سید احمد صاحب کو کیا سمجھے کیا خیال کرے آیا انہیں قطب سمجھے غوث جانے یا نبی کہے اور کیونکر ان کی اعلیٰ قابلیت کا نقشہ ناظر سوانح کے ذہن نشین ہو سکتا ہے۔

جب ان کے سوانح نویسوں اور بعض سادہ لوح ساتھیوں نے ناحق بزرگ سید کی ذات پر یہ گھڑی ہوئی باتیں عاید کیں اور بے فائدہ اپنی تراشی ہوئی گپیں اس کے سر چپکیں اس بزرگ ذات کی غیر معمولی فضیلت اور افضلیت بڑھانے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہم آپ سے

میں پھر بھی کہتا ہوں کہ عملی زندگی درست ہونی چاہیئے۔ لاکھ کچھ پہلے مخالفت ہوئی پھر بھی اپنا پرلیا آخر کار اپنے سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔

سید احمد صاحب کی غیر معمولی تعظیم ان کے ہم وطنوں نے کی ہمیں اس بات کا اور بھی ثبوت دیتی ہے کہ وطن میں بھی عزت کی جاتی ہے گو اس کے لئے زمانہ دراز کی ضرورت اور صبر و استقلال ہمت اور جوانمردی کی حاجت ہے۔

غرض جب سید احمد صاحب کو آپ کے ہم وطنوں نے مجبور کیا کہ آپ ہم سے بیعت لے لیں اور ہمیں اپنا مُرید بنالیں آپ نے انکار کیا اور فرمایا مسلمان کو خدا و رسول کی مریدی کافی ہے جھوٹ نہ بولو، کسی کو دھوکا نہ دو، اپنے فائدہ کے لئے دوسرے کا نقصان نہ کرو۔ پس یہی نومیت ہے۔ اگر تم کسی پیر کے مُرید بھی ہو گئے اور تم نے یہ باتیں بھلا دیں تو وہ مریدی کچھ فائدہ نہ دیگی اور مرید ہونے پر تم نے مذکورہ باتوں پر نیک نیتی سے عمل کیا پھر تمہیں نہ کسی پیر کی ضرورت ہوگی نہ کسی ولی کی تم اپنے آپ پیر بنو اور اپنے نفس سرکش کو اپنا مرید بناؤ اس سے بیعت لو کہ وہ پھر اپنے کو شیطانی وساوس کا تتبع نہ کرے بس یہی صورت نجات دارین کی کافی ہے۔

ہمارا فاضل عبدالقیوم بریلوی جس کی قلمی تحریرات سے جس میں سید احمد صاحب کے بعض بعض حالات درج ہیں ہم نے یہ بیان نقل کیا ہے وہ ہمارا اطمینان کرتا ہے کہ جو باتیں میں نے تحریر کی ہیں وہ چشم دید بھی ہیں۔ اور سید صاحب کے معتبر دوستوں سے سُنی ہوئی بھی ہیں۔ اس مصنف نے سید احمد صاحب کے خاندان کا ذکر کیا ہے اور بڑی بڑی کرامتیں آپ کے آباؤ اجداد کی نہایت رنگ آمیزی سے بیان کی ہیں مگر یہ تعجب سے دیکھا جاتا ہے۔ باوجودیکہ مصنف کتاب کرامات فوق الفطرت کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی اس نے سید احمد صاحب کی ان کرامتوں کا جن سے ہمارے ہمعصر سوانح نویسوں کے صفحے سیاہ ہو رہے ہیں کہیں بھی تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ بجائے اس کے پارسا، متقی، پرہیزگار، صائم الدہر، سچا، نیک بخت، شیریں کلام، خلیق، خود فروشی اور خود نمائی سے کوسوں دُور ان ان صفتوں سے ہم [illegible] نے سید احمد صاحب کو یاد کیا ہے۔ ہم اس کے ساتھ بالکل ہمزبانی کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان صفتوں کا سید احمد صاحب میں بہت بڑا حصّہ تھا۔

تھا۔ مسیں بھیگنے لگی تھیں۔ اور سبزہ کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ صورت پر گو مسکینی، حلیمی، سنجیدگی انفعال ناچارگی، خوف ادب ہویدا تھا مگر ساتھ ہی ان رنگوں کے پہلو بہ پہلو شجاعت، نڈر دلیری، بیباکی، دریادلی، آزادی، بے خوفی صاف صاف عیاں تھی۔ اس حسن خداداد پر انکسارانہ طبیعت کا ہونا اور بھی غضب ڈھا رہا تھا۔ دل میں وہ غیر معمولی غیر خوش آئندہ جوشوں کے ابھار کا نوجوان کی طرح مادہ مضمر تھا مگر خدا کا خوف اور اس کی شرم ڈراتی تھی۔

جس نے ان تمام بے محابا آرزوؤں اور غیر نتیجہ جوشوں کو اندر ہی اندر دل میں ایسا ملیامیٹ کر دیا تھا کہ وہ پھر ساری عمر بھی نہ ابھرے۔

جب کہ اسلام اور اس کے روشن اصول نے بہت کچھ باطنی اور ظاہری حالت پر افسوں پڑھ کے مار دیا تھا اس لئے آپ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ غیر اسلام کی ملازمت کر کے مسلمانوں پر تلوار اٹھاؤں۔ طبیعت کی اس پر جوش حالت نے امیر خان پنڈاری کے لشکر کی طرف جو مالوہ پر پڑا تھا رہنمائی کی، اور آپ نے وہاں جا کے سواروں میں ملازمت اختیار کی۔

امیر خان کے لشکر کی کوئی باقاعدہ تنخواہ نہ تھی کسی ریاست پر چھاپہ مارا، اگر وہاں سے کچھ ہاتھ لگ گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے۔ لٹیروں کی سی کیفیت تھی، کبھی جے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جودھ پور پر جا دوڑا وہاں ایک تلکم مچا دی۔ زیادہ تر راجواڑوں ہی سے لڑتا رہتا تھا کیونکہ ان سے کچھ ہاتھ ہی لگ جاتا تھا اس نے جان کر کبھی انگریزی مفتوحہ ممالک پر حملہ نہ کیا ہاں کسی راجواڑے کی حملہ آوری سے اسے روکا گیا تو اس نے انگلش سے بھی شمشیر بازی میں دریغ نہ کی مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ ایسی بھی خواہش کئی بار کی گئی کہ اس شیر نیستاں کو گرفتار کر لیں مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ اس مختصر کیفیت سے یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ امیر خان کے سپاہیوں کی زندگی جس قدر خطرناک رہتی تھی اس قدر چاق و چست اور شمشیر زنی میں بسر ہوتی تھی جو سپاہیانہ قالب کی سچی روح ہے۔

جب سید صاحبؒ نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خان کے آگے پیش کئے گئے وہ دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ اور اس نے یہ کہا اگر اپنی جان کھپا کے محنت کی اور اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار فوج کا افسر بنا دوں گا یہ سن لے آپ

نے سوا اس کے اور کچھ جواب نہ دیا خدا میں سب قدرت ہے۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ ناصح کی زبانی پند و نصائح سے اس کی عملی زندگی لوگوں پر زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ سید احمد صاحبؒ کی عمدہ زندگی ایسی پر اثر تھی کہ فوج میں بھی کثرت سے لوگ آپ کے مرید ہو گئے بیعت نہیں کی بلکہ دل سے معتقد ہو کے بزرگ جاننے لگے، آپ کی صداقت اتقا، عبادت، خوش خلقی، شیریں زبانی ایسی تھی جس نے زبردستی لشکر کو آپ پر مائل کرا دیا۔ یہاں تک کہ امیر خان نے بھی آپ کے اتقا پرہیزگاری کی کیفیت سن کے اپنے اپنے باڈی گارڈ کا افسر بنا دیا۔ اور پھر آپ کی ہر حالت پر غور کرنے لگا۔ اس عرصہ میں روشن ضمیری کو اس قدر ترقی ہوئی کہ آپ کبھی کبھی ظاہرا اسباب کی طرف نگاہ کر کے کسی آئندہ واقع کی پیش گوئی کر دیتے تھے، اور بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ آپ کی پیش گوئی نے کبھی دھوکا نہیں کھایا اور وہ معاملہ ہو کے ہی رہا۔ معمولی آدمی کے آگے ایسی ایسی پیش گوئیوں کا ہونا اور پھر پورا ہونا ایک بہت بڑی بات ہوتی ہے اور وہ ایسے شخص کو خبر نہیں کیا کا کیا سمجھنے لگتا ہے۔ مگر ہوشیار اور ان بھیدوں کا واقف جانتا ہے کہ صفائے قلب سے طبیعت میں ایک ملکہ ہو جاتا ہے کہ ظاہر اسباب دیکھ کے اس آئندہ نتیجہ کی پیش گوئی کر دی جائے، اور پھر وہی ہو رہے۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو تمام لشکر میں ایک دندپخ گیا، اور ہر شخص آپ کو ولی سمجھنے لگا۔

اس عرصہ میں دو تین گڑھیاں بھی آپ نے بڑی بیباک دلیری اور خطرناک شجاعت سے ہلہ کر کے فتح کیں اور حملہ کرتے وقت امیر خان اپنے آقا سے کہہ گئے تھے کہ ان گڑھیوں کی فتح میرے ہی دست قدرت پر تقدیر ہو چکی ہے۔ معمولی عقول کے آگے تو یہ تین تین شہادتیں ولی سمجھنے کے لیے بہت ہی کافی ہیں۔

جب پے در پے یہ باتیں سید احمد صاحب سے ظہور پذیر ہوئیں پھر تو امیر خان نے اپنا مشیر مقرر کر لیا، اور کوئی کام بغیر آپ کے مشورہ نہ کرتا تھا۔ ساتھ ہی ان کامیابیوں کے جو سید صاحب کو حاصل ہوئیں یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے اس ترقی پر بھی اپنے فرائض کے انجام دینے سے پہلوتہی نہ کی یعنے قرآن و حدیث کا وعظ برابر رہتا تھا اور کبھی کوئی فقرہ کسی حالت میں ایسا زبان پر نہ آتا تھا جس سے پہلے قال اللہ یا قال رسول اللہ نہ

کے مرتبہ کی بزرگی کی اس کے موافق ہرگز عزت نہیں ہو سکتی۔ کوئی چیز ہو جب تک اس پر بہت بڑا وقت محنت کا صرف نہیں ہوتا کبھی اس کی قیمت نہیں بڑھتی مگر افسوس یہ ہے کہ اس تسلیم کرنے پر بھی اور اس مسلہ مسئلہ کو مان کر بھی انسان کی مطلق قدر نہیں ہوتی۔ ہزاروں لاکھوں برس اس کو موجودہ شائستہ حالت میں لانے کے لئے صرف ہو گئے ہیں تاکہ زندگی کی قیمت سمجھ کے اس سے بہبودیٔ خلائق کے اعلیٰ تر نتائج نکال سکے اور یہ صرف اس سے زیادہ تر غیر محدود صبر اور وسیع مدت کا سبب ہے جو ہم نے لاانتہا زمانہ تک جھگتی ہے، اور اس عرصہ کا تحمل کیا ہے۔

انسان کی بے پایاں قوتوں کا ہم کیونکر ادراک کر سکتے ہیں۔ ہمیں ہرگز ہنوز تمیز حاصل نہیں ہوا ہے کہ ہم موت اور زندگی کی پرزور قوتوں کو دیکھیں سمجھیں اور ان پر غور کریں کہ یہ کیونکر ہیں اور ان میں کیا فطرتی بھید مضمر ہیں پھر بھی اس کی ذات کی عجیب و غریب بزرگی اور لاانتہا جلال پر نظر کرنے سے اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کائنات کا لب لباب ہے جب حقیقت میں خود انسانی ذات کو اتنی سربلندی خدائی طرف سے ودیعت کی گئی ہے افسوس ہے اسے بزرگ بنانے کے لئے کہیں اس کے لئے حلوے کا طباق آسمان سے اتروایا جاتا ہے۔ کہیں اس سے ہزاروں من کا درخت تماﺅں کی طرح اٹھوایا جاتا ہے۔ اور کہیں اس کے بول سے کھیت کے کھیت مخالفوں کے جلائے جاتے ہیں استغفر اللہ توبہ توبہ۔

** سنہ ۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خان کی ملازمت میں رہے مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرا دی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دئے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے دینے طے پائے تھے لارڈ ہیسٹنگ سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا، اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خان لارڈ ہیسٹنگ اور سید احمد صاحب سید احمد صاحب نے امیر خان کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا آپ نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا جھگڑنا تمہارے لئے بڑا نہیں ہے تو تمہاری اولاد کے لئے سم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں

پے در پے تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا، اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابل میں کون میدان جنگ میں لا کے جمائے گا۔ یہ باتیں امیر خان کی سمجھ میں آگئی تھیں، اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کے لئے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں بآرام بیٹھوں۔ امیر خاں نے ریاستوں اور ان کے ساتھ انگریزوں کا بھی ناک میں دم کر دیا تھا۔ آخر ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحبؒ کی کارگزاری سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کے امیر خان سے معاہدہ کر لیا۔ جیسے جے پور سے ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج اسی طرح سے متفرق پرگنے مختلف ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد انگریزوں نے دلوا کے بھرے ہوئے شیر کو اس حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا۔

یہاں ایک بات قابل نوٹ ہے اور وہ یہ ہے کہ سید احمد صاحب تقریباً سات برس تک امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ کو بارہا مختلف جنگوں میں جانے اور توپ و بندوق و تلوار سے کام لینے کا موقع پڑا ہوگا کہیں کسی کے ساتھ آپ نے حملہ کیا ہوگا تو کہیں سرکش گاؤں کو لوٹا کھسوٹا ہوگا۔ غرض سارے ہی باتیں جن سے جنگ و غارت تعبیر ہو سکتی ہے۔ عمل میں آئی ہوں گی۔ اس بنا پر ڈاکٹر ہنٹر سید احمد صاحب پر ناحق غارت گری کا الزام قائم کرتا ہے چنانچہ اپنی کتاب انڈین مسلمان کے صفحہ ۱۱ میں یہ تحریر کرتا ہے: "اس نے (یعنے سید احمد صاحب نے) اپنی زندگی ایک سوارسے مشہور قزاق (یعنے امیر خان پنڈاری) کی ملازمت میں شروع کی، اور مدت تک مالوہ کے بار آور افیم کے گاؤں یا کاشت کو برباد کرتا رہا۔" پھر اسی صفحہ میں آگے چل کے لکھتا ہے "ایسی حالت میں کہ جب سکھوں کے بدتر نظم و نسق نے پڑوسی مسلمانوں کو بولا دیا تھا سید احمد صاحب نے قزاقی کا پیشہ چھوڑ کے عاقلانہ طور پر اپنے کو وقت کے مطابق بنایا اور ۱۸۱۶ء میں مذہبی علوم پڑھنے کے لئے دہلی کے مشہور و معروف ڈاکٹر (یعنے شاہ عبد العزیز صاحب) کی خدمت میں حاضر ہوا۔"

اس تحریر سے ڈاکٹر ہنٹر کی اصلی معاملات سے بے خبری اور خیالی پلاؤ پکانے اور ایک معاملہ پر فرضی رائے قائم کرنے کا پورا حال کھلتا ہے، اول تو قزاق کے نام سے سید احمد صاحب

کو متہم کرنا امر بیجا جمنٹ کی طرف خیال پھیرتا ہے دو باتیں ہیں اول تو ڈاکٹر صاحب کو جب انہوں نے ان واقعات کے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہوگا حالات ہی نہیں معلوم تھے۔ دوسرے ان کی ابتدائے تحریر سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ وہ جس طرح ان سے ہو سکے گا مسلمانوں کو باغی بنانے اور گورنمنٹ کو ان کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ختم کتاب تک انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ اُن کی ۲۱۸ صفحے کی کتاب غلطیوں کے انبار سے جیسے بھری ہوئی ہے اسی طرح بیجا تحکم اور غلط منطق کی ہر جگہ جھلکی پائی جاتی ہے۔ کاش اگر کچھ بھی انصاف ہوتا تو وہ مظلوم مسلمانوں کو ایسا متہم نہ کرتے۔

دوسرا سفر دہلی

جب سید احمد صاحبؒ نے اپنی زندگی کا ایک حصہ سپاہیانہ معاشرت میں صرف کر لیا اور ساتھ ہی دل کھول کے اپنے مذہبی فرائض کی بھی انجام دہی کر لی تو پھر آپ نے دہلی کی طرف رجوع کیا۔

یکایک امیر خان کی ملازمت سے ترک تعلق کر کے دہلی کی طرف رخ کرنا متعلق بھید کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی کُنہ کو ہر شخص نہیں پہنچ سکتا۔ فطرت کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ جس کام کے لئے آپ کو بنایا تھا آپ اس کے قابل ہو گئے ہیں تو از خود طبیعت نے اس عظیم الشان کام کا چارج لینے کے لئے دہلی بلا لیا۔

جب آپ دہلی میں تشریف لائے تو شاہ عبدالقادر صاحبؒ مترجم قرآن مجید و برادر حقیقی شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی مسجد میں مقیم ہوئے۔ امیر خاں کی ہفت سالہ ملازمت نے آپ کی ولایت کی دھوم بڑے زور شور سے تمام قرب و جوار میں پھیلا دی تھی اور دوسرے بڑی بات یہ تھی کہ آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ میں ہزاروں روپیہ لشکر میں سے چندہ کر کے بھجوایا تھا۔ دہلی تک آپ کے اتقاء پرہیزگاری اور سب سے زیادہ صاحب باطنی ہونے کی آوازیں لوگوں کو چونکا کر رہی تھیں۔ یہاں مولانا شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نے جو کچھ دھوم مچا رکھی تھی اس کا ذکر مولانا ممدوح کی سوانح عمری میں ابھی دیکھ چکے ہو۔ ادھر شاہ اسمٰعیل صاحب کسی

ایسے رہبر کی تلاش میں تھے کہ جس کی متابعت میں حسب دلخواہ سکھوں سے عوض لیا جاتے۔ ادھر سید احمد صاحب کو ایسے ایک مدبر کی ضرورت تھی کہ جو جیسا فاضل اجل ہو اسی قدر لڑاکو مرد میدان بہادر اور مدبر سلطنت ہو خدا کی قدرت دونوں بر تر نفوس کی خواہشیں پوری ہوگئیں۔ اور ہر ایک نے ایک دوسرے سے مل کے یہ پڑھا۔

دیر باش اے وقت تو خوش وقت ما خوش کردہ

شادوے چندانکہ پندد بروز مانت انقضار

ادھر شاہ اسمٰعیل صاحبؒ اور مولانا عبدالحی صاحب نے بیعت کی اور ادھر تمام شہروں میں سید احمد صاحب کا ایک دندمچ گیا۔ دہلی سے پٹنہ تک لوگوں کا دن بدن حسن اعتقاد بڑھتا جاتا تھا اور ہر شہر سے ہزاروں روپیہ اور خود لوگ چلے آتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے حکم دیا کہ آپ بطور خود آس پاس کے شہروں میں وعظ فرمادیں۔ چنانچہ سید احمد صاحب بجرد حکم اپنے پیرومرشد کے روانہ ہوئے۔ اور [illegible] اپنی خوش بیانی کی وجہ سے [illegible]۔ چار برس کے عرصہ میں نوجوان پیر نے ہزاروں کو اپنا مرید بنالیا۔ اور ایک عجیب روح لوگوں کے دلوں میں محمدی مذہب کی پھونک دی۔ سب نے شرک و بدعت سے توبہ کی، اور سچے عامل بالحدیث بن گئے۔

اس عرصہ میں ایک بار اور بھی سید احمد صاحب کو اپنے وطن میں جانے کا اتفاق ہوا، کیونکہ آپ کے بھائی کا انتقال ہوگیا تھا چند ماہ تک اپنے وطن میں رہے، اور پھر پٹنہ اور کلکتہ کے سفر میں روانہ ہوئے، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبدالحی صاحب ہمراہ تھے۔ یہاں ایک شخص عبدالرحیم نامی دہریہ رہتا تھا جو شاہ عبدالعزیز صاحب کا بھی شاگرد تھا۔ اور مذہبی علوم میں بھی کامل مہارت رکھتا تھا مگر اسے خدا سے انکار تھا اس لئے مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ اسے عبدالرجیم کہتے تھے۔ اس سے بھی دو تین مناظرے ہوئے گو وہ ساکت تو ہوگیا مگر اپنے دہریہ پنے سے باز نہ آیا۔ کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے، اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے آپ نے جواب دیا ان پر جہاد کسی طرح واجب

(تجدید تازیانہ ص ۶۱)
(صاعقۃ الرحمٰن ص ۲۲۵)

نہیں ہے ایک تو ان کی رعیت ہیں دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے بلکہ اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔

سید احمد صاحبؒ نے سکھوں پر جہاد کرنے کے لئے روپیہ جمع کرنے کے واسطے مختلف شہروں میں خلیفہ مقرر کئے ان کا یہ کام تھا کہ در قصبہ اور گاؤں بگاؤں وعظ کہتے پھریں، اور سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے روپیہ جمع کریں۔ چندہ جمع کرنے والوں کا دارالخلافہ پٹنہ کو سمجھنا چاہئے، جہاں سب سے زیادہ گرمجوشی سے چندہ جمع ہوا تھا، اور بنگالہ کا ایک حصہ اپنی جان اور دھن قربان کرنے کو آمادہ تھا۔

ابھی مجاہدین اور روپیہ جمع ہونے کے لئے ایک عرصہ دراز کی ضرورت تھی۔ اس نظر سے یہ بہتر سمجھا گیا کہ حج بیت اللہ ہی کر آنا چاہیئے۔ جب تک سید صاحب کے خلفا چندہ اور آدمی جمع کرتے رہیں گے۔

چنانچہ یکم شوال ۱۲۳۶ھ بروز عید الفطر بعد ادائے نماز سید بریلی سے بارادۂ حج روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمرائیوں کی تعداد معہ عورتوں اور بچوں کے چار سو سے زیادہ نہ تھی۔ اس قافلہ کا خرچ کچھ سید صاحب کے ذمہ تھا اور بعض مال دار لوگ اپنے آپ کفیل تھے مگر سید صاحب نے فرما دیا تھا کہ ہم سارے قافلہ کا خرچ اٹھائیں گے۔ کوئی شخص ایک پیسہ بھی نہ خرچ کرے آئندہ وقت پر دیکھا جائے گا۔

یہ کہنا محض غلط ہے کہ حج پر روانہ ہونے کے وقت سید صاحب کے پاس کل تین سو روپے تھے، اور انہیں بھی تقسیم کر دیا تھا اور پھر چھ سات روپے رہ گئے، اور آپ ان ہی چھ سات روپوں پر بے محابا مکہ شریف کو چلے جانے پر تیار تھے۔ ان مضحکہ خیز اور لایعنی باتوں کے لکھنے سے کیا حاصل۔ ہمارا معزز مصنف بریلوی ساٹھ ہزار روپے اور بہت سا جواہر لکھتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ ہو گا کوئی سید احمد صاحب خدانخواستہ مجنون تو تھے ہی نہیں کہ چھ سات روپیہ پر چار سو آدمیوں کو حج بیت اللہ کرانے کے لئے لے کے چلے تھے نہ انہیں علم غیب تھا کہ رستوں میں ضرورت کے موافق تیار ہو جائے گا ایسی موہوم امید

میں ناکامی اور کامیابی دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں۔ عقلمند جب کوئی کام کرتا ہے اس کا سامان سب درست کر لیتا ہے مگر یہ اس کی شان عبودیت ہے کہ پھر بھی اپنی کامیابی خدا ہی کی عنایت خاص پر چھوڑتا ہے۔ رستہ میں ہر مشہور مقام پر سید احمد صاحب کی دعوت زر نقد سے بھی ہوئی اور یوں بھی طرح طرح کے کھانے کھلائے گئے۔ یہاں تک کہ آپ بخیر و عافیت بمبئی کے بندر گاہ پر پہنچے۔

سید احمد صاحبؒ کا حج بیت اللہ

جس وقت آپ بمبئی پہنچے ہیں صدہا آدمیوں کا ہجوم رہ گیروں کا استعجاب بڑھاتا تھا بہت سے تماشائی تھے اور بہت سے محض صورت دیکھنے کے لئے آئے تھے اور بہت سے ایسے بھی تھے کہ جو سید احمد صاحبؒ سے بیعت کرنے کے جویا تھے۔ چند روز تک آپ بمبئی میں رہے صدہا آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر عہد واثق کیا یا بیعت کی کہ آئندہ سے ہم شرک و بدعت کو ترک کر کے وحدت پرستی کریں گے۔ اور شریعت محمدی کے خلاف ایک کام بھی حتی الامکان نہ ہوگا۔

جو کچھ اصلاح سید احمد صاحبؒ نے کی حقیقت میں خدا انہیں اس کا بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ ہزاروں کو مسلمان بنا دیا، اور ان کی لوح دل سے وہ خیالات فاسد بالکل دھو دئے، جنہوں نے انہیں راہ حقیقت سے بھٹکا کے ظلمت کدہ کی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔

پھر بخیر و عافیت آپ جہاز پر سوار ہوئے، اور جہاز نے مکہ معظمہ کی طرف لنگر اٹھایا۔

یہاں بھی سید صاحب کے جھوٹے ہوا خواہوں نے غضب ڈھایا ہے۔ انہیں عالم غیب بنانے اور کلیم اللہ کا لقب دلوانے میں کوئی کمی نہیں کی حالانکہ سید احمد صاحب پورے پورے متبع شریعت تھے اور ان سے کبھی بھی کوئی فعل جہاں تک ہم خیال کر سکتے ہیں اور ہمارا علم ہے خلاف شرع سرزد نہیں ہوا چہ جائے کہ وہ عالم غیب ہونے اور کلیم اللہ بننے کا دعوے کرتے۔ اس متقی ذات سے یہ بہت بعید تھا۔ ان کے جھوٹے ہوا خواہ لکھتے ہیں کہ ایک کشتی میں جب اسباب بہت سالد گیا تو سید احمد صاحب کو غیب سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ

کشتی ڈوب جائے گی اور خدا نے بھی کہہ دیا ہیں اس کشتی کو ڈبو دوں گا یہ معلوم کرتے ہی سید صاحب نے اس پر نشست فرمائی اور کچھ اسباب بھی اس میں سے نکلوا لیا۔ ادھر سید احمد صاحب بیٹھے اور ادھر خداوند تعالیٰ کا فرمان آگیا کہ اب ہم اس کشتی کو نہ ڈبوئیں گے۔ بھلا ایسی باتیں لکھ کے کسی بزرگ قوم کے ساتھ ٹھٹھہ کرنا ہے یا اس کو بنانا ہے یا یہ غرض ہے کہ اس کے اصلی اصلی اور سچے سچے حالات ظاہر نہ ہوں ہم یہ کہتے ہیں اور ہمیں اس پر ناز ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ آئندہ لمحہ میں کیا ہوگا۔ نابکاروں نے حضرت ام المومنین بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان عظیم اٹھایا۔ اور بمقتضائے فطرت انسانی رسول اللہ کو بھی شبہ واقع ہوا، اور آپ اصلی معاملہ کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ دو ڈھائی مہینے یہی کشمکش رہی۔ آخر وحی آئی اور اس نے صدق اور کذب کا فیصلہ کر دیا کہ ام المومنین حضرت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا بالکل پاک ہیں اور جو بہتان آپ پر اُٹھایا گیا ہے محض بے بنیاد ہے پھر ہم کیونکر تسلیم کریں کہ آپ کے بارہ سو برس کے بعد ایک امتی میں وہ شان غیب دانی ہوگی کہ معاذ اللہ آپ کو خود بھی نصیب نہ تھی۔ ہماری اسلامی روشن شریعت بخاری کی تحدیث جو رسول اللہ کو غیب دان جانے کافر ہے۔ اور جسے ام المومنین بی بی عائشہ نے روایت کیا ہے بار بار ہمیں اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ ہم کسی کو بھی حشر تک غیب دان نہ مانیں اگر درحقیقت کبھی اس کی رائے کسی معاملہ میں ٹھیک بھی آکے واقع ہو اور جو کچھ اس نے پیشین گوئی کی ہے وہ صحیح بھی نکل آئے یہ اتفاقی حوادث جو شب و روز ہمارے سامنے ہوتے رہتے ہیں ان کا یہ حدوث کبھی نہیں بند ہوتا اور ایسا اکثر ہوا ہے کہ ایک معمولی شخص نے کسی معاملہ کی نسبت کچھ کہا اور وہ فوراً ہو گیا اب اس سے یہ سمجھ لینا کہ اسے غیب کا علم ہے۔ شریعت محمدی کو پاؤں سے روندنا اور اس کے ساتھ سخت بے ادبی کرنا ہے۔ سید صاحب جنہوں نے اپنی صفائی باطنی سے ہزاروں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ایک پاکباز صادق الوعد نفس تھے انہوں نے نہ کبھی کوئی کرامت کمائی نہ کرامت دکھانے کا دعویٰ کیا وہ پیغمبر کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے تھے اور ان کی خواہش یہ تھی کہ بدعت و شرک کو چھوڑ کے لوگ خالص محمدی بن جائیں۔

سید صاحب بخیر و عافیت جدہ میں پہنچے۔ ہم اس بحری سفر کا حال لکھ کے ناظرین کا وقت نہ

لیں گے کیونکہ اس سفر میں وہی معمولی حوادث بحری پیش آئے جو عام طور پر آیا کرتے ہیں وہ ہی شروع ہی شروع چکروں کا آنا۔ استفراغ کا ہونا۔ طوفان کی دہشت انگیز موجوں کا نیچے کے درجہ میں جبراً چلا آنا اور مسافروں کا اسباب بھگو دینا۔ کبھی طوفان کے خوفناک بھنور میں جہاز کا پھنس جانا اور چوبیس چوبیس گھنٹے کے بعد اس سے نجات پانا بھی معمولی باتیں تھیں جو سید صاحب کو سفر میں پیش آئیں ہاں نئی بات یہ ہوئی تھی جدہ تک پہنچتے پہنچتے دو تین جانیں تلف ہو گئی تھیں، حاملہ عورتوں کے ہاں بچے ہو گئے تھے، اور ایک حمل بھی گر پڑا تھا۔ یہ بھی نہایت معمولی باتیں ہیں جو شب و روز جہازوں پر ہوتی رہتی ہیں مطلب یہ ہے کہ صحیح و سالم سید صاحب معہ اپنے مریدوں شاہ اسمٰعیل صاحب وغیرہ کے جدہ پر اُترے۔ ابھی تک جدہ میں یہ خبر مشہور نہ ہوئی تھی کہ سید صاحب تشریف لائے ہیں۔ اسی وجہ سے سید صاحبؒ کو بہت آرام ملا، اور لوگوں نے جھٹ کے زیادہ تکلیف نہ دی، مگر مکہ شریف میں پہلے ہی سے یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ سید صاحب معہ مولوی اسمٰعیل کے آتے ہیں وہ لوگ سخت مخالفت پر آمادہ تھے کیونکہ وہابیوں سے خونخوار جنگیں ہو چکی تھیں اور وہابیوں کے پابندی شرع کے احکام نے مکہ اور مدینہ والوں کو چھڑوا دیا تھا وہ سخت خالف تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ سید صاحب کو معہ مولوی اسمٰعیل گرفتار کر لیں چنانچہ جب آپ مکہ شریف میں داخل ہوئے ہیں چار ترک سوار پہنچے، اور سید صاحب سے عرض کیا کہ آپ کو شریف مکہ یاد فرماتے ہیں۔ سید احمد صاحبؒ سیدھے شریف مکہ کے پاس پہنچے۔ مولانا شہیدؒ اور مولوی عبدالحیؒ وغیرہ چند علما ہمراہی میں تھے۔ شریف مکہ صورت دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا اور سب سے بخندہ پیشانی معانقہ کیا اور اپنے برابر بٹھا کے چائے وغیرہ منگائی پھر مطلب کی باتیں ہونے لگیں۔ مولوی اسمٰعیل صاحب نیب تھے گھنٹہ بھر تک کامل باتیں رہیں جب اس کا پورا پورا اطمینان ہو چکا تو اس نے دوبارہ اٹھ کے سید صاحبؒ اور آپ کے دوستوں سے معانقہ کیا اور خاص اپنے ہاں سارے قافلہ کو مہمان رکھا ہر چند سید صاحبؒ نے فرمایا بھی کہ آپ اتنا بار کیوں اٹھاتے ہیں مگر شریف مکہ نے نہ مانا اور ایام حج تک اپنے ہی ہاں رکھا یہ ضرور تھا کہ روزمرہ کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی عرب رئیس دعوت کرتا رہتا تھا اور جو کچھ خاطر مدارات ہوتی تھی اس کا اندازہ وہی شخص بخوبی کر

سکتا ہے جو ہمراہ ہوگا۔ میں قیام مکہ معظمہ کے حالات بیان کر کے ناظر کو تکلیف دینا نہیں چاہتا صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ آپ قیام مکہ اور سفر مدینہ میں خوش و خرم اور صحیح و سالم رہے اور کسی قسم کی آفت آپ کے کسی ساتھی پر نہ آئی۔ مرض وغیرہ کی طرف سے بھی آپ کا قافلہ پاک تھا۔ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کرنے کے بعد آپ وطن واپس پھرے۔

سیّد صاحبؒ کی واپسی وطن

حج بیت اللہ میں نجدی لوگ بھی آپ سے آ آ کے ملے تھے۔ اور اپنی لڑائیوں کا ذکر کوں کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے۔ اس پر پادری ہیو جیز صاحب یہ تحریر کرتے ہیں کہ عبدالوہاب کے جانشینوں نے وہابیت کے اصول سید صاحب کو تعلیم کئے اور انہیں بتا دیا کہ مذہبی روح لوگوں میں پھونکنے کے بعد یہ کامیابی ہوتی ہے اور یوں ملک ہاتھ لگتے ہیں (از ڈکشنری آف اسلام) میرے خیال میں پادری صاحبؒ کا یہ لکھنا محض غلط ہے۔ خبر نہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عیسائیوں میں اکثر مصنف ایسے دیکھنے میں آئے کہ جب وہ کسی مشرقی خصوصاً اسلامی معاملہ پر رائے زنی کرتے ہیں تو وہ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے اور اس کی بنا رعکس ہوا پر ہوتی ہے کہ یہ اصل واقعہ سے بہت ہی مستبعد ہوتا ہے۔ مستبعد کیا کبھی تعلق بھی نہیں ہوتا۔ بھلا کہاں سید صاحب کا نجدیوں سے تعلیم حاصل کرنا اور ان سے شرعی مسائل سیکھنے۔ مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحئی صاحب وغیرہ۔ علما آپ کے ہمراہ ایسے تھے کہ جن کے برابر نجد بھر میں ایک شخص بھی عالم نہیں تھا ایسی لغو اور لایعنی باتیں دیکھ دیکھ کے مغربی مصنفوں کی دن بدن قدر گھٹتی جاتی ہے اور اگر اب یہ کوئی بات صحیح بھی لکھتے ہیں اس میں بھی غلطی کا اشتباہ ہوتا ہے۔ ایک صاحب بہادر یہی لکھتے ہیں کہ سید احمد نجدی تھا اور پوشیدہ رائے بریلی میں آ کے کچھ دن رہا اور پھر یہ مشہور کر دیا کہ میں بریلوی ہوں تاکہ لوگ غیر ملک کا سمجھ کے مجھ سے بھڑکیں نہیں بھلا اس صریح جھوٹ کا بھی کچھ ٹھکانا ہے۔ ناظرین نے محققوں کے سرتاج ڈاکٹر ہنٹر صاحبؒ کی لاثانی تحقیقات دیکھ لی، اور ساتھ ہی اور یورپینس کی بھی تفتیش پر نگاہ کر لی کہ ایک سے ایک زیادہ محقق ہے۔

میرا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر انگریز مصنف جھوٹ اور بناوٹی باتیں لکھتا ہے۔ میں عام پر اس لئے حکم لگانا نہیں چاہتا کہ میں نے ان سب کی کتابیں نہیں دیکھیں۔ ہاں اسلام اور بانئے اسلام کی نسبت جتنی کتابیں میں دیکھ چکا ہوں ان میں فیصدی ایک کتاب بشکل صحیح نکلے گی ورنہ ہر کتاب میں جھوٹ کا انبار لگا ہوا ہے کسی مصنف پر تعصب ایسا چھایا ہے کہ وہ اصل واقعات کو معلوم ہونے پر بھی غت ربود کر گیا۔ کسی مصنف کے ہاتھ کوئی ایسی قصہ کہانی کی کتاب لگ گئی جسے کوئی پڑھا لکھا مسلمان مستند نہیں سمجھتا، اور اس نے دارومدار اسی پر کر لیا، اور اسی کو اپنا انھارٹی بنا لیا کسی نے انگریزی مؤرخوں سے یا اردو غلط بعض تراجم سے اپنی کتاب کے صفحے سیاہ کر دئے۔ ایک میور صاحب بڑے محقق ہیں انہوں نے بھی اکثر جگہ وہ زہر اُگلا اور وہ غلط بیان کیا ہے کہ ان کے علم اور دانش پر افسوس آتا ہے۔ اسی طرح سید احمد صاحبؒ اور مولوی اسمٰعیل کی نسبت جتنی رائیں دی گئی ہیں ان میں لب لب غلطیاں بھری ہوئی ہیں۔ سب سے زیادہ ان پر افسوس آتا ہے کہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن میں (معاذاللہ) کذب کو جگہ ہو سکتی ہے مگر انگریز کے ہاتھ کا لکھا ہوا کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا خدا ان پر رحم کرے، اور انہیں ہدایت کا رستہ دکھائے۔ سید احمد صاحبؒ جب جدہ سے روانہ بمبئی ہوئے ہیں تو آپ کے دل میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ دیکھے جنہیں میں مقرر کر آیا ہوں انہوں نے حسب دلخواہ کارگزاری کی یا نہیں۔ مگر الحمد للہ ان لوگوں نے سکھوں پر جہاد کرنے کے لئے چندہ اور آدمی جمع کرنے میں بہت زیادہ کام دیا۔ اور ایک عام تحریک تمام ہندوستان اور خاص کر ملک بنگالہ میں پھیلا دی جب آپ بمبئی تشریف لائے ہیں تو آپ کے ایجنٹ استقبال کے لئے بندرگاہ پر جمع تھے۔ خوشی کے نعرے بلند ہوئے، اور مرحبا وصد مرحبا کی صدائیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔

جتنا اثر کہ پٹنہ اور کلکتہ مدراس وغیرہ میں سید صاحب کا تھا بمبئی میں نہ تھا یہاں آپ نے چند روز قیام کیا، اور آپ نے ایجنٹوں کے مشورہ سے ایک بار اور بھی پٹنہ کلکتہ وغیرہ کا دورہ لگانا شروع کیا جس جگہ سید صاحب تشریف لے جاتے تھے لوگ یک زبان ہو

کے یہ کہتے تھے۔

گر بر سر و چشم من نشینی ناز ت بکشم کہ نازنینی

سید احمد صاحبؒ اس سفر میں خاص اس شخص سے بیعت لیتے تھے جو جہاد پر سکھوں کے مقابلہ میں جانے کے لئے مستعد ہو۔ چنانچہ ہزار بارہ سو آدمیوں نے بچن دیا اور عرض کیا جس وقت حضور کا حکم ہوگا ہم سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ روپیہ بھی بکثرت جمع ہوگیا تھا اور دن بدن ہوتا چلا جاتا تھا اور ایک نئی تحریک اودھ۔ ممالک مغربی شمالی اور بنگال میں پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اس سے چوکنے ہوئے اور انہیں خوف معلوم ہوا کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ اس میں تو کسی قسم کا خلل آکے واقع نہ ہوگا اس نظر سے ضلع کے حکام نے حکام اعلیٰ کو لکھا وہاں سے صاف جواب آگیا، ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔ بھلا مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلش سے کیوں سروکار ہونے لگا تھا جہاں وہ اپنے دین کے ارکان بخوبی ادا کر سکتے تھے اور کرتے تھے انہیں تو لبریشن (یعنے مذہبی آزادی) بخوبی حاصل تھی وہ صرف دشمن دین و ایمان سکھوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے، اور ان کا ارادہ صرف سکھوں ہی سے اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینا تھا جن کے قابل رحم مظالم کا بیان ہم مولانا شہیدؒ کی سوانح عمری میں بیان کر چکے ہیں۔

اس دوسرے گشت کے بعد سید صاحب معہ چند دوستوں یا اپنے مریدوں کے ۲۹ شعبان سنہ ۱۲۳۹ھ اپنے وطن میں علی الصباح داخل ہوئے۔ بعض دوستوں نے فدویت نامے پیش کئے، اور بعض نے قصائد پڑھے، اور بعض نے ایڈریس دیئے ایک عجیب سماں بندھ گیا۔

سید احمد صاحبؒ نے عام طور پر دھڑا کے سے اپنے مریدوں کو ہر شہر میں یہ اجازت دے دی کہ سکھوں پر جہاد کرنے کے وعظ ہوں۔ اکثر شہروں میں وعظ ہونے شروع ہوئے کیا تو لوگوں کے دلوں میں تحریک پھیل رہی تھی، اب عام طور پر ظاہر ہونے لگی اور سید صاحب

کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے۔ سید احمد صاحب نے مولانا شہید کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کرنے کی تیاری کرتے کو ہیں۔ سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے۔ لیفٹننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عمل داری میں امن میں خلل نہ پڑے۔ ہمیں کچھ سروکار نہیں نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔ یہ تمام بیّن بیّن ثبوت صاف صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں ہی کے لئے مخصوص تھا۔ سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مخاصمت نہ تھی۔ مولانا شہید کے سوانح عمری میں تمام جنگوں کا حال مفصل طور پر بیان ہو چکا ہے۔ ان کا اعادہ کرنا صرف محض اور تحصیل حاصل ہے اس لئے میں کچھ اور خاص باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے سید صاحب کی ذات کو خاص تعلق ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کو بھی بہت کچھ اس کے ساتھ لگاؤ ہے۔

(سرگزشت مجاہدین صفحہ ۴۹۲)

یہ ذرا توجہ سے سننے کی بات ہے کہ سید احمد صاحبؒ نے جب سکھوں پر جہاد کا ارادہ کیا ہے تو ان کے پاس چار سو سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ ہر شخص جسے جنگی معاملات سے کچھ بھی آگاہی ہے یہ دلیری اسے مضحکہ خیز اور مجنونانہ معلوم ہوگی۔ رنجیت سنگھ شیر پنجاب کی جنگی قوت کی دھاک تمام ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کسی سے دبتا نہ تھا۔ سرکار انگریزی کو کابل کا جب رستہ دیا ہے جب روپیہ محصول زمین کا لے لیا گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی رنجیت سنگھ کی ایک بڑی فوجی قوت تسلیم کر لی تھی، اور ساتھ ہی اس کے افغانستان پر دو تین فتوحات حاصل ہونے کے بعد اور بھی اس کا نصیبہ چمک گیا تھا، اور اس کی فوجی قوت کی دھاک بحیرہ ہند کی موجوں سے دست و گریبان ہو کے بحر ظلمت کے راستہ سے لندن تک پہنچی اور وہاں سرکار کمپنی کو پریشان کر دیا تھا۔ ایسے زبردست حکمران کے مقابل میں سید صاحبؒ کا چند ایسے آدمیوں کا لے جانا جن کے باپ دادا نے نہ کبھی تلوار ماری، نہ انہوں نے خود بچپن ہی سے ایسی مشق کی، نہ فنون جنگ کے ماہر، نہ سامان جنگ پاس، نہ رسد کا انتظام، نہ پشت پناہی کے لئے کوئی حکمران، محض امید موہوم پر پنجاب پر معدودے چند کے ساتھ حملہ آور ہونا، اور دلیری سے ادھر اُدھر پھرنا یہ ساری باتیں بظاہر دیکھنے والے کو چھچھورے پن اور طفلانہ اٹکھیلیوں

سے زیادہ وزن کی نہ معلوم ہوں گی۔ مگر نہیں جب اس ارادہ کی فطرت پر غور کیا جائے گا تو
سید احمد صاحبؒ کی صائب رائے کا پورا پورا اندازہ ہو جائے گا۔

آپ نے ہندوستانیوں میں جوش پھیلانے میں جو کامیابی حاصل کی تھی اس سے یہ پایا جاتا تھا بلکہ آپ کو بخوبی اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم ایک کام کو شروع کریں لوگ روپیہ اور آدمی برابر بھیجتے رہیں گے چناں چہ خیال آپ کا بہت صحیح تھا۔ بے شک برابر مدد جاری رہی اور جب تک آپ کی شہادت کی خبر نہ آئی جوش ہی ٹھنڈا نہ ہوا۔ مگر جب ہم اور بھی زیادہ غور سے دیکھتے ہیں اس بات پر بھی سید صاحب کا زیادہ بھروسہ نہ تھا بلکہ مولانا شہید کے مشورہ سے یہ پورا یقین کر لیا گیا تھا اور ظاہری اسباب بھی اس امر کے موید تھے کہ سرحدی رئیس اور عوام آدمی سکھوں کے تلخ تر تعصب اور بے جا طور پر اذیت دینے اور توہین اسلام کرنے سے رنجیت سنگھ کی گورنمنٹ سے نہایت بددل ہو رہے ہیں انہیں کوئی سردار اس وقت ملنا چاہیے وہ یک دل ہو کے رنجیت سنگھ کی اطاعت کا جوا کندھے پر سے اتار ڈالیں گے۔ پھر ہمیں خاطر خواہ کامیابی ہوگی یہ خیال سید احمد صاحب کا بہت ہی ٹھیک تھا اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہو جاتی، اگر ان کے عمال بے اعتدالی نہ کرتے اور ایک لخت انہیں مجبور کرنے کہ وہ ناگوار طور پر پابندی شریعت کریں پر میں نہیں کہتا کہ سید احمد صاحب کے عمال ہی کا سراسر قصور تھا نہیں سرداران سمہ اور پشاور کی زر دوستی اور بے ایمانی میں کوئی شک نہیں۔ انہوں نے رنجیت سنگھ کے ہاتھ پشاور فروخت کر کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی قسمت بے رحم دشمن اسلام سکھوں کی مٹھی میں سونپ دی تھی۔ ایک ہاتھ سے تو تالی بجنی مشکل ہے۔ پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ سید احمد صاحب اور مولانا شہید نے تو اپنی جانبازیوں کا ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ پیدا کر کے جہان کو دکھا دیا، اور ایسے معاملہ میں مسلمانوں پر کسی قسم کی زیادتی بدنیتی سے نہیں کی مگر عمال کا خیال اپنا سا کیونکر بنا سکتے تھے اور انہیں پولیٹیکل دماغ کیونکر دے سکتے تھے۔

یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ جس جوش و خروش اور امنگ سے سید صاحب نے جہاد کا ارادہ کیا تھا اس سے زیادہ عجیب ولولوں اور غریب جوشوں سے خدا کی راہ میں جان دے

دی، مذہبی انتقامی جوش سکھوں کے مقابلہ میں آخر دم تک جوں کا توں بنا رہا۔ اور ہمارا بارھویں صدی کا ریفارمر اپنی قوم پر جان نثار ہوگیا۔

بعض واقعات کا ذکر۔ سید صاحب کی شہادت

سید احمد صاحبؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے علاوہ اس دیرینہ تعلق کے جو آپ کے بزرگوں سے تھا بڑا تعلق مجددی ہونے اور اس اہم اور خونخوار معاملہ کی طرف قدم اٹھانے کا تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کو تو طلبہ کے پڑھانے اور مختلف مسائل پر فتوے دینے سے فرصت نہیں تھی۔ ہاں آپ کے عالی قدر خاندان کے اور لوگ چندہ جمع کرنے اور سید صاحبؒ کو روانہ کرنے میں سرگرم تھے چنانچہ جب سید صاحب یاغستان میں تھے تو مولانا محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ نے کچھ اوپر سات ہزار روپیہ سید احمد صاحبؒ کو بذریعہ ہنڈی روانہ کیا تھا۔ وہ کسی باعث سے نہیں پہنچا تھا اس پر نالش کی گئی تھی، اور پھر روپیہ وصول کرکے دوبارہ سید صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا اس کی بابت سید صاحبؒ یہ تحریر فرماتے ہیں۔

از امیر المومنین سید احمد بخدمت بابرکت صاحبزادہ والا تبار مولانا محمد اسحاق صاحبؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سلمہ اللہ تعالیٰ بعد از سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح آنکہ بتاریخ دہم ماہ رمضان ہنڈی مبلغ ہفت ہزار و نہصد و پنجاہ روپیہ رسید لیکن جز پرچہ کاغذ یک خرمہرہ ہم نرسید موجبش دریافت نیست لازم کہ سبب تعویق آں برنگارند۔ زیادہ والسلام مع الاکرام۔

اس سے یہ بات صاف ہویدا ہوتی ہے کہ سکھوں کے مقابلہ میں تمام ہندوستان (خاص ہندوستان سے مطلب ہے) کے سربرآوردہ لوگ کیسے آمادہ تھے اور کس جوش سے چاہتے تھے مظلوم مسلمانوں کا ان سے انتقام لیا جائے۔ جتنا روپیہ دہلی سے مجاہدین کے لئے پہنچتا تھا

اور کسی شہر سے اتنا نہیں پہنچا۔ ساتھ ہی اس کے ایسے عنصر بھی دہلی میں موجود تھے کہ جنہوں نے حامیان دین اسلام کی شہادت کی خبریں سن کے خوشی منائی، اور جامع مسجد میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں اور نامعقولیت سے غلیظ اشعار موزوں کئے گئے، اگر پولیس کامل بندوبست نہ کرتی تو آٹھ دس آدمیوں کا دہلی میں اسی دن خون ہو جاتا۔ ایک شاعر نے تاریخ شہادت ان شہیدوں کی نہایت غلیظ اور ناپاک الفاظ میں لکھی تھی اور چند بدمعاشوں نے اس کی اشاعت بھی شروع کی تھی کہ مولانا شہید کے دوستوں کو خبر ہوئی۔ وہ ہتھیار بند شاعر کے مکان پر پہنچ گئے اور اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، شہر میں ایک ونڈ مچ گیا، آخر پولیس بھی آگئی بڑی منت و عاجزی کے بعد انہیں باز رکھا گیا۔ شاعر نے توبہ کی اور مسودہ ان کے سامنے چاک کر ڈالا۔ اس چاک کرنے سے پہلے اس کی متعدد نقلیں ہو چکی تھیں ایک نقل پر ہماری نظر بھی پڑی تھی۔ سوائے مادہ خواہی اور کافر و مرتد بنانے کے اور کچھ بھی شعروں میں موزوں نہیں کیا گیا ہے، اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ میں ان اشعار کو نقل کرکے اپنی کتاب کی تہذیب بگاڑوں اور مسلمانوں کو بیجا تکلیف دوں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور آپ کا کل خاندان اور اس خاندان کے کل معتقد سید احمد صاحب سے ہمدردی کرتے تھے، زبانی نہیں بلکہ عملی۔ مولوی محبوب علی صاحب کو شاہ صاحب نے ہی روانہ فرمایا تھا، انہوں نے وہاں جاکے اپنے طلائی دماغ کے صدقہ میں وہ گل کھلایا جس کا ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا، غرض اس والا تبار خاندان نے جہاں تک ہو سکا روپیہ اور آدمیوں سے مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ اور یہ ثابت کرکے دکھا دیا کہ جس کام کے لئے سید احمد صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحبؒ نے کمر ہمت باندھی ہے وہ بجائے درست ہے واجب ہے لازم بلکہ فرض ہے۔ جو خیال سید صاحب کا تھا یا جو آرزو سید صاحب نے کی تھی وہ پوری ہو گئی تھی یعنی لاکھوں آدمی شریعت محمدی پر چلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کو ہرگز ملک گیری کی خواہش نہ تھی نہ یہ غرض تھی کہ میں سلطان یا شاہ یا حکمران بنوں، بلکہ اصلی مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہو بدعت و شرک مٹ جائے اور بس۔ جب سید صاحبؒ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے ہیں اور آپ مکہ شریف بخیر و عافیت پہنچے ہیں تو آپ نے ایک طول طویل خط

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں ارسال کیا تھا چند فقرے اس میں اس قسم کے ہیں جن سے معمولی عقول اس کے مطلب کو نہیں پہنچ سکتیں اور وہ ان فقرات کے ظاہری معنی لے کے یہ سمجھتی ہیں کہ درحقیقت سید صاحب خدا سے مثل حضرت موسیٰ یا اور انبیاء علیہم السلام کی باتیں کیا کرتے تھے جبکہ میں معتقدانہ طور پر لکھ رہا ہوں اور یہ بھی میرے پیش نظر ہے کہ ایک دن مجھے اپنے قہار خالق کی خدمت میں حاضر ہو کے اپنی کل تحریرات کی جواب دہی کرنی پڑے گی اس لئے میرا فرض ہے کہ جو کچھ میں لکھوں ایمان اور خوش نیتی سے انصافاً تحریر کروں اور اس پر نازاں ہوں یہ میں نہیں بتا کہ میری ہر رائے صحیح اور بے خطا ہو گی بلکہ میرا یہ دعوے ہے کہ جو کچھ میں نے اور تمام اسلامی دنیا کے علمائے قرآن و حدیث سے مطالب استنباط کیے ہیں اور اس سے سمجھے ہیں اس کے مطابق ہیں جو بھی اپنی رائے دوں اور خدا سے التجا کروں کہ میری رائے مقبول اور صحیح ہو۔

سید احمد صاحب اپنے خط میں یہ تحریر فرماتے ہیں :-

دریکہ از وطن روانہ شدیم و در کشتی باسوار می شدیم چناں مفہوم گشت کہ کشتی فلانے ازیں کشتیہا غرق خواہد شد و دراں کشتی از اسباب مردم بار شدہ بود برائے ایں فقیر کشتی دیگر غیر آں معین شدہ دانستم اگر تقصیر کسے خواہد بود پس من ہم بوجہے ہر چند غفلتے شدہ باشد دراں تقصیر شاملم آمادگی سواری خود دراں کشتی نمودم از جانب غیب ارشاد شد کہ الحال آنرا غرق نخواہم کرد۔

اس فقرہ سے عام آدمی یہی سمجھیں گے کہ خدا نے سید احمد صاحب سے باتیں کیں مگر یہ بات ہرگز نہیں ہے اصل یہ ہے کہ جب انسان بالکلیہ خداوند کریم پر اپنا بھروسہ کرتا ہے اور سوتے جاگتے چلتے پھرتے بیٹھتے اٹھتے سوائے احکام باری تعالیٰ کی تعمیل کے اور کچھ خیال نہیں رہتا تو اس کا دل ہی وہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ جو بات خیال میں آتی ہے وہ از خود بھی سمجھنے لگتا ہے کہ خدا نے میرے دل میں یہ بات ڈالی اور عموماً ایسے ہی خیالات سے وہ پیشین گوئیاں بھی کرنے لگتا ہے۔ جو کام اس کی محنت سے پورا ہوتا ہے یہی کہتا ہے کہ خدا نے پورا کرا دیا۔ ظاہرا کشتی کی حالت جب اس میں سے اسباب نکال لیا گیا ڈوبنے کی نہ تھی اس لئے سید صاحبؒ

نے یہ تحریر فرمایا کہ خدا نے ارشاد کیا یہ کشتی نہیں ڈوبنے کی یہ ایک عجیب حالت ہے جو صاف باطنوں پر ہر وقت طاری ہوتی رہتی ہے اٹھنا بیٹھنا غرض ہر کام وہ خدا ہی طرف سے سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ ایسے سمجھنے کے مجاز بھی کئے گئے ہیں آگے آنے والے فقرہ سے جو سید صاحب نے اپنے خط میں مرقوم کیا ہے ہمارے مطلب کی خوب دھوم دھام سے تصدیق ہوتی ہے چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔ آں وقت تجلی نمودار شد کہ از جانبے می رفت وارشاد شد اگر ترا غرق کنم چہ خواہی کرد و کدام کس خواہد برآورد عرض کردم کہ خداوندا اگر غرق شدن من پسندیدۂ تست مرا غرق کنی و تمام عالم مرا خواہد کہ بگیرد و برآرد و دستگیری من کند ہرگز راضی برآمدن نیستم و دست خود بدست کسے نخواہم داد کیفیتے کہ بہ تبسم تواں گفت نمودار شدہ فرمود کہ ترا غرق نخواہم نمود۔ اس فقرہ میں لفظ کیفیت صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب طوفان آیا تو آپ کی توجہ پوری خداوند تعالے کی طرف تھی اور آپ سمجھتے تھے غرق کرنا اور اس طوفان سے نجات دینا خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ یقین خدا اور اُس کی لازوال قوتوں پر پورے طور سے مضبوطی سے تہ نشین ہو گیا تو ایک کیفیت قلب پر طاری ہوئی اور وہ یہ تھی کہ جب کہ تو نے ہم پر بھروسہ کیا ہے، اور ہماری قوت تمام میں محیط سمجھتا ہے ہم تجھے غرق نہیں کریں گے۔

اس زمانہ میں شرک اور بدعت کا بہت بڑا زور تھا اور لوگوں نے خدا کی قوتوں کی تقسیم اُس کے بندوں میں کرنی شروع کر دی تھی۔ مصیبت کے وقت یہ مشرک خیرہ چشم ان ہی کو پکارتے تھے، اور ان ہی سے التجا کرتے تھے، اور ان ہی سے مدد مانگتے تھے مثلاً جہازوں میں جب طوفان آیا ہے تو ضرور یہ آوازیں بلند ہوتی ہوں گی۔ یا غوث اغثنی" ایسے لوگوں کے لئے سید صاحب کا یہ فرمانا ایک اعلی درجہ کی نصیحت اور ان کے فاسد خیالات کے لئے ایک زبردست تازیانہ ہے۔ ہم نے بارہا جہازوں میں دیکھا ہے کہ جب طوفان آتا ہے تو مسلمان فیصدی مشکل سے پانچ ایسے ہوں گے کہ خدا کو یاد کرتے ہوں گے ورنہ پچانوے مسلمان غوث اور اپنے اپنے پیروں کو پکارتے ہیں جن کی ہڈیاں تک قبروں میں خاک ہو گئیں، اور ان کی روحیں کبھی کی جانور دِق کے پوٹوں میں بند ہو چکیں قیامت تک اور اس کے بعد انہیں دنیاوی معاملات کی نہ خبر رہے گی نہ اس سے کچھ سروکار۔ نہ وہ کسی کی سفارش کر سکتے ہیں۔ نہ کسی کو بخشوا سکتے ہیں جہاں

انبیاء علیہم السلام کا ناطقہ بند ہوگا وہاں کسی ولی، پیر، شہید کی کیا مجال کہ دم بھی مار سکے۔ ہر شخص کو اپنی پڑی رہے گی کس کی سفارش اور کس کی شفاعت یہ سب ہمارے آخر الزمان نبی صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے حکم سے کرائیں گے اور بس۔

شیعوں نے جس طرح علی کرم اللہ وجہہ کو مشکل کشا اور نہیں جانے کیا کیا مان رکھا ہے اس طرح ہمارے بھائی سُنیوں نے غوث وغیرہ کو اپنا مشکل کشا سمجھ رکھا ہے۔ ایک طور پر شیعہ اچھے رہے کہ اگر اپنی ناہنجاری، بدکرداری اور شامت اعمال سے اپنا مشکل کشا کسی بندہ اللہ کو بنایا بھی تو پھر بھی حضرت رسول اللہؐ کے چہیتے اور جلیل القدر صحابی حضرت علی ہی کو بنایا۔ اس کے مقابل میں سنیوں کو اگر نقل کرنی تھی تو حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کو بنانا چاہیے تھا اور یہ خوب سمجھ لیا جائے کہ اگر غوث الاعظم اور بیس ہزار برس زندہ رہ کے کرامتیں حاصل کرتے تو بھی ان جلیل القدر صحابہ کی بزرگی اور تقدس کا ۱/۱۰ حصہ بھی حاصل نہ کر سکتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی کی سوانح عمری دیکھو اور سمجھو کہ وہ کیسے بزرگ، متقی اور عابد تھے۔ ان کی انکسارانہ زندگی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے کبھی نہ خواہش نہ کی ہوگی کہ بعد ازاں لوگ بڑھا بڑھا کے نبی سے گزار کے خدا سے نہ جا بھڑائیں۔ ان کی تالیفات اور ملفوظات دیکھو بدبختو اب در توبہ باز ہے۔ باز آؤ باز آؤ شاہ صاحب کو مثیل خدا نہ بناؤ، اس کے نام کی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نہ پڑھو وہ بھی تمہاری طرح ایک آدمی تھا، اگر درحقیقت وہ نیک صالح اور سچا مسلمان تھا تو خدا اس پر رحمت کرے گا۔ اس کا عابد ہونا خدا کے آگے ہمارے لئے کوئی حجت نہیں رکھتا۔

جن کی حضرت رسول اللہ نے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ سوا ان کے کل مومنین کا جنتی ہونا مشتبہ امر ہے یعنی ہم قطعی طور پر یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ فلاں شخص جنتی ہے یا دوزخی تو پھر ان کو شفیع بنانا کیونکر جائز ہوگا۔

اسی طرح بعض نافہموں کو سید احمد صاحبؒ کی اصلی شان مٹا کے اور اس بزرگ کے نام کارناموں پر خاک ڈال کے اس کو کرامتوں کی پرانی اور دقیانوسی بھول بھلیوں میں پھنسا دیا ہے اور خرق عادات کے دیرینہ ڈھیر کا ایک برقع اس کے منہ پہ ایسا اڑھا دیا ہے کہ جس سے اس

کی اصلی قابل دید ہستی اور حقیقت چھپ گئی۔

میں نے جو کچھ سید احمد صاحب کی بابت لکھا ہے اگر پڑھنے والا آنکھیں کھول کے پڑھے گا اور اس کی طبیعت میں کچھ بھی انصاف ہوگا اور اس کی آنکھوں میں تحریر سے مصنف کی خوش اور غیر خوش نیتی کے تاڑ لینے کا مادہ ہوگا تو وہ سمجھ لے گا کہ بزرگ سید کی اصلی سوانح عمری تو یہی ہے اور اُس کی اصلی حالت تو یہاں بیان ہوئی ہے اور ڈھکوسلے بازی وہ میرے سوانح نویسوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ چاہے اس سے دلچسپی لے اور چاہے اس سے اپنی تسکین کر لے۔

نواب وزیر الدولہ موجودہ حکمران ٹونک کے دادا صاحب ایک سیدھے سادے اور صاف مسلمان تھے ان کا سید احمد صاحب پر بڑا اعتقاد تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت جنت آشیانی امیر خان صاحب بہادر کو جو کچھ عظمت کمپنی کی نظر میں ہوئی وہ سب سید صاحب ہی کا طفیل تھا میں اس سے انکار نہیں کرتا ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایک بزرگ قوم کی دعا بعض وقت قبول ہو جاتی ہے اور معاً اس کا نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے مگر یہ کتنے بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایسے شخص کو ہم خدا سے جا بھڑائیں، اور اسے ادنٰے ادنٰے کاموں میں اپنا سفارشی بنا کے لے چلیں۔

یہی بہت بڑی وجہ تھی کہ وزیر الدولہ کو جب کہ اعتقاد تھا، اور لوگوں کو جو ان کے ہمراہی وغیرہ سے واپس آتے تھے دربار میں نواب صاحب کی نگاہوں میں وقعت پیدا کرنے کی اور کوئی صورت ہی نہ تھی سوا اس کے کہ اُن کے غائبانہ پیر کی مدح سرائی کی جائے اور ایسی ایسی کرامتیں اس بزرگ سید کے سر چپکی جائیں جن سے اس کی ذات بالکل مبرا تھی۔

وزیر الدولہ اپنے غائبانہ پیر کی نئی نئی کرامتیں سُن سُن کے خوش ہوتے تھے، اور جن مسلمانوں نے کرامتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان آنکھوں پر وزیر الدولہ کے لب پہنچتے تھے یعنے وہ بوسہ دیتا۔

سید صاحب نے ایک خط نواب وزیر الدولہ بہادر والئے ٹونک کے نام لکھا ہے اس میں مجاہدین کے لئے نواب صاحب سے چندہ طلب کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ مولانا محمد اسحاق صاحب

کے پاس اگر روپیہ پہنچ جائے گا تو وہ یہاں تک پہنچا دیں گے اور ساتھ ہی اس کے خط میں یہ بھی مرقوم ہے کہ مولانا اسحاق صاحب نے پہلے روپیہ لینے سے اسی لئے انکار کیا تھا کہ اس وقت انہوں نے یہاں تک بھیج دینے کا کوئی وسیلہ بہم نہ پہنچایا تھا ورنہ وہ فوراً لے کے روانہ کرتے اس کے آگے نواب کو یہ تحریر کیا ہے کہ اس بات سے آپ مطمئن خاطر رہیں ان تمام باتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ نواب ٹونک نے براہ راست روپیہ بھیجنا مناسب نہ جان کے مولانا شاہ محمد اسحق کے ذریعہ سے بھیجنا چاہا تھا جب کہ اس وقت ان کے پاس کوئی روپیہ روانہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، انہوں نے انکار کر دیا تھا اور جب انہوں نے یہ سنا ہو گا کہ مولانا صاحب نے ذریعہ بہم پہنچا لیا ہے، اور اس پر سید صاحب کا بھی خط پہنچا ہو گا تو ضرور دس بیس ہزار روپیہ سے مدد کی ہو گی جس کا شکریہ رقم کی تصریح نہ کر کے سید صاحب نے اپنے خط میں شکریہ ادا کیا ہے۔

سید احمد صاحبؒ نے پے در پے سکھوں پر جہادوں میں جو کچھ کامیابی حاصل کی وہ درحقیقت مولانا شہید کی وجہ سے تھی جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے مگر جب پنجاب کا مفتوحہ حصہ مولویوں کے قبضہ میں آ گیا جنہیں جہانداری سے ایسا ہی بیر ہے جیسا چمگادڑ کی آنکھوں کو آفتاب کی روشنی سے اور مولانا شہید اور سید صاحب ان سے بہت دور کے فاصلہ پر مقیم ہوئے پھر کیا تھا۔ دونوں بزرگوں کی سالہا سال کی محنتوں کو خاک میں ملا دیا اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی شہادتیں بھی وہیں ہو گئیں گو ان کی شمشیر بازی کا تو کچھ بھی نتیجہ اس وقت ہماری آنکھوں کے آگے نہیں ہے مگر ان کے قیمتی اور پر اثر وعظوں کی گونجیں اٹک سے لے کے جمنا تک اور جمنا سے بنگالہ تک ہنوز اسی زور شور سے گونج رہی ہیں اور جو کچھ ہدایت کی روشنی اس خطے میں پھیل رہی ہے وہ بھی ان ہی بزرگوں کا طفیل سمجھنا چاہیئے۔

آخری معرکہ جہاں سید صاحبؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ شہید ہوئے ایک عجیب حسرت ناک تھا جسے دیکھ کے چشم فلک سے بھی خون کے آنسو ٹپک رہے تھے بظاہر یہ ایک شاعرانہ مبالغہ ہے مگر حقیقت امر یہ ہے کہ میں نے چشم فلک آفتاب کو نہیں قرار دیا ہے بلکہ اسلام کے معصوم بچہ کو چشم فلک سے تعبیر کیا ہے۔

قوی دل اور مرد میدان ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔

سید احمد صاحبؒ اپنے باڈی گارڈ کے بیچ میں کھڑے ہوئے اپنے بہادر جنرلوں کی مختلف مورچوں پر جانبازیوں کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ قبضہ شمشیر ہاتھ میں ہے۔ میان توڑ کے پھینک دیا ہے۔ آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے تیزی سے آئندہ خونی واقعہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ چہرہ سے خوفناک بشاشت جس میں جنگ کی آرزو ملی ہوئی ہے۔ جلوہ دے رہی ہے کبھی آپ مسکرا کے باتیں کرتے ہیں اور کبھی اپنے ساتھیوں کو دلاسا دیتے ہیں۔ اس شیر ببر کی صورت پر ذرا بھی ہراس نہیں ہے بلکہ ایک ایک لمحہ جو گزر رہا ہے۔ اس نڈر بہادر پر شاق گزر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سکھوں پر تنہا ٹوٹ پڑے مگر اپنے ساتھیوں کی زندگی خطرہ میں پڑنے سے خوف معلوم ہوتا ہے، اور اس ارادہ کو فی الحال ملتوی کیا جاتا ہے۔

(مولانا اسمٰعیلؒ کا جنگ کی حالت میں بار بار اپنے محتشم اور پیر کو یہ آوازیں دینی (حضور اطمینان رکھیں اتنے مورچے فتح کر چکا ہوں اب شیر سنگھ کو بھگایا۔ ایک بے خطر دلیر کی یہ کڑا کے کی صدا جو تلواروں کی کھچا کھچ اور بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں میں سے ہو کے آتی تھی۔ مجاہدین کے دل اور بھی قوی کرتی تھی، اور ان میں نئے طرز کی زندہ دلی کی ایک تازہ روح ٹپکتی تھی۔

مولانا شہید سید صاحب کے باڈی گارڈ کے افسر سے کہہ گئے تھے کہ جب تک میں کہلا کے نہ بھیجوں یہاں سے ایک قدم نہ آگے بڑھانا نہ پیچھے ہٹانا۔ اور کل مورچوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ سید صاحب اپنے پیارے مُرید کی جانبازی چشم قدر سے ملاحظہ فرما رہے ہیں، اور پے درپے مورچوں کا فتح کرنا انہیں بہت کچھ شاداں اور فرحاں بنا سکتا تھا مگر اس یقین کو کیا کرتے جو برابر شہادت کی بشارت کی فرحت بخش خبر دے رہا تھا۔

یہ خونی موقعہ سخت دلگداز تھا۔ سید صاحب کے وہ ساتھی یا مُرید جو اول دن سے خوشی اور غم میں ساتھ رہے تھے اور کبھی زمانہ کی جفاکاری اور دردناک مصائب کا ان پر کچھ اثر نہ پڑا تھا، اور انھوں سے اکثر میدان لے چکے تھے، اور جنہوں نے مختلف جنگوں میں بہت

یہی ملاحظہ فرما رہے تھے کہ کس مورچہ پر حملہ کروں اور کیونکر شیر سنگھ کا سر کاٹ کے لاؤں کہ اتنے میں یہ غضب ناک نظارہ دکھائی دیا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کا جھنڈا ایک سکھ کے ہاتھ میں تھا یہ دیکھتے ہی آپ بیتاب ہو گئے۔ اور اُس بے تابی سے جھپٹ پڑے کہ پھر یہ خبر نہ رہی کہ میں کیا ہوں میرے ساتھ کتنے آدمی ہیں، اور جن پر میں حملہ کر رہا ہوں وہ تعداد میں کتنے ہیں۔

سید صاحبؒ قلبِ لشکر میں نہ پہنچے تھے کہ ایک گولی آپ کی ٹانگ میں لگی آپ گولی کے صدمہ سے جھک رہے تھے کہ ایک گولہ صاف آپ کی باڈی گارڈ میں سے آپ کو اڑا کے لے گیا جس سے بولائے ہوئے مجاہدین کو یہ معلوم ہوا کہ سید صاحب مجسم آسمان پر بُلا لئے گئے اور دوبارہ تشریف لائیں گے بہت سے لوگوں کا یہ بھی مقولہ ہے کہ سید صاحب کے ساتھ مولانا محمد اسمٰعیل بھی آسمان پر چلے گئے۔ مگر یہ خبر معتبر معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے دن شیر سنگھ نے ان دونوں بزرگوں کی نعشوں کو شناخت کرا کے نہایت عزت کے ساتھ اُنہیں بالاکوٹ ہی میں دفن کرا دیا۔ مولانا شہیدؒ کی قبر تو موجود ہے، اور سید احمد صاحبؒ کی قبر حضرت موسٰےؑ اور حضرت علیؓ کی طرح مشتبہ ہے۔

یہ جانکاہ واقعہ بروز جمعہ بوقت ظہر بتاریخ ۲۴ بماہ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق مئی ۱۸۳۱ئ کو وقوع میں آیا۔ جب سید صاحب اور آپ کے اکثر جانباز مرید شربتِ شہادت سے سیراب ہو چکے تو بے چارے مسلمان اپنی جانیں بچا کے بھاگے مگر بدقسمتی پورے طور سے اُن کے سروں پر منڈلا رہی تھی وہ ایسے بے اوسان ہو گئے تھے کہ اُنہیں یہ تمیز نہ ہو سکتی تھی کہ جہاں ہم چل رہے ہیں یہ گھاٹی ہے یا دلدل ہے۔ اناپ شناپ بولاہٹ میں جس طرف جس کا سینگ سمایا جا نکلا۔ بہت دلدل میں گر کے شہید ہوئے، اور بہت سے تنگ گھاٹیوں اور پہاڑی رستوں میں سخت مظلومانہ حالت میں سکھوں کا شکار ہوئے، اور جن بے چاروں کی زندگی تھی وہ ادھر اُدھر پہاڑوں میں چھپ گئے۔ اس عظیم الشان کام کی وہ ابتدا تھی یہ انتہا ہے۔ ہمیں ایسے ایسے بزرگ انفاس کی بے نظیر کوششوں اور لاثانی جانکاہیوں سے جو اُنہوں نے قوم کے لئے کیں بہت کچھ سبق لینا چاہیئے۔ اگرچہ اس وقت نہ ہمارے ہاتھ

مفکرِ اسلام سید قطب شہید کی معرکہ آرا تفسیر

فی ظلال القرآن

اردو ترجمہ:

— از —

مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی ○ پروفیسر میاں منظور احمد

(جلد اول - جلد دوم) (جلد سوم تا جلد دہم)

جلد	پارہ	صفحات	ہدیہ
○ جلد اول	پارہ: ۱-۲-۳	صفحات: ۴۷۶	ہدیہ: ۱۲۰/- روپے
● جلد دوم	۴-۵-۶	۵۹۲	۱۴۰/-
○ جلد سوم	۷-۸-۹	۷۴۰	۱۶۰/-
● جلد چہارم	۱۰-۱۱-۱۲	۷۴۰	۱۶۰/-
○ جلد پنجم	۱۳-۱۴-۱۵	۵۶۴	۱۴۰/-
● جلد ششم	۱۶-۱۷-۱۸	۵۲۸	۱۴۰/-
○ جلد ہفتم	۱۹-۲۰-۲۱	۵۶۴	۱۶۰/-
● جلد ہشتم	۲۲-۲۳-۲۴	۵۱۶	۱۶۰/-
○ جلد نہم	۲۵-۲۶-۲۷	۶۸۰	۱۶۰/-
● جلد دہم	۲۸-۲۹-۳۰	۷۰۰	۱۶۰/-

سائز: ۲۲×۲۹/۸ • کاغذ: آفسٹ • طباعت: عکسی • جلد: سنہری ڈائی دار • ہدیہ: مکمل سیٹ: ۱۵۰۰/- روپے

ناشر: اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور پاکستان

فون: ۶۴۱۶۱